

# نیں پیسے دشمن کے

PDFBOOKSFREE.PK

نہیں پیسے دشمن کے

ایبٹ آباد

## انتساب

زندگی کی نازک اور انمول گھڑیاں ہم نے ان کی رفاقت میں گذار دیں۔ ان کی یادیں انٹ نشان بن کر دل کے نماں خانے میں محفوظ ہو چکی ہیں۔ انسان کب تک یادوں کے سہارے زندگی گزارے گا۔ اپنے پیاروں کی جدائی کا تصور ازیت ناک احساس بن کر سارے وجود پر چھا گیا ہے۔ کبھی وہ تھے جن کا ہاتھ تھام کر دنیا کی بھیڑ میں بے دھڑک چلتے تھے ہم -----

اور گم ہونے کا خدشہ تک نہ رہتا تھا

اپنے والد سید کفیل احمد شاہ صاحب کے نام!

آٹھ مئی انیس صد ستانوے کی سحر کبھی طلوع نہ ہوئی

جب موت کے بے رحم ہاتھ نے کوچ کا نقارہ بجادیا۔۔۔۔۔

## ناز کفیل گیلانی

سہیل

مورخہ 01/08/97

## پیش لفظ

آج جبکہ پاکستان کو معرض وجود میں آئے ہوئے پچاس سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ دو سو سال غلامی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد آزادی کا پچاسواں سورج طلوع ہوا تو ایک نئے رنگ سے سحر ہوئی۔ اس کے ساتھ میری تصنیف نے بھی اپنی جوہلی مکمل کر لی ہے۔ میری پچاس پچپن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں بیس اصلاحی معاشرتی اور سماجی ناول اور بچوں کے اصلاحی ناول جو مکتبہ القریش کے علاوہ دوسرے اداروں سے بھی شائع ہوئے ہیں اور یہ بات بڑی قابل فخر ہے کہ کسی ایک ادارے سے ایک ادیب کی اتنی کتابیں شائع ہوں۔ میرے پبلشر جناب عبدالحفیظ قریشی صاحب کی قائدانہ کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ جناب عبدالحفیظ قریشی صاحب ایک مخلص ہمدرد اور بے لوث انسان ہیں۔ زیر نظر کتاب (نہن پیاسے درشن کے) ایک تفریحی اصلاحی کتاب ہے۔ امید واثق ہے کہ قارئین کو ہمیشہ کی طرح یہ بھی پسند آئے گی۔ اپنی قیمتی رائے سے نوازیں گے اور میری اس کے بعد آنے والی اصلاحی کتاب ”ہر آنکھ تماشائی“ ضرور پڑھیں گے۔

آپ کی دباؤں کی طالب

ناز کفیل گیلانی

ساہیوال۔

(1) اے مرغ سحر شور نہ مچا۔ عشق کے آداب پروانے سے سیکھ۔  
جل کر خاک ہو گیا مگر ان تک نہ کی۔

(2) یہ زندگی دھوپ میں برف کی مانند ہے۔ چند روز کی مہمان  
لیکن آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑا ہے۔

(3) دوستی کی آڑ میں جنسی مقصد لے کر دوست کے گھر تک رسائی  
پیدا کرنا اس پلید چوہے کا کردار ہے جو دیمک کی طرح دوست کی  
عزت و ناموس کو فنا کر دے۔

سید افضل انجم بخاری  
ساہیوال

(1)

سوہنی ..... ماں چلائی۔

سوہنی ..... کہاں مر گئی تو۔

جیراں واپس پٹی اور جھکی کا میلا کٹیف پردہ اٹھا کر سارے کونوں  
میں جھانکا کہاں چلی گئی ..... شام میلی ہو گئی ہے ..... وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔  
پھر جیراں نے آسمان کی طرف دیکھا اور ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔  
شمشیر ..... سوہنی کو دیکھا تو نے۔

دس بارہ سال کے لڑکے کو دیکھ کر بولی۔

پتہ نہیں چاچی ..... میں نے تو دیکھا نہیں اسے۔ چاچا سے پوچھ

لے۔

شمشیر نے آتے ہوئے رامو کی طرف دیکھا۔ جو خشک لکڑیاں اٹھائے  
آ رہا تھا۔

بڑی دیر لگا دی۔ نہ اس طرح کیوں بیٹھی ہے ..... خیر تو ہے۔ ٹھیک  
تو ہے تو۔

رامو نے حقے کی نے کو پرے کیا اور جیراں کی طرف دیکھا۔

میں تو ٹھیک ہوں ..... تیری چھوکری کہاں ہے ..... اوپر دیکھ آسمان  
کی طرف شام ڈھل رہی ہے۔ وہ ہاتھ نہچا کر بولی۔

میں تو شمشیر کو لے کر ابھی آیا ہوں ..... کھینے چلی گئی ہوگی بنگلے  
میں۔

دیکھ لیا ..... وہ امیر لوگ کہاں ہم غریبوں کے بچوں کو قبول کریں  
..... ہم جھگیوں میں رہنے والے ان کے فرشوں کو گندہ کریں ..... ہے نا یہی  
بات۔

جیراں نے غصے میں سوہنی کو پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔  
پھر جائے گی بنگلے میں۔  
جیراں نے تھپڑ اٹھایا مارنے کے لئے۔

چاچی ..... نہ مار اسے۔

ایک دم اچک کر شمشیر نے جیراں کا ہاتھ تھام لیا۔  
سوہنی معصوم غزال بچے کی طرح جیراں کی گود میں بیٹھ کر پلٹ گئی۔  
جیراں نے اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

میری جان ..... نہ جایا کر ..... وہ بڑے لوگ ہیں ..... غریبوں سے  
میل جول اچھا نہیں لگتا انہیں۔  
جیراں پھر سوہنی کو لپٹا کر بولی۔

اماں ..... بنگلے میں بیدار کے پاس اتنا بڑا بھالو ہے ..... وہ ڈھولک  
بجاتا ہے۔ شمشیر کھل کھلا کر ہنس دیا۔

تم بھی چلنا ..... اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا ..... ایک گڑیا ہے .....  
سوتلی بھی ہے اور بولتی بھی۔ تمہیں ضرور لے جاؤں گی۔  
وہ سب کچھ بھول کر پھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

نہ نہ میں نہیں جاتا ..... یہ بڑے گھروں والے پکڑ کر مار دیتے ہیں  
..... میرے بابا اور اماں کو اونچے مکانوں والوں نے ہی مارا تھا۔  
شمشیر کا انداز اداس تھا۔

میرے بچے تو ایسا کیوں سوچتا ہے۔ میں جو تیری ماں ہوں ..... یہ  
تیرا باپ ہے ..... چاچا باپ ہی ہووے۔

جیراں نے بڑی محبت سے شمشیر کو لپٹا لیا۔

سوہنی ہنس کر ماں کو دیکھتی رہی ..... یہ باتیں شاید اس کے شعور

رامو نے اطمینان سے کہا۔  
کیوں جاتی ہے بنگلے میں ..... مجھے نہیں اچھا لگتا بس۔  
جیراں کو رامو کی بات پر غصہ آگیا۔

اوہو ..... اس سے ناراض ہے ..... بچی ہے ..... چھ سال کی بھی  
نہیں ہوئی ..... کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ کھیلنے دے اس کو ..... مت پھرا  
بٹھا اس پر۔

وہ حقہ گڑ گڑانے لگا۔

کیوں قبیلے سے باہر جاوے رات کے وقت ..... کھیلنا ہے تو شمشیر  
سے کھیلے۔

جیراں خوفزدہ نظر آنے لگی۔

تجھے خوف کس بات کا ہے۔ خوا مخواہ پریشانی بڑھا رہی ہے۔  
رامو کو بھی غصہ آگیا۔

تو سمجھتا کیوں نہیں ہے ..... وہ بہت بڑے لوگ ہیں ..... ان سے  
کھیلے گی تو اچھا نہ ہوگا۔

چند ٹانے دونوں کی نگاہیں پھٹ گئیں۔

یہ بچی تمہاری ہے۔

ملازم سوہنی کو جیراں کے پاس لایا۔

ہاں ..... رامو نے سوہنی کو ساتھ لگا لیا ..... کیا کیا اس نے۔

کچھ نہیں ..... بیگم ناراض ہوتی ہیں ..... اسے بنگلے میں آنے سے

روکا کرو۔ ملازم نے کہا۔

میں خود نہیں جاتی ..... بیدار میرے ساتھ کھیلتا ہے اور مجھے بلاتا

بھی ہے۔ سوہنی نے تنک کر جواب دیا۔

جیراں گھورے جا رہی تھی۔

اچھا بھائی روک لیں گے ..... بچے ہیں۔ رامو نے کہا۔

اور ملازم واپس چلا گیا۔

ہیں بلکہ سارے قبیلے والے ہی اپنی اپنی مزدوری پر جا چکے تھے۔ رامو کو آج کام زیادہ کرنا تھا اس لئے وہ شمشیر کو ساتھ نہ لے جا سکا۔

سوہنی پیالی میں گڑوالی سیاہ چائے اور سوکھی روٹی چبا رہی تھی۔ کبھی ڈبو رہی تھی اور کبھی ویسے ہی کھانے لگتی۔

تو نے ابھی روٹی نہیں کھائی۔

شمشیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔

سوکھی روٹی ہے ..... مجھ سے کھائی نہیں جاتی۔

وہ روٹی دیکھ کر بولی۔

ہاں ..... آج کھی نہیں تھا۔ چاچا شام کو لائے گا پھر کھا لیتا۔

شمشیر کو سوہنی پر رحم آگیا۔

شام کو۔

سوہنی نے کہا۔

ہاں شام کو ..... کھی والی روٹی اچار ہو آم کا ..... بڑا مزا آتا ہے کھانے میں۔ شمشیر نے بڑی رغبت کا اظہار کیا۔

اماں کا اچار رکھا ہوا ہے ..... وہ دیکھ ..... کھانا تو کھالے۔

سوہنی نے جھک کر سفید رنگ کے مرتبان کی طرف اشارہ کیا۔

نہیں ..... شام کو کھاؤں گا۔

شمشیر نے کہا۔

سوہنی نے پیالہ اور خالی چنگیر چار پائی کے نیچے رکھی۔

آ ..... بنگلے میں چلیں ..... بیدار کے کھلونوں سے کھیلیں گے۔

سوہنی چار پائی سے اترتے ہوئے بولی۔

نہیں ..... چاچی غصے ہوگی۔

نہیں غصے ہوتی ..... اماں تو مجھے ہی غصے ہوتی ہے ..... چلے گا نا۔

سوہنی نے کہا۔

جی تو چاہتا ہے پر۔

سے بالاتر تھیں۔ وہ ایسا نہیں سوچتی تھی۔ پانچ چھ سال کی خوبصورت گول منول سوہنی کیا سوچ سکتی تھی۔

سن میری بات۔

جیراں نے پھر سوہنی کو جھنجھوڑا۔

خبردار دوبارہ بنگلے میں گئی۔

اماں بیدار آواز دیتا ہے تو میں جاتی ہوں ..... خود نہیں جاتی۔

سوہنی نے صفائی پیش کی۔

دیکھ قینچی کی طرح زبان چل رہی ہے اس کی ..... سن رہے ہو نا۔

جیراں نے رامو سے کہا۔

ہاں چاچی ..... سوہنی خود تھوڑا ہی جاتی ہے ..... بیدار خود اسے کھینے کے لئے بلاتا ہے ..... میں نے خود آواز سنی ہے۔

رامو اور جیراں کھل کھلا کر ہنس دیئے۔

وکیل بن رہا ہے سوہنی کا۔ میرا شیر پتر ہے۔

رامو نے شمشیر کی پیٹھ پر ہاتھ مارا اور اٹھ گیا۔

ہانڈی میں گوشت دھو کر ڈال دیا ہے۔ چولہے پر چڑھا دے۔ رامو جاتے جاتے بولا۔

چاچی تو مصالہ بنالے ..... میں چولہے میں آگ جلا لیتا ہوں۔

شمشیر نے کہا۔

اچھا ..... چل شاباش تو آگ جلا لے ..... باہر سے سوکھی گھاس لے آ ..... پھر آگ جلے گی۔

جیراں جھکی میں داخل ہوتے بولی۔

اینٹوں کے بنے چولہے کو درست کر کے شمشیر نے آگ جلائی اور ہانڈی اوپر رکھ دی۔

کئی شامیں گذر گئیں ..... کئی صبحیں طلوع ہوئیں۔ ہر روشن صبح ڈوبتی شام کا سندیسہ ضرور لاتی ہے۔ آج بھی جیراں اور رامو کام پر جا چکے

وہ رک گیا۔

پر کیا ..... بات تو کر ..... چپ کیوں ہو گیا۔

وہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی۔

بس یہی کہ چاچی غصے ہو گی۔

وہ ہنس دی۔

کچھ نہیں ہوتا ..... تو چل ..... جلدی آ جائیں گے ..... ابھی تو دن

ہے۔

سوہنی نے کہا۔

ٹھیک ہے۔ شمشیر راضی ہو گیا۔

وہ شمشیر کی انگلی پکڑے دریا کے ساحل پر چلتے چلتے بنگلے کے

اندرونی لان میں داخل ہوئی۔

تو پھر آگئی۔ دلاور ..... دلاور ..... نکالو اس کو باہر۔ بیگم نور الدین

نے پلٹ کر ملازم کو آواز دی۔

چلی گئی شاید ..... خدا بچائے اس لڑکی سے ..... بیدار اس کے بغیر

نکلتا ہی نہیں۔ بیگم نور الدین نے برآمدے میں بھیجی خوبصورت کرسی پر بیٹھ کر

کہا۔

اما ..... سوہنی آگئی ..... کہاں ہے۔ بیدار لان میں بغور دیکھنے لگا۔

میں نے بھگا دیا ہے بیٹا ..... چھی چھی گندے بچوں سے نہیں کھیلتے۔

بیگم نور الدین نے نفرت کا احساس دلایا۔

وہ گندی نہیں ہے اما۔

بیدار کو ماں کی گفتگو پسند نہ آئی۔

یہ جھگیوں میں رہنے والے لوگ ہیں ..... ان کا کوئی سٹینڈرڈ نہیں

ہوتا۔

بیگم نور الدین نے مسکرا کر بیدار کے بال درست کئے۔

پھر کس سے کھیلوں ..... سوہنی اچھی بھلی تو ہے۔ وہ خود آ جاتی ہے

..... میں کھیل لیتا ہوں اس سے۔

بیدار نے کہا۔ جیسے وہ بیقرار ہو سوہنی سے کھیلنے کے لئے۔

ادھر شمشیر سوہنی کو کہہ رہا تھا۔

چل واپس چلیں ..... یہ عورت مارے گی۔

نہیں مارتی ..... تو تو ہے ہی ڈرپوک۔

سوہنی نے شمشیر کو ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

اچھا۔

وہ نیچے ہو گیا۔

دلاور ..... او دلاور۔

ایک دم چونک کر بیگم نور الدین نے پھولوں کے کج کو دیکھا۔

جی بیگم صاحبہ۔

دلاور بھاگ کر قریب آگیا۔

وہ دیکھ ..... پھولوں کی اوٹ میں ..... مجھے شک ہے کہ دونوں بچے

وہاں ہوں گے۔

بیگم نور الدین نے انگلی سے سامنے اشارہ کیا۔

اما ..... میں دیکھتا ہوں۔

دلاور کے ساتھ چھلانگ لگاتا ہوا بیدار وہیں پہنچ گیا جہاں شمشیر اور

سوہنی چپے ہوئے تھے۔

یہ دیکھتے بیگم صاحبہ ..... اپنے ساتھ ایک اور لے آئی ہے۔

دلاور نے دونوں کو کانوں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

شمشیر بری طرح سما ہوا تھا البتہ سوہنی چڑچڑ زبان چلائے جا رہی

تھی۔

بیدار ہمیں چھڑالونا ..... دیکھو میں پھر نہیں آؤں گی۔

سوہنی گڑگڑانے والے انداز میں بولی۔

کیوں نہیں آؤں گی ..... دلاور چھوڑ دو ان کے کان ..... دیکھو میں

جی بیگم صاحبہ۔

یہ کون لوگ ہیں۔

کون لوگ ..... کس کی بات کر رہی ہیں آپ بیگم صاحبہ۔

دلاور حیران ہو گیا۔

یہی یہ لڑکی سوہنی۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

اچھا ..... یہ بچی ..... جنگی والوں کے ہیں بیگم صاحب ..... اوڈوں کی

بستی ہے قریب ہی ..... دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالا ہے ان لوگوں نے۔

دلاور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا اس لئے کئی الفاظ درست بول لیتا تھا۔

پڑاؤ۔

وہ حیران ہو کر نگاہیں اٹھا کر بولیں۔

جی ہاں بیگم صاحبہ جی ..... ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا ..... جہاں پانی

دیکھا، خیمے گاڑے اور مزدوری کر کے کھاتے ہیں ..... ہیں جفاکش لوگ۔

دلاور نے کہا۔

یہ بچی وہاں سے کھیلنے کے لئے آتی ہے بیدار سے۔

وہ حیرانی سے بولیں۔

جی ہاں ..... ادھر ساحل پر تو جھکیاں ہیں ان کی۔

دلاور نے کہا۔

اچھا ..... آئندہ خیال رکھنا۔ وہ لڑکی داخل نہ ہو۔ اگر ہو تو کان

سے پکڑ کر نکال دو۔ وہ کہتی ہوئی واپس پلٹیں اور دلاور سوچتا ہوا بنگلے کے

اندر چلا گیا۔

شمشیر سوہنی کو کھینچتا ہوا جھگی میں داخل ہوا۔

اے ..... کہاں سے آرہے ہو دونوں۔

حیران نے شمشیر کو بالوں سے پکڑ لیا۔

سوہنی منہ پھلائے کھڑی رہی۔

تمہیں کہہ رہا ہوں۔ بیدار فوراً بولا۔

چھوٹے صاحب بیگم صاحبہ کا حکم ہے۔

دلاور ہنس کر بولا۔

ماما اندر چلی گئی ہیں ..... چھوڑو نا سوہنی کا کان۔

بیدار نے دلاور کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔

اچھا ..... آپ کہتے ہیں تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔

دلاور نے دونوں کے کان چھوڑ دیئے۔

چلو سوہنی ..... اب ایک لمحہ نہیں رکنے دوں گا۔

شمشیر نے بازو کھینچا۔

ٹھہرو تو ..... بازو تو چھوڑ۔

سوہنی نے بازو چھڑایا۔

نہیں چھوڑوں گا ..... چلو واپس۔

شمشیر نے سوہنی کو اپنی طرف گھسیٹا اور گیٹ تک لے گیا۔

سوہنی ..... رکو تو۔

وہ گیٹ کی طرف بھاگا۔

لیکن دلاور نے مذاحمت کر کے بازو پکڑ لئے۔

چھوٹے صاحب ..... یہ لوگ اچھے نہیں ہیں ..... بھلا جھکیوں میں

رہنے والے نہ گھر ہے نا گھاٹ۔ دلاور بیدار کو واپس لاتے ہوئے بولا۔

مجھے کیا ..... مجھے تو بس سوہنی سے کھیلنا ہے ..... وہ جھگی میں رہے یا

کہیں اور بیدار نے زور سے بازو چھڑایا اور روٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

آؤ بیٹا پپا کا فون آیا ہے ..... بلا رہے ہیں آپ کو۔

میں بتا دوں گا پپا کو کہ ماما کھیلنے نہیں دیتیں۔

وہ بھاگتا ہوا ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

دلاور۔

بیگم نور الدین تھکے تھکے انداز میں بولیں۔



شمشیر نے سوہنی کو کہنی ماری ..... بتانا۔

سوہنی نے نگاہیں اٹھائیں ..... جیسے کہہ رہی ہو تم بتا دو ..... مجھے  
ماں مارے گی۔

اچھا میں بتاتا ہوں۔

شمشیر نے کہا۔

ہاں ہاں ..... میرا بیٹا تو بتا ..... کہاں سے لائی ہے تمہیں پھنسا کر  
..... ضرور کوئی چکر ہے۔ تیرا باپ آ لے ..... سو نو تیری تو ایسی چڑی ادھیڑوں  
گی کہ ہمیشہ یاد کرے گی۔ وہ غصے میں سوہنی کو سو نو کہتی تھی۔

جیراں نے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور شدید غصے میں دانت پیسے۔

اوہو ..... چاچی بات تو سن لے۔ وہ بنگلہ ہے نا۔

شمشیر نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں پھیلانیں اور اچک کر پھر ہاتھ پکڑ

لیا۔

وہ بنگلہ ..... تمہیں مالک نے پکڑ لیا ہو گا ..... ہے نایبی بات۔

جیراں نے قیاس آرائی کی۔

یہی بات ہے۔

شمشیر اور سوہنی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اور یہ تمہیں لے کر گئی تھی ..... نہیں باز آئی۔

جیراں نے سوہنی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

نہیں چاچی ..... میں خود گیا تھا۔ سوہنی نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔

بس بس اس کی طرف داری نہ کر ..... میں اچھی طرح اس کو جانتی

ہوں ..... بڑی شیطان ہے یہ ..... ہر کام پوچھے بغیر کرے۔

جیراں نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو اندر کی طرف دھکیلا اور

خود ہانڈی میں نمک مرچ ڈالنے چل دی۔

وہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ دس بارہ سال کا شمشیر چاہت کے جذبات

سے ناری تو نہ تھا۔ اسے شروع سے ہی چھ سال کی سوہنی اچھی لگتی

تھی۔ اس طرح روٹھی ہوئی دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

کیا بات ہے ..... چپ کیوں ہو ..... وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ناراض

ہو۔

کچھ نہیں ..... میں بھلا تم سے ناراض ہونے لگی۔

وہ پرے سرک گئی۔

بولتی جو نہیں ..... کوئی تو بات ہے۔

شمشیر نے سوہنی کے منہ سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

کیا بولوں ..... تمہیں تو ماں کچھ نہیں کہتی ..... بس میں ہی بری

ہوں۔

وہ روٹھے روٹھے لہجے میں بولی۔

تو کیوں بری ہے ..... میں تو تمہیں برا نہیں کہتا۔

شمشیر مسکرایا۔

ماں نے تجھے کچھ کہا ..... مجھے ہی سب کچھ کہا۔

وہ جیسے پھٹ پڑی۔

میں نے تو تیری شکایت نہیں لگائی ..... میں نے تو یہ بھی نہیں کہا کہ

تو مجھے لے کر گئی تھی۔

شمشیر نے معذرت خواہی کا سا انداز اپنا لیا۔

اب کہہ دے ..... اور مارے گی ماں ..... تو خوش ہو جا۔

وہ شمشیر کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی۔

میں خوش ہوتا ہوں۔ شمشیر اٹھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

وہ سادگی سے بولا۔

باہر آؤ ..... روٹی لے لو ..... سوہنی آ جا تیرا باپ بلا رہا ہے۔

جیراں نے آواز لگائی۔

آ جاؤ سوہنی روٹی کھائیں۔

شمشیر نے بازو پکڑا۔

تم کھاؤ..... مجھے بھوک نہیں ہے۔  
 وہ روٹھی روٹھی لیٹ گئی۔  
 تو نہیں کھائے گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔  
 وہ دھپ سے بیٹھ گیا۔  
 تم دونوں باہر کیوں نہیں آرہے۔  
 جیراں ہاتھ میں پیڑا لئے اندر داخل ہوئی۔  
 چاچی یہ روٹی نہیں کھا رہی۔  
 شمشیر بولا۔

(2)

کائنات کی ہر حرکت ایک سوال بھی ہے اور جواب بھی۔ دم دار ستارہ ہو یا آسمان پر دکھائی دینے والی کہکشاں۔ مکھی کا پر ہو یا ہاتھی کی سونڈ۔ جنگل کا پات ہو یا چمن کے گل ہائے رنگا رنگ ہر شے مرکز کائنات کی نشاندہی کرتی ہے لیکن پھر بھی ثابت نہیں ہے۔ ورنہ کارخانہ حیات بغیر کسی تبدیلی کے چلتا رہتا۔ زندگی نہ رکنے والی چیز ہے۔ آج یہاں اور کل وہاں..... کون جانے یہ فسوں زندگی کو کہاں سے کہاں لے جائے۔

دن مخصوص رفتار سے گزرتے چلے گئے۔ آج کتنے دن ہر گئے تھے اسے بنگلے میں گئے ہوئے۔ ماں نے کڑی نگرانی شروع کر دی تھی اور آج جب دیکھا کہ اماں بابا کے ساتھ کام پر چلی گئی ہے اور شمشیر بھی گھر پر نہیں ہے تو وہ چپکے سے گھر سے نکلی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سارا قبیلہ خاموش تھا۔ سب اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔ وہ چائے کی پیالی زمین پر رکھے ساحل پر بڑی تیز رفتاری سے بھاگی۔ گیٹ پر لگا ہوا سیاہ تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ مایوس لوٹ آئی۔

کہاں چلے گئے یہ لوگ..... وہ خود سے باتیں کر رہی تھی۔ بیدار کی آواز ہر بار اس کی سماعت سے نکلراتی وہ تڑپ اٹھتی..... وہ کس قدر پیاری آواز میں اس کو پکارتا تھا اور... کھینچ چلی آتی تھی۔  
 سوہنی۔

اس کی پشت سے کمرے نے پکارا۔

کیوں..... اٹھ میری بیٹی..... چل روٹی کھا..... دیکھ میں نے تیرے لئے کیا پکایا ہے۔

جیراں نے بڑی محبت سے سوہنی کو پچکارا۔  
 کیا پکایا ہے چاچی۔  
 شمشیر نے خوش ہو کر کہا۔  
 جھینگا..... کھائے گی نا۔  
 سوہنی ہنس دی۔

اور تینوں جھگی سے باہر نکل آئے۔

دلور نے بغور سوہنی کو دیکھا اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

وہ ضرور مجھ سے ملنے آ رہا ہوگا اور تم نے ملنے نہیں دیا۔  
میرا کیا قصور ہے ..... بیگم صاحبہ ..... تمہیں معلوم ہے کتنی جابر عورت ہیں۔ دلور نے آنکھیں چاڑھ کر خوف دلایا۔  
ہاں۔

وہ آہستہ سے بولی اور آگے کو چل دی۔  
دلور نے سوالیہ انداز سے جاتی ہوئی سوہنی کو بغور دیکھا اور اپنے راستے پر چل دیا۔ وہ مایوس و نامراد جھگی میں داخل ہوئی۔ شمشیر صحن میں بیٹھا اس کا منتظر تھا ..... سوہنی کو اداس آتا دیکھ کر شمشیر اٹھ کھڑا ہوا۔  
کیا ہوا ..... بیگم صاحبہ نے پکڑ لیا۔  
شمشیر نے کہا۔ وہ اداس صورت بغور دیکھنے لگا۔  
نہیں۔

وہ اداس اس کے پاس بیٹھ گئی۔  
پھر کیا ہوا ..... اتنی پریشان تو کبھی نہیں ہوئی۔  
شمشیر نے سوہنی کے شانے کو اپنی طرف گھمایا۔ وہ رو رہی تھی۔  
بیدار یہاں سے چلا گیا ہے۔  
یہ سنتے ہی شمشیر فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔  
سوہنی کو ہنستا ہوا شمشیر زہر لگ رہا تھا۔  
تمہیں ہنسی کس بات کی آئی ہے۔  
مجھے اس بات کی ہنسی آئی ہے کہ بیدار چلا گیا تو چلا جائے ..... تم منہ لٹکائے کیوں آ رہی ہو ..... کہنے کے لئے بس وہی رہ گیا تھا۔  
شمشیر نے ہلکی سی تھپکی سوہنی کی پشت پر دی۔  
وہ دیکھ کر رہ گئی۔ جیسے قوت گویائی سلب ہو چکی ہو۔  
شائد وہ اظہار سے باری تھی ..... اپنے جذبات اور خیالات کو

وہ ایک دم پلٹی۔  
چاچا دلور ..... کہاں چلے گئے یہ لوگ۔  
وہ دلور کے پاس بھاگ کر آئی۔  
باہر چلے گئے سوہنی ..... جا تو بھی اپنی جھگی میں ..... ان کو اپنا وطر اچھا نہیں لگتا ..... تجھے کیا پسند کریں گے۔ بلکہ بھول جائیں گے۔  
دلور نے سوہنی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔  
بیدار بھی چلا گیا۔ وہ مجھ سے کھیلتا تھا۔  
وہ ایک دم بولی۔

تو اور کیا ..... ان کا جم پل ہی امریکہ میں ہے۔ یہاں تو صرف اپنا کوٹھی کی نئے سرے سے مرمت کے لئے آئے تھے ..... امریکہ میں سار خاندان ہے ان کا۔  
دلور نے سوہنی کو بڑا سمجھانے کی کوشش کی۔  
امریکہ کیا ہے۔  
وہ معصومیت سے بولی۔

وہ بھی ایک ملک کا نام ہے۔ جس طرح ہمارا ملک پاکستان ہے نا ..... اسی طرح وہ بھی دور دراز کا ایک ملک ہے۔  
دلور نے کہا۔

بیدار اب کبھی نہیں آئے گا۔  
سوہنی کچھ نہ جانتے ہوئے بولی۔  
ہاں ..... شاید وہ کبھی واپس نہ آئے۔ وہیں سکون ملتا ہے انہیں۔  
وہ دلور کی بات پر اداس سی ہو گئی۔  
اس نے مجھے یاد تو کیا ہوگا۔  
سوہنی نے چونک کر کہا۔  
مجھے نہیں معلوم ..... البتہ میں ساحل سے اسے پکڑ کر لایا تھا ..... میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

اس کی سہیلی بنتو کی آواز آئی۔

آ جاؤ بنتی ..... لے جاؤ سوہنی کو اپنے ساتھ۔ چپ بیٹھی ہے۔

جیراں نے لیٹے لیٹے کہا۔

میں نہیں جاؤں گی۔

کیوں نہیں جائے گی ..... دیکھ سفید سفید چاندی بکھری ہے .....

تیری طرح روشن روشن۔ آ جا اٹھ۔

شمشیر نے قریب جا کر اس کے رخساروں کو چھوا۔

تو چلا جا۔

وہ لیٹ گئی۔

بنتو ..... آؤ اسے اٹھا کر ساحل پر لے جائیں۔

جیراں اور رامو ہنس دیئے۔

شمشیر نے سوہنی کے بازو پکڑے اور بنتو نے اس کے پاؤں پکڑے۔

سوہنی ہنستی ہوئی، دونوں تھکے لگاتی ساحل کی طرف بھاگ گئیں۔

بگلہ خالی ہو گیا اور سوہنی کو نہ جانے کیا ہو گیا۔

جیراں نے کہا۔

ہاں ..... وہ کھیلتی تھی وہاں ..... اچھے اچھے کھلونے تھے اس لڑکے

کے پاس۔

رامو نے کہا۔

چلو مان لیا وہ کھیلتی تھی لیکن ایسا بھی کیا کہ اس وقت سے اداس ہی

ہو گئی ..... کسی سے بات تک نہیں کرتی۔

جیراں سنجیدہ ہو گئی۔

شمشیر کے ساتھ کھیل لے۔

رامو نے کہا۔

شمشیر کے ساتھ نہ کھیلے ..... بس اس موٹے بیدار کو ہی یاد کرے۔

جیراں بری طرح اچھلی۔ اسے نہ جانے کیوں نفرت تھی اونچے لوگوں

دوسرے پر عیاں کرنا ابھی اسے نہیں آیا تھا۔ وہ ایک معصوم چھ سات سال کی بے ضرر بچی تھی۔

تو بولتی کیوں نہیں۔

شمشیر نے کہا اور اس کے رخساروں پر اٹکے آنسوؤں کو صاف کیا۔

کیا بولوں۔

وہ آنکھیں اٹھا کر بولی۔

یہی کہ پھر کیا ہوا کہ اگر بیدار چلا گیا ہے ..... میں تم سے کھیلوں

گی۔

شمشیر نے اسے سمجھایا۔

تم سے کیا کھیلوں۔ جو کچھ بیدار کے پاس تھا تمہارے پاس ہے۔

وہ تنک کر بولی۔

چلو نہ سہی ..... ہم دیے ہی کھیل لیا کریں گے ..... آؤ شاہو

کھیلیں۔

شمشیر نے سوہنی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

رہنے دے ..... شاہو کھیلیں۔

سوہنی نے دیے ہی اٹس اتاری۔

شمشیر ہنس دیا۔

اچھا نہ سہی ..... پھر کبھی سہی ..... وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

پھر چند دن اور گذر گئے۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا۔ سوہنی اور

زیادہ بیدار کے بارے میں سوچتی رہتی۔ اس نے اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کھیلا

بھی کم کر دیا تھا۔ بیدار اس کے حواس تک میں رچ گیا تھا۔ لمحہ لمحہ اس کی

یاد اسے ستاتی۔

آج چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چاند پورے جوہن پر تھا۔ قبیلے کے بچے

بچیار دریا کے ساحل پر کھیل تماشے کر رہے تھے کہ لڑکیوں نے بلہ بول دیا۔

سوہنی ..... سوہنی۔

..... دل لگ گیا اس کا ..... بیدار کے پاس چیزیں بھی بہت  
تھیں۔

رامو نے کہا۔

یہی تو میں کہہ رہی ہوں ..... وہ سب سے اچھی چیزیں اس کو ہی لیا  
کے دیوے تھا۔

جیراں نے کہا۔

جیراں یاد آیا ..... باندھو سلمان ..... صبح کوچ ہے۔

رامو نے حقہ ایک طرف رکھ دیا۔

کل کس وقت۔

جیراں بولی۔

دوپہر کے بعد ..... جھگیاں اٹھانے کھولنے میں وقت تو لگے گا۔

رامو نے کہا۔

میں کہتی ہوں اچھا بھلا تھا یہ ساحل۔

تو پاگل ہے۔ حکومت نے ساحل سے سب کو اٹھا دیا ہے ..... کہہ

رہے ہیں کسی کھلے میدان میں خیمے گھاڑو۔ ساحل پر آلودگی پھیلتی ہے۔

اچھا۔

جیراں نے ٹھنڈی آہ بھری اور لیٹ گئی۔

(3)

زندگی کی راہ پر خار پر چلتے چلتے بارہ سال کا عرصہ گزر گیا۔ وقت کی  
لہریں زندگی کے ساحل پر ایسے نقوش چھوڑ جاتی ہیں جو ذہن کی سلیٹ پر کندہ  
ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سوہنی اٹھارہ برس کی خوبرو دوشیزہ تھی۔ اس کی سیاہ  
بڑی بڑی آنکھیں تمام قبیلے والوں کا مرکز تھیں۔ ہر نوجوان اس کے ایک  
اشارے پر جان دینے کو تیار تھا۔ لیکن وہ گزرے لمحات کو نہ بھلا سکی۔ بیدار  
کے ساتھ گذرا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں میں تصویر کی طرح رقص کرتا  
لیکن حال دل زبان پر نہیں لا سکتی تھی کیونکہ وہ ظالم جوانی کی حدوں کو چھو  
رہی تھی۔ یہ دور تو ایسا دور ہے جب تنہائی میں نوجوان لڑکی مسکرا بھی دے  
تو دیکھنے والوں کے لئے سوال بن جاتی ہے۔

شمشیر ایک نوجوان وجیہ تناور شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں  
ہر وقت سوہنی کو محبت سے دیکھتیں۔ شہر کے بیرونی علاقہ میں اوڈوں نے ایک  
وسیع و عریض میدان میں خیمے گھاڑ لئے تھے۔ انہیں جھگیاں بنائے ابھی چند  
روز ہی ہوئے تھے۔ موسم کی سختی شروع ہو چکی تھی۔ کمر آلود دن گزار تو  
سیاہ بادلوں سے گھری رات آئی۔ تند ہوا کے جھکڑ چلے اور بادل ٹوٹ کر  
برسے۔ تاریک رات میں سب کچھ اٹھل پھل ہو گیا۔ رات بہت بیت چکی  
تھی۔ جھکڑ تھم چکے تھے۔ ہوا کی سرکشی مدھم پڑ چکی تھی۔ بادل چھٹ کر  
دھواں دھواں ہونے کے بعد مکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ فضا کی بھراہٹ پر  
قدرے تسکین کی سطح ابھر آئی تھی۔ شمشیر نے کڑواہٹ پر

روشن ہے۔  
 سوہنی نے شمشیر کی توجہ اس طرف دلائی۔  
 اوہو ..... دیکھا ہے بنگلہ بھی ..... تو چل جھگی میں۔ زہر لگتے ہیں  
 بنگلے۔  
 وہ زچ ہو گیا ..... اکثر اس بنگلے کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اب  
 ایک عرصے بعد پھر بنگلے کی مصیبت کٹری ہوئی ہے۔

وہ سوچنے لگا۔

کیا سوچنے لگا۔

سوہنی نے شمشیر کا بازو ہلایا۔

تو چل جھگی میں ..... بنگلوں کے خوب نہ دیکھ ..... اٹھ۔  
 دیکھ تو سہی آج اس کی بتی روشن ہے ..... میرا خیال ہے مالک آ  
 گئے ہیں۔

سوہنی نے کہا۔

دیکھ لیا ..... مالکوں نے تو آنا ہی ہے ..... تو اٹھ۔

شمشیر نے پھر اس کو بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

کیوں ستاتے ہو ..... بیٹھ جاؤ نا ..... ٹھہر کے چلتے ہیں۔

سوہنی نے زور سے شمشیر کا بازو کھینچا اور وہ اس کے پاس ہی بیٹھ  
 گی۔

تو سمجھتی کیوں نہیں ہے ..... چاچی اٹھ گئی نا تو سوہنی سوہنی کر کے  
 شور مچا دیوے گی۔ شمشیر نے ڈر لیا۔

کچھ نہیں ہوتا ..... تو دیکھ لال لال بتیاں کتنی بھلی لگیں۔

سوہنی کا دھیان پھر ادھر پنا گیا۔ ایک تصویر لہرا گئی اور وہ پھر تڑپ  
 گئی۔

شمشیر نے پلٹ کر سوہنی کی آنکھوں میں دیکھا ..... اس وقت لال  
 لال بتیاں سوہنی کی آنکھوں میں روشن نظر رہی تھیں۔

دور تک اسکے قبیلے برادری والوں کی جھگیاں قطار در قطار زمین پر  
 استادہ تھیں۔ یوں تاریک رات میں شرخوشاں کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔  
 شمشیر نے اپنے قریب دیکھا۔ اس کا چاچا راموں گہری نیند سو رہا تھا۔ پاس ہی  
 چاچی جیڑا خزانے پہ خزانے لئے جا رہی تھی۔ جیڑا کی جوانی کا دم خم ٹوٹ  
 چکا تھا لیکن مشقت کی عادی تھی۔ گھر میں بیٹھی بان بنتی اور رامو کے ساتھ  
 برابر کے پیسے کماتی تھی۔

دور سردی سے ٹھہرتا ہوا گیدڑ بولتا تو زندگی کا احساس ہو رہا تھا  
 ..... اور اور .....۔

وہ ایک دم سے اٹھا ..... چاچی جیڑا کے ساتھ والا بستر خالی تھا۔

سوہنی کہاں ہے۔ اس کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔

وہ تڑپ کر اپنے بستر سے اٹھا۔ آنکھیں پھاڑ کر اس نے سوہنی کے  
 خالی بستر کو غور سے دیکھا۔ سوہنی اپنے بستر پر نہیں تھی۔ سوہنی کا عدم وجود  
 اس کے احساس کو اس بخ بستہ رات میں یوں جلا کر راکھ کر گیا جیسے کسی نے  
 منوں مٹی کا تیل ڈال اڑا دیا ہو۔

کہاں چلی گئی۔ وہ دل میں بڑبڑایا۔

وہ آہستہ سے اٹھا اور جھگی کے باہر آگیا۔

کچھ فاصلے پر ایک نازک ساسایہ تھراتا ہوا نظر آیا۔

سوہنی ..... اس سردی میں بیٹھی ہو ..... کیا بات ہے۔

وہ چہتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

تو بھی آ جا ..... یہاں بیٹھ جا۔

سوہنی نے بازو سے پکڑ کر شمشیر کو پاس بٹھالیا۔

تو کیوں یہاں بیٹھی ہے ..... تجھے سردی لگ جائے گی ..... بیمار ہو

جائے گی۔

شمشیر نے پریشان ہو کر کہا۔

ادھر دیکھ اس بنگلے کی طرف ..... آج کئی دنوں کے بعد اس کی بتی

سوہنی کے انداز میں ناگواری کا عنصر شامل تھا اور سرکشی تھی۔  
 اچھا بابا اچھا ناراض نہ ہو ..... لے اب تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔  
 شمشیر بادل نخواستہ بیٹھ گیا۔  
 شمشیر۔

سوہنی نے آہستہ سے کہا۔

ہوں۔ بول۔

وہ کسی گہری سوچ سے ابھرا۔

یہ بنگلے والے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ حیرت سے بولی۔

بہت ظالم ہوتے ہیں ..... دولت ان کے گھر کی لونڈی ہوتی ہے۔  
 انسان کو جانور سمجھتے ہیں بلکہ ہم جیسوں کے ساتھ تو جانوروں سے بھی بدتر  
 سلوک کرتے ہیں ..... چھوڑ جاتے ہیں۔  
 شمشیر کو کچھ یاد آگیا۔

نہیں ..... ان کے اندر گھروں میں کیا ہوتا ہے ..... ان کے گھر کیسے  
 ہوتے ہیں۔

سوہنی نے کہا۔

گھر ..... گھر ان کے بڑے، خوبصورت ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے گیٹ  
 ہوتے ہیں لیکن ہم جیسوں کو گھسنے نہیں دیتے یہ بڑے لوگ۔ دھکے دے کر  
 باہر کال دیتے ہیں۔

شمشیر نے ہر درجہ نفرت کا احساس دلانا چاہا۔

وہ خاموش سنتی رہی۔

اب اور پوچھ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔

شمشیر نے کہا۔

ان کے دل ان کے گھروں کی طرح خوبصورت نہیں ہوتے۔ سوہنی  
 نے پھر سوال کیا۔

اب مئی ڈال ان پر ..... اپنی دنیا میں خوش رہ ..... ہمیں ان سے

شمشیر۔

سوہنی نے پکارا۔

ہاں۔

وہ چونکا۔

تمہیں معلوم ہے یہ بنگلہ کس کا ہے۔

مجھے نہیں معلوم البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس کو بنے ہوئے پندرہ سال  
 ہو چکے ہیں اور آج اس میں روشنی دیکھی ہے ..... کسی بہت بڑے آدمی کا  
 ہے۔

شمشیر نے ایک دم سے کہا۔

کوئی رہتا تو ہوگا اس میں۔

سوہنی کا تجسس بڑھتا گیا۔

ہاں نوکر چاکر تو ہوں گے ..... اتنا بڑا گھر ہے خالی تو نہیں ہوگا۔

شمشیر نے کہا۔

پندرہ سالوں میں یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔

سوہنی نے شمشیر کو دیکھا۔

او ہو دفعہ مارو اب ..... اپنی جھگی میں چل ..... چاچا اٹھ گیا تو غصے

ہوگا۔

کچھ نہیں ہوتا۔ چلے جائیں گے۔ پاس ہی تو ہے چلے جائیں گے نا۔

سوہنی نے شمشیر کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

وہ جھنجھلا کر پھر بیٹھ گیا۔

سوہنی سوہنی ..... اٹھ جا اب ..... برادری والا کوئی اٹھ گیا نا تو بات

کا افسانہ بن جائے گا ..... اب تو چھوٹی نہیں ہے۔

شمشیر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

ایک تو تجھے برادری والوں کا بڑا ڈر ہے۔ میں تو نہیں ڈرتی کسی

تے۔

کیا مینا دینا۔

وہ جھنجھلا کر بولا (ہائے اللہ کس طرح بنگلے کا خیال اس کے دل سے نکالوں) وہ سوچنے لگا۔

تو تو ایسے ناراض ہو جاتا ہے۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔  
وہ منہ بسور کر بولی۔

اچھا اٹھ جا ..... رات گزر رہی ہے۔ بلکہ اب تو پوہ بھی پھنسنے والا ہے۔ صبح کام بھی کرنا ہے۔

شمشیر نے چاہت سے سوہنی کا ہاتھ کھینچا۔

تو بڑا خراب ہے ..... مجھے نیند تو نہیں آئی۔

وہ ہنستی ہوئی شمشیر کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

کوئی بات نہیں ..... تیری عمر کی بالی چھوریوں کو نیند کہاں آوے ..... بس ساجن کی یاد ستادے۔

وہ شریر انداز میں سوہنی کے کان میں بولا۔

چل بٹ ..... کیسی باتاں کرے ..... شیطان کہیں کا۔

ایک ہلکا سا تھپڑ سوہنی نے شمشیر کے شانے پر جڑ دیا ... وہ یوں م

گیا ایسے یہی حیات کا پیش خیمہ ہو یا اب حیات ہو۔

کون ہے رہے۔

اندر داخل ہوتے ہی رامو کی گرج دار آواز سنائی دی۔

کوئی نہیں چاچا ..... میں پانی پینے اٹھا تھا۔

شمشیر لیتے لیتے بولا۔

سوہنی دبے دبے پاؤں اپنے بستر کی طرف بڑھ گئی۔

رامو کروٹ لے کر پھر گہری نیند کے مزے لینے لگا۔

روشنیاں پوری آب و تاب سے اس کے اندر سما چکی تھیں۔ وہ جس عمر میں تھی اس عمر میں تو ہر لڑکی خواب دیکھتی ہے۔ آرزوؤں کے محل تعمیر کرتی ہے۔ وہ جھگی میں پیدا ہوئی اور جھگی میں پروان چڑھی۔ وہ زمین پر رہ کر ستاروں کو چھونے لگی تھی۔ اس کے پاؤں دھرتی پر کہاں نکلتے تھے۔ وہ تو آسمانوں کی بلندیوں پر پاؤں نکانا چاہتی تھی۔ وہ حسین خواب دیکھتی۔ شہزادی بنی اور حکم چلاتی۔ قبیلے کا تو کوئی لڑکا اسے اچھا نہیں لگے ..... وہ شہزادے تلاش کرنا چاہتی تھی۔ اس کا دل کسی کو پسند نہ کرے اور نہ ہی اس کے من میں کوئی سماوے۔ وہ کیا چاہتی ہے اس کا اندازہ اسے خود تھا۔ اس کی کوئل جوانی، پھول سا گداز بدن جس کی پشت پر ناگن چوٹی لہرائے۔ وہ چلتی تو بڑے بڑوں کی کلجہ ہل جاتا۔ اس کے قدم قدم پر ساری بستی کے لڑکے دل نچھوڑ کر تے لیکن وہ کسی کی طرف آنکھ بھر کر نہ دیکھتی۔ اس کی سیلیاں اس کو کہتیں۔

اے سوہنی کبھی کسی کو گھاس ہی ڈال دیا کر۔ سب مارے مارے پھرتے ہیں۔

سوہنی شمو کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنستی۔

کے گھاس ڈالوں ..... کوئی من کو بھاوے تو سہی۔

وہ اٹھلا کر جواب دیتی۔

اور وہ تو تیرے پیروں تلے ہاتھ دیتا ہے۔

دوسری نے کہا۔

کون۔

سوہنی نے آنکھیں کھول کر حیرت سے کہا۔

دوسری حیرت زدہ سی شمو کی طرف دیکھ کر چونک گئی۔

اری وہی ..... شمشیر علی۔

ہاں۔

سوہنی پھر ہنس دی۔



بس ہنس کے بات کو ٹال دے۔ سچ بتا تو کس کو پسند کرے۔  
شمو نے کہا۔

قسم سے میں کسی کو نا چاہوں ..... کوئی اچھا ہی نا لگے۔  
وہ چوٹی کو ایک جھٹکے سے پیچھے پھینکتے ہوئے بولی۔  
اری کم بخت شمشیر کا کیا بنے گا۔  
شمو نے چٹکی کاٹی۔

اچھا ہی بنے گا ..... تو کیوں پریشان ہے اس کے لئے۔  
سوہنی نے ہنستے ہوئے شمو کو زبردست چٹکی کاٹی۔

مار دیا ..... چڑیل ..... وہ جان چھڑا کر بھاگی اور سوہنی مست ہرنی  
چال چلتی چوکڑیاں بھرتی شمو کے پیچھے بھاگی۔  
کہ ایک دم وہ اپنے قدموں پر رک گئی ..... اس کے سامنے تربوز  
بڑا سا چھلکا آکر گرا اور بھاری ققمہ سنتے ہی وہ رک گئی۔  
سوہنی نے تڑپ کر نظریں اٹھائیں۔  
تو ..... دارا کے بچے ..... خون پی جاؤں گی تیرا۔  
سوہنی دانت پیس کر بولی۔  
دارا ذرا سا پھر ہنسا۔

اوئے ناراض کیوں ہوتی ہے ..... تربوز کا چھلکا پھینکنے کا مطلب  
روکنا تھا۔ وہ جھگی سے باہر آگیا۔  
مجھے کیوں روکے گا تو ..... تیرا کیا حق ہے۔

وہ کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔  
کیوں نہ روکوں سوہنی تجھے ..... آخر تو میرے قبیلے کی ہے ..... کم  
تو ہنس کر بات کر لیا کر۔ ہمارا حق ہے تم پر۔  
وہ عاشقانہ انداز میں آگے بڑھا۔  
ہنہ۔

سوہنی نے جبک کر چھلکا اٹھایا اور کھڑاپ دارا کے چوڑے سینے

دے مارا اور بھاگ گئی۔

یار یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔  
ناجی اندر آتے ہوئے بولا۔

سمجھے ہے شزادی ..... قبیلے والا کوئی اسے اچھا ہی نا لگے۔  
دارا پیشانی پر بل ڈال کر بولا۔

ٹھیک ہی سمجھے ..... آنکھ تو ایسی ہے ..... ساری دنیا نظر آوے ان  
میں۔

ناجی دلچسپی سے بولا۔

بس شمشیر کو ہی چاہیے۔  
دارا بولا۔

شمشیر ہی اس پر مرے ..... اسے نہیں چاہت شمشیر کی۔  
ناجی نے کہا۔  
تو کیسے جانتا ہے۔  
دارا بولا۔

ارے میرے یار چاہت کی آنکھ اور ہووے ..... جو سوہنی میں  
نہیں۔

ناجی بولا۔

جانے دے ..... رہے گی تو قبیلے میں ..... کوہ قاف کی پری تو نا بنے  
لی۔

دارا جل کر بولا۔

تو ایسے کرو ..... چاچا رامو سے رشتہ مانگ لے اس کا۔  
ناجی ہنس کر بولا۔

کروں گا بات اماں سے ..... چاچا رامو میرا زاشتہ دار بھی تو لگے۔  
دارا کو جیسے کچھ یاد آگیا۔

اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ رشتہ مانگ لے ..... کیا پتہ کام بن

جائے۔

ناجی اٹھنے لگا۔

لیکن دارا اپنی ہی سوچوں میں مگن کھڑا رہا۔ اسے یہ احساس ہی کہ ناجی اٹھ کر باہر چلا گیا ہے۔

(4)

بھیڑوں کو چارا ڈالتے وہ ایک دم سے چونکی۔

دارا اسے بار بار آوازیں دیئے جا رہا تھا۔ اماں ..... جلدی آؤنا۔

آ رہی ہوں ..... دیکھتا نہیں ہے چارا ڈال رہی ہوں بھیتوں کو۔

وہ باہر سے ہی اونچی آواز میں بولی۔

جلدی کرو اماں ..... بڑی ضروری بات کرنی ہے تجھ سے۔

دارا پھر بولا۔

اچھا ..... لے پہلے تو بات کر لے ..... پھر کوئی کام کروں گی۔

وہ آخری بھیت کو سبز چارا ڈال کر دارا کے پاس آئی۔

یہاں بیٹھ۔

دارا بولا۔

کوئی خطرناک بات تو نہیں ..... جلدی بول نا ..... دل ڈر رہا ہے

میرا۔

کنیزاں خوفزدہ لگنے لگی۔

اوائے کوئی خطرناک بات نہیں ہے اماں ..... نا تو ڈرتی کیوں ہے۔

بہت برا ہوں میں۔

دارا اونچی آواز سے بولا۔

میں اس لئے ڈرتی ہوں کہ تو بات بات پر پھڑا جو ڈال لیتا ہے۔

ماں آرام سے بولی۔

پھڈے کی بات نہیں ہے اماں۔

اور پھر کیا بات ہے۔ بتانا۔

کنیزاں کو بیٹے کے چرے پر کئی سوالات و جواب نظر آنے لگے۔

تو میری شادی کے لئے پریشان ہے نا۔

وہ مسکرایا۔

ہاں پریشان تو ہوں میں ..... کوئی اچھی لڑکی ملے تو شادی کر دو

تیری۔

ماں نے کہا۔

تجھے میرے لئے کوئی لڑکی نظر نہیں آوے۔ سارا قبیلہ پھرا ہے

نے۔

وہ گھما پھیرا کر سوہنی پر آنا چاہتا تھا۔

ہزاروں لڑکیاں ہیں قبیلے میں ..... لیکن میں کچھ اور چاؤں۔

کنیزاں خیالات میں کھو گئی۔

تو کیسی لڑکی کو پسند کرے اماں ..... بتانا۔

وہ آگے کو ہو گیا۔

میں گھڑ لڑکی چاؤں ..... جو کام بھی کرے اور گھر بھی چلاوے اور

خوبصورت بھی بہت ہو ..... جیسا میرا بیٹا ہوئے۔

کنیزاں سوچتے سوچتے دارا کے چرے کو دیکھنے لگی۔

اماں ..... بس پھر مل گئی۔

وہ کچھ ہجھک سا گیا۔

ہاں ..... بول ..... چپ کیوں ہو گیا۔

کنیزاں ایک دم بولی۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔

تو سوہنی کا رشتہ کیوں نہیں مانگتی۔

وہ کہہ ہی گیا۔

سوہنی ..... تو سوہنی کے رشتے کی بات کرتا ہے ..... یہ کیسے ہو سکتا

ہے ..... رامو کبھی بھی نہ کرے سوہنی کا رشتہ تیرے ساتھ۔

کنیزاں چلا کر بولی۔

کیوں ..... میں محنت مزدوری نہیں کرتا۔ لولا لنگڑا ہوں میں۔

ارے باولے ..... وہ شمشیر کی منگ ہے۔ رامو کبھی ایسا نہ ہونے

دے گا۔

کنیزاں نے کہا۔

جانے دے ..... خواجواہ منگ ہے ..... کوئی منگنی ہوئی ہے قبیلے میں

..... سردار نے اجازت دی۔ پنچایت میں بات ہوئی۔

دارا ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

اس میں پنچایت کا کیا دخل ہے۔ رامو کے بھائی کا پتر ہے۔ جب جی

چاؤے رامو سوہنی کی شادی کر دیوے ..... ماں اٹھنے لگی۔

کہاں جا رہی ہے۔

دارا نے بازو پکڑ کر پھر کنیزاں کو بٹھالیا۔

تیرا بابا آنے والا ہے ..... روٹی پکاؤں گی ..... تو بھی تو بھوکا ہے۔

ماں پھر بولی۔

میری تو سوہنی سے شادی کرا دے ..... ساری بھک اتر جاوے گی۔

وہ سیدھا ہو کر دیوار سے ٹیک لگا کر بولا۔ سوہنی کی چوکڑیاں

نگاہوں میں گھومنے لگیں۔

ابھی چپ رہ بات کروں گی حیراں سے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ابھی کیوں نہیں کرتی۔

وہ بولا۔

ابھی نہیں ..... پھر کبھی سہی ..... تمہیں پتہ ہے کتنی مشکل بات ہے

..... میں تو رامو سے ڈر بھی رہی ہوں۔ بڑا کوڑا ہے۔ کوئی اچھا ویلا دیکھوں

گی۔

اپنی منزل کی طرف گامزن رہا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لایا ..... وہ سوہنی سے محبت کرتا تھا۔ وہ تنہا اس دشت میں سرگرداں رہا۔

کنیزاں خوفزدہ سی بولی۔  
کیوں ..... ڈرنے والی کونسی بات ہے۔ جہاں جواں چھوری ہوئے  
رشتے تو آنویں ہی آنویں۔ ایک پیری اور سو پتھر۔  
وہ بزرگانہ انداز میں بولا۔  
تو نہ گھبرا ..... لڑکی تیرے لئے اچھی ہی تلاش کروں گی ..... گھبرانا۔  
وہ باہر نکل گئی۔

صبح کاذب طلوع ہوئی۔ تاریکی سیاہ پردوں کی اوٹ میں روپوش ہو چکی تھی۔ جب سیاہ پردا چاک ہوا تو خوبصورت صبح نے انگڑائی لی اور مطلع صاف ہو گیا۔ روشن دن کی حیات بخش زندگی میں جھگیوں کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔ ہر جگہ سے کام کرنے کی آواز آ رہی تھیں۔ جیراں نے بھی چولے پر پانی کی دیکھی چڑھا دی تھی۔ رامو بیٹھا حقہ گھڑ گھڑا رہا تھا اور ساتھ ساتھ آگ بھی تپ رہا تھا۔

کیا کروں ..... سوہنی کے بغیر جینا بڑا مشکل نظر آوے ہے اماں .....  
وہ میرے من میں ساتی چلی جاوے ..... اس کی پازیب کلیجہ چیر دے میرا۔ وہ جب لہرا کر میرے پاس سے گزرے تو تمہیں کیا بتاؤں ..... میری کیا حالت ہوئے ..... ساری دنیا تھم جاوے۔

دارا نے خیالات کی پرچھائیوں میں آنکھیں بند کئے نہ جانے سوہنی کے ساتھ کتنا سفر طے کر لیا۔ سوہنی اس کے اندر اس طرح سا گئی تھی جیسے پھول کے اندر خوشبو۔ سیپ میں جیسے موتی اور جیسے گنگن میں تارا۔ وہ جیسے روح کے بغیر بدن۔ چاند کے بغیر چاندنی۔

لیکن وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز نور محل کو نظروں میں سمائے وقت گزار رہی تھی۔ وہ گزرے وقت کی کسی پرچھائیں کو اپنے ذہن کی سلیٹ پر قائم تو نہ رکھ سکی۔ شاید اس کی وجہ سوہنی کی بے حد کم سنی تھی لیکن فطری طور پر وہ اچھی چیزیں پسند کرتی تھی۔ اپنے آپ کو بلند جگہ پر دیکھنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔

شمشیر سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ حال دل بیان کرتے اس سے بھی خوفزدہ نا ہوتی تھی۔ شمشیر کو کبھی کبھی اس کی باتیں خائف کر جاتیں۔ پھر وہ ٹال جاتا کہ سوہنی نا سمجھ ہے۔ خود ہی شادی کے بعد درست ہو جاوے گی۔ لیکن معصوم شمشیر نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ سوہنی کی تشنگی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ بڑی بڑی عمارتوں کو دیکھ کر اپنی جھگی سے نفرت کرنے لگی ہے۔ وہ محبت کی آگ میں جلتا رہا ..... سکتا رہا اور آبلہ پا اس صحرا میں

جیراں پتی ڈال دے ..... پانی پک گیا۔  
وہ خشک پتلی پتلی لکڑیاں چولے میں گھیسڑ کر بولا۔  
اچھا۔

جلدی سے جیراں اٹھی اور لکڑی کے پھٹے پر سے چائے کی پڑیا اٹھائی اور دوسری طرف نظریں گھما کر سوہنی کو دیکھا ..... اٹھ جا ..... گھوڑے بیچ کر سوتی ہے کیا۔

جیراں نے پڑیا میں سے چائے نکال کر پانی میں ڈالی۔  
سوہنی نے پھول دار چادر کھینچ کر اوپر لی۔  
میں کہتی ہوں اٹھ بھی جا ..... دن کدھر کو جاوے ..... کام پر نہیں جانا تو نے۔

جیراں زور سے بولی۔  
چلی جاؤں گی کام پر ..... کام ہی کرنا ہے۔  
وہ کردٹ لے کر پھر سو گئی۔

اس کو دیکھ تو سہی ..... بس اٹھائے جا ..... اٹھائے جا اس کو .....  
بیمار تو نہیں۔

رامو کو جیراں پر غصہ آگیا۔  
دیکھتی ہوں ..... کہیں تاپ نا چڑھ گیا ہو۔  
وہ اٹھی۔

اٹھ جاوے گی چاچی ..... ابھی کام میں بڑی دیر ہے ..... سونے دے  
اس کو۔

شمشیر نے صاف پانی کی بالٹی جھگی کے باہر رکھی۔  
نا اتنے نکھرے اٹھایا کر اس کے ..... تنگ ہو جاوے گا ..... جگا اس  
کو ..... سورج سر پر چڑھا آوے۔ دھوپ چمک اٹھی اور تو کہتا ہے سویا رہنے  
دے۔

جیراں نے پیالی سے چائے پھینٹی۔  
اٹھ جاوے گی ..... تو پیچھے ہی پڑ گئی چھوری کے ..... دیکھ تو لے  
اس کی طبیعت نہ کھراب ہو ..... دھان پان سی بیٹی ہے ..... تھک گئی ہوگی۔  
رامو کو پھر غصہ آگیا۔

جیراں خاموش بیٹھی چائے ہلاتی رہی اور شمشیر جھگی میں چلا گیا۔  
رامو اٹھا اور سوہنی کے پاس چلا گیا۔  
اٹھ جا پتری ..... میرا بچہ اٹھ ..... دیر تک سونا ٹھیک نا ہوئے۔  
وہ بڑی محبت سے بولا۔

شمشیر لکڑی کے پھٹے پر سے ٹوٹا ہوا آئینہ اٹھا کر بال درست کرنے  
لگا۔

سوہنی نے آہستہ سے جمائی لی ..... جیسے سنبل تیز ہوا میں بکھر جائے  
اور بستر پر ہی بیٹھ گئی ..... نیم خواب نگاہوں سے سوہنی نے چاروں جانب  
دیکھا۔ وہاں نظریں نکا دیں جہاں شمشیر کھڑا تھا۔  
منہ دھولے ..... کام پر جانا ہے۔

شمشیر بن پنے لڑکھڑا گیا ..... وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکا۔ وہ  
پوری جان سے لرز گیا۔ نیند سے بوجھل آنکھیں لال لال ڈوروں کے اندر  
چھپی غنودگی۔ ایسی حالت میں کون نا مرتا ہو گا۔ مے کے دو پیالے تھے۔  
سوہنی نے چادر پرے پھینکی اور جوتا کھینٹی نکلے کی طرف چل دی۔  
یہیں دھولے ..... پانی لے آیا ہوں ..... سوہنی آجا۔  
وہ جاتی سوہنی کو پکارنے لگا۔

سوہنی پلٹی ..... پھر واپس آکر بالٹی کے پاس بیٹھ گئی۔  
شمشیر چولہے کے پاس بیٹھ کر پیالی میں چائے ڈالنے لگا اور وہ  
خاموش منہ ہاتھ دھوتی رہی۔ وہ دیکھتا رہا۔ خیالات کے جھوم نے اسے گھیر لیا  
تھا۔ سوہنی چند سالوں میں اس کی ہو جائے گی۔ میں جھگی میں نہیں رہوں گا۔  
ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا ..... میں کما کر لاؤں گا اور سوہنی اس گھر میں رہے  
گی۔ سوہنی میرا۔

دیکھ اور دیکھ چائے گری جاوے تیری۔  
رامو ایک دم ہڑبڑا کر بولا۔  
شمشیر بری طرح چونک گیا۔ جلدی سے اس نے پیالی سیدھی کی .....  
اس نے پیالی پرے کر لی۔ چائے تو اس کے پاؤں پر گر گئی تھی۔  
سو گیا تھا۔

رامو ہنس دیا۔  
شمشیر نے جیراں کی طرف دیکھا ..... وہ بھی ہنس رہی تھی۔  
سوہنی روٹی کھا لے۔

جیراں نے گھی والی روٹی چنگیر میں رکھی اس پر آم کے اچار کی ایک  
بھانک رکھ دی۔ کھا لے روٹی۔  
بھوک نہیں ہے۔

سوہنی نے آنچل سے چہرہ صاف کیا۔  
تو کھا لے پھر۔

جیراں نے وہی چنگیر شمشیر کے آگے کی۔  
روٹی باندھ دے چاچی ..... ہاف ٹائم میں کھالیں گے۔  
ہاں ہاں باندھ دے روٹی ان کی ..... لے پکڑ کپڑا۔  
رامو نے قریب سے کپڑا اٹھایا اور جیراں کو دیا۔  
تم دونوں میں جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔  
جیراں نے کہا۔

رامو نے بھی سوہنی کی طرف دیکھا۔  
سوہنی ہنس دی ..... یہ کیا جھگڑے گا ابا ..... پھر مجھ سے۔  
شمشیر سائیکل کی کاٹھی پر ہاتھ مار کر ہنس دیا۔  
میں تو ڈروں چاچا ..... بابا بڑی ظالم ہے یہ چھوری۔  
سوہنی اور جیراں بھی ہنس دیں۔  
ہاں پتر ڈرنا ہی اچھا ہوئے۔  
رامو نے کہا۔

شمشیر کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ کیا کر ..... بڑا نیگا بیٹا ہے میرا۔  
جیراں نے شمشیر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔  
رامو بھی حقہ گزرگا کر ہنس دیا۔  
چاچا ..... میں ڈرتا ہوں سوہنی سے ..... ڈروں گا تو گزارہ ہو گا۔  
ٹھیک ہے بیٹا ٹھیک ہے ..... ڈرے گا تو گزارہ ہو گا ..... بالکل میری  
طرح ڈریو ..... تیری چاچی سے بڑا ڈرتا ہوں میں۔

وہ اچک کر سائیکل کے کرسیز پر بیٹھ گئی۔  
شمشیر نے پلٹ کر دیکھا۔  
سوہنی کی غصیلی آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں ..... وہ لڑکھڑاسا گیا۔  
تو خوش ہو رہا ہے نا۔  
سوہنی نے کہا۔  
کس بات سے خوش ہوں گا میں۔  
وہ پیڈل پر مسلسل پاؤں مارتا رہا اور سائیکل تارکول کی چکنی سڑک  
پر پھسلتا رہا۔

ماں جو جھڑکتی ہے مجھے۔  
سوہنی نے کہا۔

میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا ..... مای تو آخر ماں ہے۔ پھر کیا ہوا۔  
وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔

تو کیا کہے گا ..... ماں جو تیری ساری کٹی پوری کر دیتی ہے ..... بات  
بات پر مجھے ہی کوئے دیتی ہے۔

ماں جو جھڑکتی ہے مجھے۔  
سوہنی نے کہا۔  
میں نے تو تمہیں کچھ نہیں کہا ..... مای تو آخر ماں ہے۔ پھر کیا ہوا۔  
وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔  
تو کیا کہے گا ..... ماں جو تیری ساری کٹی پوری کر دیتی ہے ..... بات  
بات پر مجھے ہی کوئے دیتی ہے۔

میں ٹھیک کہوں۔ بیٹا شمشیر بڑھی سے ڈرے گا تو زندگی اچھی  
گذرے گی۔  
شمشیر نے ہنستی آنکھوں سے سوہنی کی طرف دیکھا۔

وہ روٹھنے کے انداز میں بولے۔  
 میں چاچی کو منع کر دوں گا کہ تجھے کچھ ناکما کرے۔  
 وہ پلٹ کر بولا۔  
 وہ پھر بھی مجھے کہے گی..... اماں تمہاری ہے تمہاری۔  
 وہ ایک دم اتری اور شمشیر کے ساتھ پل کے دوسری طرف چل دی۔

(5)

سورج کا دکھتا ہوا گولہ مغرب کی وادیوں میں روپوش ہونے کو  
 تھرک رہا تھا۔ کائنات کے چاروں جانب سورج کی سسکتی لہو آشام کرنیں دم  
 توڑ رہی تھیں۔ حرکت کائنات جیسے تھم سی گئی ہو۔ ہر سو دیرانی ہی دیرانی  
 سی چھانے لگی تھی۔ فضا میں ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ پل کا کام رک گیا تھا۔ مزدور  
 اپنی باری کے انتظار میں ایک قطار کی صورت میں کھڑے تھے۔  
 منشی بڑے میز کے پاس بیٹھ جاتا اور مزدور باری باری مزدوری لینے  
 کے لئے میز کے پاس آتے اور رقم وصول کر کے انگوٹھا لگاتے۔  
 یہ لے۔

منشی نے شمشیر کو نوٹ پکڑائے۔  
 شمشیر نے نوٹ پکڑے اور انگوٹھے کو ڈھپ سے پیڈ پر رگڑا سیاہی  
 لگائی پھر رجسٹر پر ٹھوک دیا۔  
 اگلا نمبر..... سوہنی۔  
 منشی کے منہ میں جیسے شیرینی بھر گئی ہو۔  
 وہ نہیں آئی۔

شمشیر نوٹ جیب میں ڈالتا ہوا بولا۔  
 نہیں آئی..... صبح میں نے خود اسے دیکھا ہے۔  
 منشی چلا کر بولا۔

منشی جی کام پر تو آئی ہے..... مزدوری لینے نہیں آئی..... اس کی  
 دیہانڈی مجھے دے دو۔ میں دے دوں گا اس کو۔

شمشیر سوہنی کی مزدوری لے جاتا تو اچھا تھا۔

پاس کھڑے مزدور نے مزدوری لے کر جیب میں پیسے ڈالتے ہوئے

کہا۔

زیادہ حمایتی نا بن اس کا ..... ضرورت ہوگی خود ہی لے جائے گی

..... پیسے کی کسے ضرورت نہیں ہوتی ..... اکڑ خاں بنتا ہے۔

منشی نے پیسے جیب میں ڈال کر جواب دیا۔

ادھر وہ جلا بھنا منہ لٹکاتا سوہنی کے پاس پہنچا۔ وہ گیلی اوڑھنی جھٹک

کر اپنے اوپر لیتے حیرانی سے تنکے لگی۔

کوئی بات ہوئی ہے ..... لڑائی ہو گئی۔

منشی نے تیرے پیسے نہیں دیئے۔

شمشیر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

کیا ..... مزدوری نہیں دی ..... کام نہیں کیا میں نے۔

وہ دونوں ہاتھوں کو کولہوں پر رکھتے ہوئے جھک کر بولی۔

یہ بات نہیں ہے ..... وہ کہتا ہے سوہنی اپنی مزدوری خود لے آکر۔

شمشیر علی کو نہیں دوں گا۔

شمشیر بولا۔

دماغ چل گیا ہے منشی کا ..... شمشیر علی کس کا ہے۔

میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں ..... اس نے کیوں نہیں مزدوری

دی۔

شمشیر غصے میں بیٹھا رہا۔

تو کیوں جل رہا ہے ..... میں اس کا دماغ ٹھکانے لگاتی ہوں ..... یہ

سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔

سوہنی اپنی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے بولی۔

نہیں نہیں سوہنی ..... آج مزدوری منشی کے پاس ہی رہنے دے

..... نہیں لیں گے۔

شمشیر نے ہنس کے بات کی۔

تمہیں کیوں دے دوں بھی۔ سوہنی کی دیھاڑی ہے اسے دوں گا۔

منشی تن گیا۔

ہم کچے بندھے ہیں منشی جی ..... بھاگ نہیں جائیں گے ..... سوہن

پرانی تو نہیں ہے۔

شمشیر نے کہا۔

واہ بھی واہ ..... کل کلاں کو تو مکر جائے ..... پھر۔

منشی جل ہی تو گیا ..... سوہنی کے دیدار سے اس کی آنکھیں سیرام

جو نہیں ہوئی تھیں۔

منشی جی ..... ہم مزدور ہیں چور نہیں ہیں ..... سوہنی نلکے پر ہاتھ د

رہی ہے ..... وہ نہیں آئے گی ..... نہیں دے گا تو چلے جاتے ہیں۔

شمشیر پلٹا۔

ارے بھی سوہنی کی مزدوری ہے ..... سوہنی لے گی ..... کوئی جھگڑ

ہے ہمارا تم سے۔

منشی طنز آمیز انداز میں بولا لیکن ذرا نرمی سے۔

رکھ لے پیسے ..... سوہنی نہیں آئے گی۔

وہ کندھے پر چادر ڈالے واپس چلا گیا۔

منشی جی بڑے صاحب کو جھگڑا پسند نہیں ہے۔ قریب کھڑے ایک

آدمی نے کہا۔

جانتا ہوں ..... اس لڑکے کے مزاج ہی اور ہیں۔ بات سمارتا

نہیں ہے۔

منشی جی نے ٹوپی اتار کر دوبار سر پر رکھی۔

اور وہ جو اس کی سوہنی ہے ..... ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔

منشی جی دوبارہ بولے۔

کیوں بیٹھنے دے مکھی ..... ڈٹ کر کام کرتے ہیں ہم لوگ ..... آ



تینوں ساتھ ساتھ بھگی کی طرف آگئے۔  
 شمشیر نے سائیکل کھڑی کی۔  
 کوئی وجہ ہوگی ..... لڑ پڑی ہوگی کسی سے ..... زبان جو چلتی ہے  
 قینچی کی طرح وہ سوہنی کو کونسنے لگی۔  
 میں ہی لڑتی ہوں سب سے ..... یہ تو کاکا بھولا ہے ..... روٹی کو  
 چوچی کئے ..... ہاں۔  
 وہ غصے میں ہاتھ نچا کر بولی۔  
 شمشیر کھل کھلا کر ہنس دیا۔  
 چاچی ..... راستے میں تو چنگی بھلی تھی ..... یہ آتے ہی کیا ہو گیا۔  
 شمشیر پھر ہنس دیا۔  
 ناب اسے کیا ہو گیا۔  
 جیراں نے کہا۔  
 کچھ نہیں ہوا ..... بس منشی سے جھگڑا ہو گیا تھوڑا سا۔  
 منشی سے جھگڑا کیوں ہوا ..... اور ہاں آج پیسے ملے۔  
 جیراں نے کہا۔  
 یہ لے میری مزدوری ..... سوہنی کے کل ملیں گے۔  
 شمشیر نے کہا۔  
 سوہنی باہر کچھی چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔  
 سوہنی نے کام نہیں کیا ..... کیوں ایسی باتاں کرے ہے منشی۔  
 جیراں غصے سے بولی۔  
 گھبرانا ..... کل سب ٹھیک ہو جاوے گا۔  
 کیا ٹھیک ہو جاوے گا ..... کیوں ضد کرتا ہے وہ تم دونوں سے۔ میں  
 خود بات کروں اس سے۔  
 جیراں بہت غصے میں بولی۔  
 منشی سے بات کرنے کو میں ہی بہت ہوں اماں ..... آج تو شمشیر نے

کیوں؟  
 وہ چونک کر بولی۔  
 بس میری عزت کا سوال ہے ..... تو یہ پکڑ ..... میری مزدوری  
 لے۔  
 جیب میں ہاتھ ڈال کر بولا۔  
 ہیں تیری عزت کا سوال ہے ..... بات کیا ہے ..... کیا مطلب  
 تیرا۔  
 سوہنی شمشیر کے بازو کو ہلا کر بولی اور نوٹ واپس اس کی جیب  
 ڈال دیئے۔  
 منشی تجھے کیوں بلاتا ہے ..... مجھے تیری مزدوری کیوں نہیں دیتا ..  
 پچھلے دنوں خیر و اپنے بھائی کی مزدوری لے گیا ..... سب مزدور ایسا کرتے  
 ..... منشی نے تیرے آنے کی پابندی کیوں لگا رکھی ہے ..... جب بھی تو نہ  
 ہوتی وہ تیری مزدوری مجھے نہیں دیتا۔  
 شمشیر کاندھے پر رکھے رومال سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔  
 تو نا پریشان ہو ..... دیکھنا ذرا کل کیسی خبر لیتی ہوں ..... اس منشی  
 بچے کی۔  
 وہ موتیوں جیسے سفید دانت پیش کر بولی۔  
 چلو گھر ..... چاچی باہر کھڑی انتظار کر رہی ہوگی۔  
 وہ سائیکل پر بیٹھی۔  
 اور شمشیر جھگی کی طرف چل دیا۔  
 حسب عادت جیراں سڑک پر کھڑی تھی۔  
 شمشیر ہنس کر وہیں اتر بیٹھا۔  
 اتنی دیر لگا دی تم دونوں نے۔  
 جیراں نے سوہنی کو آگے دیکھ کر کہا۔  
 ایسے ہی دیر ہو گئی چاچی۔ شمشیر نے کہا۔

روک دیا۔

آج کس بات سے منشی کا دماغ چکر اگیا۔

جیراں نے کہا۔

کام کے بعد سوہنی نکلے پر منہ دھو رہی تھی۔ میں اس کی مزدور لینے چلا گیا۔

شمشیر نے کہا۔

پھر کیا ہوا؟

جیراں بولی۔

منشی نے ضد باندھ لی کہ سوہنی خود لیوے آکر مزدوری۔

یہ تو کوئی بات نا ہوئی ..... تو خود چلی جایا کر۔

جیراں نے سوہنی کی طرف منہ کر کے کہا۔

تو نہیں سمجھتی اماں ..... منشی بڑا خراب ہے۔ میں سب جانتی ہوں

کہ اس نے مجھے کیوں مزدوری نہیں دی۔

سوہنی سوچنے لگی۔

جو تو سوچ رہی ہے نا وہ ہی میں سوچ رہا ہوں۔

شمشیر نے فوراً "سوہنی کی بات کی تائید کی۔

ہاں وہی سوچ رہا ہوں ..... میں تو حیران ہوں کہ تو منہ میچ کر کیوں

چلا آیا کچھ نہیں بولا ..... اگلی بدھ کو دیکھنا ..... میں اس کی مزدوری لینے

جاؤں گی۔

وہ شدید غصہ کے عالم میں چار پائی پر دوبارہ بیٹھ گئی۔

اچھا ..... اچھا بس غصہ تھوک دو ..... چاچی چائے بنا دے ..... و

رومال جھاڑتا ہوا جھگی میں چلا گیا۔

ایک دن ..... دوسرے دن اور پھر ایک پورا ہفتہ گذر گیا۔ وہ شمشیر

کے ساتھ سائیکل پر سوار کام پر روانہ ہو گئی۔ بیشک شمشیر تمام راستے ات

سمجھاتا رہا لیکن مرغ کی وہی ایک ٹانگ۔

دیکھنا ذرا منشی کو وہ مزا پکھاؤں گی کہ ساری عمر یاد کرے گا۔

وہ سائیکل سے اترتے ہوئے بولی۔

دیکھ ..... سوہنی زیادہ جھگڑا نا کرنا ..... روزی کا معاملہ ہے ..... اچھے

بھلے پیسے بن جاتے ہیں۔

شمشیر نے کہا۔

چار باتیں تو ضرور کروں گی ..... منشی تو پہلے ہی مجھے اچھا نہیں لگتا۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

زیادہ غصہ نا کر ..... گالوں کی لالی ماند پڑ جاوے گی۔

شمشیر بڑی اپنایت سے بولا۔

اور سوہنی کھل کھلا کر ہنس دی۔ ایسی باتاں نہ کر۔

بس یوں ہی ہنستی ہوئی اچھی لگے تو۔

شمشیر نے کہا۔

تو بات ہی ایسی کرتا ہے۔

چلتا چلتا بولا اور ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔

سوہنی زور سے ہنسی ..... جیسے مالا ٹوٹ کر شیشے پر بکھر گئی ہو۔

ذرا بچ کے چل جگہ جگہ راستہ خراب ہے۔ روڑے پتھر تو پڑے

ہیں۔

تو جو ساتھ ہے ..... سامنے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

وہ ہنس دی۔

پل آگیا تھا۔

اور کام شروع ہو چکا تھا۔

چاہت کا مارا۔ سوہنی کی الفت میں زندگی پر مسرت گزار رہا تھا۔

شمشیر نے کہا۔

اچھا..... وہ ایک دم مست غزال کی طرح چوکڑیاں بھرتی اپنے کام پر پہنچ گئی۔

سوہنی گھٹی بج رہی ہے۔

اس کی ساتھی ایک لڑکی نمونے کہا۔

گھٹی کی آواز مسلسل آ رہی ہے۔

دونوں کان لگا کر سن رہی ہیں۔

بڑا صاحب بلا رہا ہے..... سوہنی نے کہا۔

مزدوروں کا جہوم جمع ہو چکا تھا۔ ایک طرف بڑا صاحب اپنے کارندوں اور منشی کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے آگے آگے ہونے کی کوشش میں صاحب کے قریب ہونا چاہتے تھے۔ وہ اپنے صاحب کو بہت قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے سنا تھا کہ ان کا صاحب ایک سیٹھ ہے اور امریکہ میں رہتا ہے۔ یہاں تو صرف کام کے سلسلے میں آیا ہوا ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ کام میری توقع سے بڑھ کر ہو رہا ہے اور بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں کو مزدوری وقت پر مل رہی ہے۔

صاحب نے پوچھا۔

جی..... وقت پر مل رہی ہے۔

جمع میں سے آواز آئی۔

سوہنی شمشیر کے ساتھ گھٹی ہوئی صاحب کے قریب چلی گئی۔

آپ سب لوگ کام جی لگا کر کریں..... آئندہ ہفتوں میں آپ کی مزدوری میں اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔

سب لوگ بہت خوش ہوئے۔

بڑا صاحب زندہ باد..... بڑا صاحب زندہ باد۔

(6)

شمشیر شمشیر..... وہ دیکھو منشی آ رہا..... ابھی ثابت کر لوں۔

وہ بھاگ کر شمشیر کے پاس آ گئی۔

باولی ہو گئی ہے۔ دیکھتی نہیں بڑا صاحب اور اس کے بندے بھی

ساتھ ہیں۔

شمشیر نے گہری نظروں سے دور دیکھا۔

سیٹھ اور غیر ملکی لوگ ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔

ان میں بڑا صاحب کون ہے۔

سوہنی نے دیکھا۔

وہ سب سے لمبا..... سفید سفید..... سنہری بالوں والا۔

شمشیر نے کہا۔

اچھا۔

وہ دیکھتی رہ گئی..... (کیسا بھلا ہے بڑا صاحب)

دل میں سوچ کر رہ گئی۔

کیا؟

شمشیر چونکا۔

کچھ نہیں..... میں نے تو کچھ نہیں کہا۔

وہ چونک کر بولی۔

وہ لوگ قریب آ رہے تھے۔

تو جلدی سے کام پر چل..... بڑا صاحب ناراض نہ ہو۔

نعرہ بازی ہونے لگی ..... سب مزدور بہت خوش ہوئے۔

سوہنی مدہوش بڑے صاحب کو دیکھتی رہ گئی ..... بڑے صاحب  
نقش و نگار اس کی نگاہوں میں رقص کرنے لگے۔ دل سے ہوک سی ا  
..... لیکن جان نہ سکی کہ کون ہے جو میرے اندر چاہت کی جوت جگا رہا ہے  
صاحب میرے اندر کی آگ کو کیوں بھڑکا رہا ہے۔ وہ دیکھتی رہی اور صاحب  
آگے کی طرف بڑھ گئے۔

چلو چلو کام پر ..... صاحب چینگ کے لئے آرہے ہیں۔  
منشی جی نے کہا۔

سوہنی ایک دم سے چونکی۔

سوہنی جاتے ہوئے اپنی مزدوری لے جاتا ..... پچھلے بدھ کو نہیں  
آئیں تھیں نا۔

وہ سوہنی کو دیکھ کر نرمی سے بولے۔

بڑے صاحب ایک دم پلٹے ..... مزدوری بروقت کیوں نہیں ادا

منشی جی۔

بروقت ہی ادا کی جاتی ہے سرکار ..... پچھلے دنوں سوہنی حاضر نہیں

تھی۔

وہ سوہنی کو دیکھ کر منت بھرے انداز میں بولا اور نگاہوں میں

تھی۔

سوہنی نے پلٹ کر بڑے صاحب کو دیکھا۔ سوہنی کا سراپا بولے

صاحب کی نگاہوں میں اتر گیا۔

مزدوری وقت پر ادا کیا کریں منشی جی۔

وہ سوہنی کو بغور دیکھ رہے تھے۔ مجمع چھٹ رہا تھا ..... شمشیر بھی

چکا تھا۔

ایسا ہی ہوگا سرکار۔

منشی گھایا نے لگا۔

غریب لوگ ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لئے کس قدر عرق  
ریزی کرنا پڑتی ہے ان کو۔ وہ اپنے انجینرز کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

اور سوہنی اپنے کام پر پہنچ گئی۔

Very Good ..... بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

سیٹھ نے کہا۔

او ..... بس ..... واقعی ..... بڑی پھرتی اور مہارت کے ساتھ۔

پیٹر نے دیکھا ..... وہ سیٹ کو مشینوں کے انسان کے ساتھ چلتے  
دیکھ کر حیران رہ گیا۔

وہ اچھی طرح مزدوروں کو کام کرتے دیکھ کر مطمئن سے ہو گئے۔

اور اطمینان سے اپنی مرسدیز میں بیٹھ گئے۔

ڈرائیور نے گاڑی شارٹ کر دی۔

اور منشی نے ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھا ..... تیرا شکر ہے

رہا۔

وہ دوسری طرف چل دیا جہاں سوہنی کام کر رہی تھی۔

یا الہی یہ لڑکی ہے یا چھلاوہ ..... دو وزن دار تسلے اٹھائے تیرے

منزل پر جاتی اور پلک جھپکتے ہی لوٹ آتی۔

وہ تھرا سا گیا ..... سوہنی نے اسے پلٹ کر گھورا تھا ..... وہ نگاہوں

کی تاب نہ لا کر دوسری سمت روانہ ہو گیا۔ کام اچھی طرح ہو رہا تھا .....  
ایک جگہ کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔

شام چھ بج رہی تھی۔ شمشیر فارغ ہو کر سوہنی کے پاس آیا۔

چل منشی کے پاس ..... دیے بھی بدھ ہے ساری رقم لے کر جانی

ہے۔

شمشیر نے سوہنی کے پاس جا کر کہا۔ وہ اسوقت نکلے پر ہاتھ اور منہ

دھو رہی تھی۔

گھبرانا ..... چلتے ہیں۔

سوہنی نے اوڑھنی کو اچھی طرح اوپر لیا اور تیار ہو گئی۔  
پلو۔

دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔

دونوں کو آتے دیکھ کر منشی پہلے سے ہی خبردار ہو چکا تھا۔ وہ سوہنی سے خوفزدہ بھی رہتا کیونکہ سوہنی نے لحاظ تو کرنا نہیں ہوتا۔  
آؤ شمشیر..... مزدوری لینے آئے ہو۔  
منشی نے کہا۔

جی ہاں منشی جی..... پچھلی اگلی ساری مزدوری دے دو..... اور ہاں پچھلی بدھ کو مزدوری شمشیر کو کیوں نہیں دی۔  
وہ تلخ ہو گئی۔

اصول کی بات ہے سوہنی..... ایک کی دوسرے کو نہیں دے سکتے۔  
منشی جیب سے پیسے نکالنے لگا۔

شمشیر دوسرا ہے..... تو جانتا تو ہے..... شمشیر اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوہنی غصے میں بولی۔

جانتا ہوں..... آئندہ شمشیر کو دے دیا کروں گا..... گھبرا کیوں رہی ہے۔

منشی نرمی سے بولا..... یہ لے پیسے۔

پکڑے لے شمشیر اور ہاں منشی خیال رکھنا۔

سوہنی نے اوائے دلربائی سے بڑی تمکنت سے کہا۔

لے لے بھی لے لے..... تیرے اور سوہنی کے پیسے دو ہیں کوئی۔

وہ شمشیر کو نوٹ پکڑاتے ہوئے ہنس کر بولا۔

شمشیر نے ہنس کر نوٹ گئے اور اپنی جیب میں ڈال لئے۔

آئندہ کوئی گڑبڑ نہ کرنا منشی..... نہیں تو بڑے صاحب کو شکایت کر

دور آئی۔

وہ جاتے جاتے بولی۔

اور شمشیر ہنس دیا۔

منشی نے ہنس کر بات کی تلافی کر دی۔

دونوں سائیکل پر سوار گھر کی جانب چل دیئے۔

واہ سوہنی کیا بات ہے تیری۔

شمشیر بولا۔

کیوں؟

تیرے سے تو منشی بھی خوف کھا گیا۔ میں کیا شے ہوں۔

وہ رفتار بڑھا رہا تھا۔

منشی کو دفعہ کر..... اپنی بات کر۔

سوہنی ہنسی۔

شمشیر۔

ایک دم سوہنی نے پکارا۔

کیا ہے؟

شمشیر تیز تیز پیڈل مار رہا تھا۔

یہ ہوٹل ہے۔ سنا ہے یہاں بڑے اچھے اچھے کھانے ہوتے ہیں۔

سوہنی کی جیسے رال ٹپک پڑی۔

سب کچھ ہوتا ہے لیکن تو کیوں پوچھتی ہے۔

شمشیر حیران ہو گیا۔

آج لے چلنا یہاں..... رات کا کھانا یہیں کھالیں گے۔

وہ اسرار بھرے انداز میں بولی۔

کیا کہہ رہی ہو..... اس میں ہم جیسے لوگ نہیں جاتے۔

شمشیر کو سوہنی کی اونچی خواہشات کا احساس تھا..... کبھی کبھی اسے

غصہ بھی آ جاتا۔

تو کیا ان میں ڈھور ڈنگر جاویں..... ہم جیسے لوگ نہ جاویں تو۔

وہ دور تک بھاگی لیکن رنگین اوڑھنی ہوا کے دوش پر اڑتی جا رہی تھی..... شمشیر نے بالٹی چھوڑی اور سوہنی کے ساتھ بھاگا..... وہ سڑک پار کر گئے۔

سوہنی کی ناگن زلفیں کھل کر اس کے وجود کو لپیٹ چکی تھیں..... بدن پانی سے بھیگا ہوا۔ شمشیر بھاگ رہا تھا لیکن اوڑھنی کبھی اوپر اٹھتی اور کبھی گرتے گرتے پھراڑنے لگتی۔ ایک دم دونوں گیٹ کے باہر رک گئے۔ گیٹ کھلا تھا اوڑھنی لڑکھڑاتی ہوئی بے بس ہو کر نور محل کے خوبصورت پودوں پر گری اور کانٹوں سے الجھ گئی۔

چھتری نما درخت کے نیچے سے ایک خوبصورت نوجوان نے اپنے ماتھے سے پانی جھنکا اور حیرت سے نکلنے لگا۔ اندر آ جاؤ۔

نوجوان مسکرایا۔ سوہنی کی صورت اسے جانی پہچانی نظر آ رہی تھی۔ دونوں سہمے ہوئے چلتے چلتے ان کے پاس آ گئے۔ بیدار بخت شمشیر کے عقب میں سوہنی کو دیکھ کر مسکرائے۔ سوہنی کے چہرے پر شبنمی قطرے بلا کے دلکش نظر آ رہے تھے۔ جیسے سفید گلاب پر اوس پڑی ہو۔

چہرہ کیا ہے روشن چراغ۔ زلفیں ناگ کی طرف کندل مارے ہوئے۔ آنکھیں غزال رمیدہ جیسی سہمی ہوئیں۔ دل کو چسید جانے والی..... سوچتے ہوئے انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔

پیڑ۔

لیں باس۔

پیڑ ایک لمحے میں قریب آ گیا اور دلچسپی سے دونوں کو دیکھنے لگا۔

کیسے آئے ہو۔

بیدار بخت مسکرائے۔

شمشیر نے پلٹ کر سوہنی کی طرف دیکھا۔ بیدار کا ہیولہ نگاہوں میں

سوہنی کو غصہ آ گیا۔

تو سمجھتی کیوں نہیں..... اچھے کپڑوں والے جاویں ان میں..... تیرے میرے کپڑے اس قابل ہیں..... مٹی سے بھرے ہوئے اور گندے ہاتھ پاؤں..... تو سمجھا کر۔

وہ چرا اس کی طرف کر کے محبت سے بولی۔

اچھا پھر کبھی جاویں گے۔

سوہنی کے انداز میں حد درجہ یاس اور تشنہ تکمیل تمنا کا اظہار محسوس ہو رہا تھا۔

شمشیر..... دیکھو..... دیکھو کوٹھی کا گیٹ بھی کھلا ہے۔

وہ ایک دم چونکی۔ وہ شمشیر کی توجہ گیٹ کی طرف دلانا چاہتی تھی۔

اس کوٹھی کے مالک ولایت سے آ گئے ہیں۔

شمشیر نے کہا۔

یہ سب ولایت میں رہتے ہیں۔

سوہنی نے کہا۔

ہاں تو اور کیا..... ان کا سارا خاندان ولایت میں رہتا ہے..... یہاں

تو کسی کام کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں۔

شمشیر نے ایک جگہ سائیکل کھڑی کی۔

سوہنی اچھل کر نیچے اتری۔

باہر جیراں ان کی راہ تک رہی تھی اور رامو نکڑیاں کاٹ رہا تھا۔

موسلا دھار تیز بارش نے خیمے کی طنائیں توڑ ڈالیں۔ خیمے کی کڑیاں

تیز و تند ہوا میں بکھر گئیں۔ پانی اندر تک گھس آیا تھا۔ اوڈوں کی زندگی بھی

کیا زندگی ہے۔ نت نئے انداز میں ان بیچاروں کو موسموں کی چیرا دستیاب

برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ منہ زور تیز ہوا خونخوار سانپوں کی طرح پھنکار رہی

تھی۔ بڑا کا زور کم نہیں ہو رہا تھا کہ ایک طرف سوہنی کی چیخ بلند ہوئی۔

شمشیر..... ہوا اڑا کے لے گئی۔

گوم گیا۔

صاحب جی..... ہوا میری اوڑھنی اڑا کر یہاں لے آئی ہے۔

وہ معصومیت سے بولی۔

تمہاری اوڑھنی اور تمہارے بغیر ہی..... وہ کیسے؟

وہ حیرت زدہ سے رنگین اوڑھنی ایک پودے پر لٹکی ہوئی دیکھنے

لگے۔

صاحب جی تیز ہوا اڑا کر لے آئی جی میری اوڑھنی..... ہمارے تو

کئی خیمے بھی اکھڑ گئے۔

سوہنی نے ایک دم سے کہا۔

شمشیر کو تو کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی..... یہ سوہنی کا ہی کام

تھا جو باتیں کئے جا رہی تھی۔

کس قدر فرحت بخش ہوا ہے۔

پیر نے ایک لمبا سانس لیا۔

بیدار بخت دور جگیوں کی بربادی دیکھ رہے تھے۔

یہ ہوا جس قدر فرحت بخش ہے..... اتنی ظالم بھی ہے صاحب جی۔

شمشیر نے جرات کی۔

تم ٹھیک کہتے ہو نوجوان..... ہوا اگر ظالم نا ہوتی تو آج یہ اوڑھنی

ہمارے باغ میں نہ اترتی۔

وہ جھکے اور اوڑھنی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی اور سوہنی کی طرف ہاتھ

بڑھایا۔

سوہنی اور شمشیر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

پکڑ لو۔

لیکن سوہنی خوفزدہ سی کھڑی رہی۔

شمشیر آگے بڑھا اور سیٹھ بیدار بخت کے ہاتھ سے اوڑھنی پکڑ کر

سوہنی کو دے دی۔

وہ سادہ حسن کے چکا چوند روشنی سے بری طرح مسخر ہو چکے تھے۔

سوہنی ان کی نگاہوں کے رستے دل میں اترتی چلی گئی۔ سوہنی نے آنچل سینے

پر پھیلا لیا۔

تم ان خیموں میں کب سے رہ رہے ہو۔

بیدار بخت بولے۔

ایک عرصہ ہو گیا ہے سرکار۔

ہم تو پیدا ہی ان جگیوں میں ہوئے ہیں صاحب جی۔

سوہنی نے کہا۔

صاحب پوچھ رہے ہیں کب سے۔

شمشیر بولا۔

جب سے پیدا ہوئے۔

وہ ہنس دی۔

بیدار بخت بھی مسکرا دیئے..... سوہنی کی باتیں انہیں اچھی لگنے لگی

تھیں۔ اتنی معصومیت سادگی کم ہی انہیں دیکھنے میں آئی تھی۔ پیر اور بیدار

بخت بڑی خوبصورت نظروں سے سوہنی کو دیکھ رہے تھے۔

تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو..... ان کے دماغ میں کئی دائرے بنتے

اور پھر صاف ہو جاتے۔

بس جی..... ہمارے پاس سوائے باتوں کے رکھا ہی کیا ہے۔

سوہنی نے پھر کہا۔

پیر ہنس دیا۔

بیدار بخت اسے دیکھنے لگے..... سوہنی نے نظریں اٹھائیں..... یہ

چار آنکھوں کا تصادم بڑا جان لیوا ثابت ہوا..... وہ گھبرا کر پٹلی۔

چلو شمشیر چلیں..... جھگی کی تتائیں ڈھیلی ہو چکی ہیں..... ان کو

گانٹھتا بھی ہے۔

ہاں ہاں..... چلو..... اکیلا چاچا کچھ نہ کر سکے گا۔

بیدار بخت نے پیٹر سے کہا۔

میں بہت کچھ سوچ رہا ہوں سر..... ہر پہلو پر میری نظر ہے۔  
پیٹر نے کہا۔

کون سے پہلو۔ ذرا وضاحت کرو..... تاکہ ہم بھی جان سکیں۔  
بیدار بخت ہمہ تن گوش ہو گئے۔

ابھی میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا..... کیونکہ اچھے برے کام سے  
آپ کو خبردار کرنا میری ڈیوٹی میں شامل ہے..... صرف آپ جذبات کو  
کنٹرول میں رکھیں گے گا۔

ملازم نے رسیور بھاگ کر بیدار بخت کو تھمایا..... جسے ایک دم  
انہوں نے پیٹر کی طرف بڑھا دیا۔

کائنات پر ملگبی روشنی پھیل چکی تھی۔ نور محل کی روشنیاں روشن  
ہو چکی تھیں۔ خوبصورت رنگ و روغن سے دلکش سفیدی رنگین کھڑکیوں  
سے بڑا ہی سحر آفریں منظر پیش کر رہی تھیں۔ ایسے لوگوں کی تو راتیں بھی  
بڑی حسین ہوتی ہیں۔ بیدار بخت اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور پیٹر اپنے  
کمرے میں جا چکا تھا۔

جھگیوں والوں نے اپنی اپنی تائیں کس لی تھیں۔ تیز و تند آندھی  
اور زبردست بادوباراں نے ان کے رہنے سہنے کے سلسلے کو درہم برہم کر دیا  
تھا۔ کہاں کی کہاں چیزیں آندھی اڑا کر لے گئی تھی لیکن پھر بھی جفاکش  
لوگوں نے بھاگم بھاگ بکھری چیزوں کو سمیٹ لیا تھا۔ زندگی پھر سے رواں  
دواں ہو چکی تھی۔ سب خیموں میں گھسے بیٹھے تھے۔ آندھی بارش سے موسم  
میں خنکی بڑھ چکی تھی لیکن وہ خیمے سے باہر پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔  
جیراں اور رامو اندر دیکھے بیٹھے تھے۔

شمشیر نے ارد گرد بغور دیکھا۔

اندر آجا سوہنی..... ہوا بہت تیز ہے..... اڑ جائے گی۔

شمشیر نے لالین لہرا کر اٹھائی اور سوہنی کے لئے روشنی کی لیکن

شمشیر نے کہا۔

صاحب جی سلام۔

وہ پلٹ کر بولی۔

سلام صاحب..... شمشیر سوہنی کو لے کر واپس پلٹ گیا۔

سر لوٹ آئے..... سوہنی چلی گئی ہے۔

پیٹر نے بیدار بخت کو مدہوش دیکھ کر کہا۔

What..... بیدار بخت ایک دم چونکے۔

آئے..... وہاں بیٹھتے ہیں۔

دونوں چلتے چلتے خوبصورت کرسی پر بیٹھ گئے۔

پیٹر۔

بیدار بخت نے ایک لمبا سانس لیا اور ٹانگیں ڈھپ سے درمیانی میز

پر رکھ لیں۔

فرمائیے۔

پیٹر نے بیدار بخت کی طرف منہ موڑ لیا۔

یہ لڑکی ہمارا قرار چھین کر لے گئی ہے۔

بیدار بخت واقعی مضطرب لگ رہے تھے۔

Sir..... کیسی بات کر رہے ہیں..... امریکہ برطانیہ میں تو ایسی

اضطرابیت اور بے چینی میں نے نہیں دیکھی۔ حسن تو وہاں بھی تھا۔

پیٹر تذبذب کے عالم میں بولا۔

معلوم نہیں پیٹر..... یوں احساس ہو رہا ہے..... جیسے ہم صدیوں

سے اس لڑکی کو جانتے ہیں..... ویسے اس لڑکے کے نقش و نگار جانے پہچانے

سے لگتے ہیں۔

پیٹر مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ عجیب سی بات محسوس ہو

رہی تھی۔

تم کیا سوچ رہے ہو۔



تھی اس کے سر پر۔ سر پھٹ گیا بیچارے کا..... وہ اللہ نے جان بچالی۔  
رامو نے کہا۔

لالہ کرم دین نے پٹی کی تھی..... بڑا سمجھدار حکیم ہے برادری کا۔  
سوہنی نے کہا۔

ہاں..... یہ پھٹ تو مل جاویں گے..... پر نشان رہ جاوے گا۔  
شمشیر نے جھگی کے اندر لگے ڈنڈے سے ٹیک لگالی۔  
وقت کے ساتھ پھٹ سارے ہی مل جاویں شمشیر..... اللہ کرم  
کرے گا۔

رامو نے کہا۔

نہیں چاچا کئی پھٹ ایسے ہویں مل بھی جاویں تو پیڑ رہ جاوے.....  
زخم کے اندر بار بار ہیسس انھیں۔  
شمشیر اٹھا۔

میرا بچہ کہاں چلا ہے۔

رامو نے کہا۔

چائے بناؤں چاچا..... سردی لگ رہی ہے۔  
شمشیر باہر نکل گیا۔  
اللہ تجھے خوش رکھے۔

جیراں ایک دم سے بولی۔

شمشیر..... مجھے بھی دینا چائے۔

سوہنی نے بلند آواز سے کہا۔

تو باہر آ جا..... ہوا تیز ہے..... تو آگ جلا میں دودھ پتی لاتا  
ہوں۔ وہ باہر سے ہی پکارا۔

ہاں جا میری دھی..... اس کے ساتھ مدد کرا۔

جیراں نے کہا۔

اور سوہنی باہر کی طرف چل دی۔

بھپ سے لالین گل ہو گئی۔

لو..... ہوا تو جھگی میں بھی گھس آئی۔

رامو نے کہا۔

تو اندر آ جا..... باہر ٹھنڈ ہو رہی ہے سوہنی۔

جیراں بولی۔

اماں..... مجھے یہ ہوا اچھی لگے..... اب تو لالین بھی سمجھ گئی۔

سوہنی باہر سے بولی۔

ارے آ جا..... آ جاوے گی تو روشنی ہو جاوے گی۔

شمشیر بولا۔

آ جاؤں گی..... اندھیرا اچھا نہیں لگے۔ باہر تاروں کی لو ہے۔

شمشیر اٹھ کر پاس چلا گیا۔

تو جانتی نہیں تیرے آنے سے اندھیرے میں لو ہو جاتی ہے۔

شمشیر بڑی محبت سے بولا۔

باتیں نا بنایا کر..... لالین کی بتی درست کر۔

سوہنی بولی۔

ہو جاوے گی بتی درست۔

شمشیر جھلا کر بولا۔

ہوا اب بھی تیز چل رہی تھی۔ شمشیر ایک دم جھنجھلا کر اٹھا اور بے

تکلفانہ انداز میں ہاتھ پکڑا۔

اٹھ..... سردی بڑھ رہی ہے..... بیمار نا پڑ جائیو۔

چلو۔

سوہنی اس کے ساتھ جھگی کے اندر اپنے بستر پر چل دی۔

چاچی..... چاچا خیرو کے چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔

شمشیر نے پوچھا۔

جیراں نے چادر ہٹائی..... چوٹ تو بہت آئی ہے..... چوب گری

کیا سوچ رہا ہے ..... چولہے کے پاس بیٹھا ہے۔  
وہ شمشیر کے پاس چلی گئی۔

میں کیا سوچوں گا۔

شمشیر نے خیالات کی پرچھائیوں میں بیدار بخت کو گھورتے ہوئے  
دیکھا ..... کیا یہ وہی بیدار بخت ہے ..... وہی ہے۔  
تو سوچ رہا ہے ..... میں سب جانوں۔

سوہنی نے شوخی سے کہا۔

شمشیر نے پتلی پتلی لکڑیاں درست کر کے چولہے میں رکھیں اور تیل  
کی بوتل اٹھا کر مٹی کا تیل ڈال دیا۔

سوہنی نے پانی ڈال کر دیکھی چولہے پر رکھ دی۔

اچھا اب بتا کیا سوچ رہا تھا ..... سچ بولنا ..... تیری زبان سے جھوٹ  
اچھا نہیں لگتا۔

ارے پاگل چھوری ..... میں نے کیا سوچنا ہے ..... جو بھی سوچوں  
تیرے لئے سوچوں۔

شمشیر سیدھا ہو کر بولا۔

نہیں ..... تو کچھ اور سوچ رہا تھا ..... قسم اللہ کی کبھی نہیں بولوں گی

ہاں۔

وہ بڑی دلربائی سے بولی۔

اور شمشیر ساری جان سے فریفتہ ہو گیا۔

میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب ہماری شادی ہوگی۔

کیا ..... شادی ..... ہماری ..... دونوں کی ..... نہ گھر ہے ناگھاٹ۔

وہ بڑی شریر ہنسی ہنس کر بولی۔

شمشیر بھی ہنس دیا۔

ہمارے پچھلوں کے کونے گھر ہیں ..... بس انہیں جھگیوں میں وقت  
گزر جاتا ہے۔

شمشیر نے پتی ڈالی۔

رہنے دو ..... یہ جھگیاں ..... مجھے تو اچھی نا لگیں۔ بارش برسے تو  
سر پر ٹپکے اور گرمی ہو تو دھوپ سے جھلس جائیں اور آندھی ..... دیکھا تم  
نے ..... ساری چوبیس اکھڑ جاتیں ہیں۔ اللہ توبہ۔

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

بیٹا ..... ایک پیالی اور ڈال لیو پانی۔

جیراں شرفو کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر بولی۔

اچھا اماں۔

سوہنی نے کہا۔

شرفو رامو کے بستر پر بیٹھ گیا۔

اللہ نے کرم کر دیا ..... چوٹ زیادہ نہیں آئی ..... بچ گیا خیرو۔

شرفو نے کہا۔

اللہ ماری ہوا بڑی تیز تھی بھایا۔

جیراں نے کہا۔

شمشیر اور سوہنی چائے لے آئے تھے۔

سوہنی نے پیالیاں سیدھی کر کے بڑی سی چنگیر میں رکھیں ..... شمشیر

چائے ڈالتا جاتا اور سوہنی سب کو تھماتی جاتی۔

نو چاچا ..... چائے پی لو۔

سوہنی نے پیالی شرفو کو تھمائی۔

چاچا۔

وہ شرفو سے بولی۔

چاچا خیرو اب کیسا ہے۔

شکر ہے بیٹی ..... بچ گیا ہے۔ آندھی بہت تیز تھی۔ جھگی کی ٹٹائیں

ڈٹ کر گریں اور چوب اس کے سر پر لگی۔ شرفو نے شراب سے ایک

گھونٹ حلق سے اتارا۔

پکے گھر بنا لو چاچا ..... نہ گریں نہ ٹوٹیں ..... اور تیز آندھی میں  
چوب بھی ناگرے۔

ہوں۔

رامو نے سیدھالیٹ کر کہا۔  
چاچا ..... تمہیں کس نے کہا تھا مٹی ڈھونے کو ..... میں کس لئے

ہوں۔

شمشیر ایک دم سے بولا۔  
سارے کام تو ہی کرے ..... ہم بس منجھی پہ بیٹھ کے روٹی توڑیں۔  
رامو ایک دم سے بولا۔  
کیوں ایسی باتاں سوچتا ہے ..... پوت ہے تیرا ..... دکھ سکھ کا سانجھا

ہے۔

جیراں نے پاس بیٹھے شمشیر کے شانے پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔  
ابا ..... میں لتاڑ دوں ..... ساری تھکاوٹ دور ہو جاوے گی۔  
سوہنی نے کہا۔

ہاں ٹھیک ہے ..... بیٹی باپ کو لتاڑ دے۔  
شرفو اٹھنے لگا۔

میں لتاڑ دیتا ہوں ..... تو ادھر ہو جا ..... تیرا وزن ہی کیا ہے۔  
شمشیر نے سوہنی کو ایک طرف کر دیا۔  
وہ ایک طرف رامو کے پاس بیٹھ گئی۔

اچھا رامو ..... میں چلا۔  
بیٹھ نا ..... روٹی کھا کے جانا۔

رامو نے کہا۔

نہیں جاتا ہوں ..... جھگی کی خبر لوں ..... سب کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا۔  
تو کیوں نہیں جھگی پکی بنوا لیتا۔

ایک زوردار ہنسی ہنس کر سوہنی نے کہا۔

رامو تیری چھوری پاگل ہے ..... بھلا جھگیاں بھی پکی ہویں۔  
وہ باہر نکل گیا۔

پکے گھر بنا لو چاچا ..... نہ گریں نہ ٹوٹیں ..... اور تیز آندھی میں  
چوب بھی ناگرے۔

سوہنی طنز "ہنس دی۔

شمشیر خاموش ایک کونے میں چائے پیتا رہا۔

جیراں کو غصہ آگیا۔

اپنی اوقات میں رہ چھوری ..... تیرے پچھلے پکے گھروں میں رہتے  
تھے کیا ..... جو تو خواب دیکھے پکے گھر کا۔

پچھلوں کو چھوڑ جیراں ..... تیری چھوری جھگی پسند نہ کرے۔

شرفو نے آخری گھونٹ حلق سے اتارا اور پیالی پاس ہی رکھ دی۔

اس کی کیا ہے بھائی ..... یہ تو روٹی بھی کئے ہوٹل میں کھاؤں .....  
گھر کی دال یہ تو پسند ہی نہ کرے۔

جیراں پھر ہاتھ نچا کر بولی۔

شمشیر نے چونک کر سوہنی کو دیکھا۔  
ہاں چاچا ..... جھگی مجھے اچھی نہ لگے ..... میں تو پکا گھر پسند کروں۔

سن رہے ہو ..... دھمی کی باتیں۔

جیراں رامو کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

شرفو محظوظ ہو رہا تھا اور شمشیر صرف سوہنی کو تنکے جا رہا تھا ....

سوہنی کی باتوں سے اس کا دماغ بھی گھوم گیا۔

سن رہا ہوں ..... بالڑی ہے ..... کرنے دے ..... خوش ہو جاو۔

گی گھڑی دو گھڑی۔

رامو کھانتا ہوا بولا اور حقے کی نے شرفو کی طرف بڑھا دی۔

طبیعت ٹھیک ہے تیری۔

شرفو نے پلٹ کرنے کو منہ میں رکھا اور رامو کو کھانتا دیکھ

بولا۔

ٹھیک ہوں ..... مٹی ڈھو ڈھو کر کر رکھنے لگی ہے ..... بڑھا جو ہو

جیراں نے کہا۔  
 اماں ..... شمشیر سے پوچھ ..... کیا ہوا ہے۔  
 وہ ہنستی ہوئی بولی۔  
 کیا ہوا ہے۔  
 جیراں نے کہا۔  
 شمشیر بھی ہنس دیا۔  
 بتانا کیا ہوا۔  
 سوہنی نے کہا۔  
 رامو خراٹے لے کر گھری نیند سو رہا تھا۔  
 بس چپ کر چاچا سو رہا ہے۔ نیند خراب ہوگی اس کی۔  
 نہیں نیند خراب ہوتی ..... تو بتادے نا۔  
 سوہنی نے اصرار کیا۔  
 چاچی ہونا کیا ہے ..... جھکی کے باہر کتے کا بچہ بیٹھا تھا ..... تاریکی میں  
 مجھے ایسا لگا جیسے چائے کا پیلا رکھا ہے ..... میں نے اٹھالیا تو پلا چوں چوں کرتا  
 میرے ہاتھوں سے نکل بھاگا۔  
 شمشیر بھی ہنسا اور سوہنی، یوں ہنس دی جیسے سفید چمکدار موتی سنگ  
 مرمر کے فرش پر بکھر گئے ہوں۔  
 جیراں ہنستی ہوئی لیٹ گئی۔  
 سو جاؤ اب ..... صبح کام پر جانا ہے۔

سوہنی لالین لئے شرفو کے ساتھ نکل گئی ..... اس کے ساتھ شمشیر  
 بھی اٹھ گیا۔  
 چھوڑی کی باتاں پر کان دھر لیا کر۔  
 جیراں نے کہا۔  
 میرا کان ہوتا ہے ..... میں سنتا ہوں ..... اونچے خیال رکھتی ہے  
 بیٹی۔  
 رامو نے کہا۔  
 یہ خیالات تنگ نہ کریں ..... ابھی سے چارا کر ..... وہ جھگیوں میں  
 جنگی ناگزارے گی۔  
 جیراں کو غصہ آگیا۔  
 تو لکیر کو ہی نا پیٹی جا ..... شمشیر پیسے جوڑ کے پکا گھر بنالے گا۔  
 رامو غصے سے بولا۔  
 بس تو خیال رکھنا بیٹی پر ..... مجھے اس کی باتاں پسند نہ آویں۔  
 جیراں پریشان ہو گئی۔  
 بال کی کھال نا اتار ..... آرام کر ..... سب مولا اچھی کر دے گا۔  
 رامو نے کروٹ لی۔  
 اور شمشیر کے ساتھ سوہنی جھکی میں داخل ہو گئی۔ شمشیر خاموش تھا  
 اور سوہنی ہنس رہی تھی۔  
 تیری بے وقت کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نا بھاوے۔  
 جیراں نے کہا۔  
 کیا کروں اماں۔ بات ہی ایسی ہے۔  
 وہ ہنستے ہوئے اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔  
 ہنسنے دے، چاچی ..... سوسن کو خوش رہنے دے۔  
 شمشیر نے کہا۔  
 کوئی بات ہو تب ہنسے کہ بس خواجواہ ہنستی جاوے پاگلوں کی طرح۔

دوست بھی بلکہ اب تو ہمیں تمہاری Custody (نگرانی) میں یہاں بھیجا گیا ہے۔

بیدار بخت نے سنہری بالوں کو ایک ہاتھ سے اوپر اٹھایا اور پھر چھوڑ

دیا۔

یہ اعزاز میرے لئے قابل فخر ہے سر۔

بیدار بخت مسکرا دیتے ہیں۔

اب میرے لئے کیا حکم ہے۔

پیٹر نے پھر کہا۔

حکم کو چھوڑو ..... میں نے پوچھا تھا کہ لاہور کا ٹور کیسا رہا۔

بیدار بخت نے میز پر سگریٹ سلگایا اور ایک طویل کش لیکہ دھواں

مرغلوں کی صورت میں چھوڑ دیا۔

لاہور کا ٹور بہت اچھا رہا سر ..... ہر جگہ کام چند دنوں میں ختم ہو

جائے گا۔

یہاں کراچی میں (Bridge) پل کے کام کو نینا ..... تنگ آگیا ہوں

اس کام سے۔

بیدار بخت جیسے تنگ لگ رہے ہوں۔

سر ..... غیر ملکی ٹیم آچکی ہے۔ جگہ جگہ دیکھ بھال ہو رہی ہے۔

تغیر کا کام تیزی سے ہو رہا ہے ..... (What is Matter) ..... کیا بات ہے

..... آپ پاکستان سے ..... یعنی کہ بوریت محسوس کر رہے ہیں۔

پیٹر چونک گیا۔

نہیں پاکستان ہماری شناخت ہے۔ ہم ہر جگہ اس کے حوالے سے ہی

پہچانے جاتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہم ایک زبردست پرابلم کا شکار ہو

چکے ہیں۔

بیدار بخت پریشان نظر آ رہے تھے۔

پرابلم ..... آپ کو کیا پرابلم ہو سکتا ہے ..... زندگی کی کوئی آسائش

(7)

پیٹر ..... کیسا رہا لاہور کا ٹور۔

بیدار بخت صوفے پر پہلو بدل کر بولے۔

چونک کر پیٹر نے آرائشی کلاک کو دیکھا پھر نظریں بیدار بخت

طرف مرکوز کر دیں۔

کیا بات ہے ..... آپ باہر نہیں نکلے بلکہ موسم کا بھی خیال نہ

کیا۔

پیٹر سنانے بیٹھ گیا۔

طبیعت کل سے کہیں بھی آنے جانے کو نہیں چاہ رہی ..... بس

تمہاری اچھی لگ رہی ہے۔

بیدار بخت مسکرا دیئے۔

خدا خیر کرے ..... ایسی حالت تو۔

وہ رک گیا۔

ہاں ہاں کہو ..... ایسی حالت تو دیوانوں کی ہوتی ہے ..... یہی

چاہتے ہو نا تم۔

بیدار بخت مسکرا دیئے۔

میں اس قدر بڑی گستاخی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

پیٹر مودب ہو گیا۔

تم کہہ سکتے ہو بھی ..... اس لئے کہ تم ہمارے مشیر بھی ہو

تھے۔ حق پرستی میں یہ عیسائی خاندان صف اول کے وفاداروں میں شمار ہوتا ہے۔ بانک کی ایک آہ پر جان کی قربانی لگانا ان کے لئے کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے۔

آپ کہئے تو سہی شاید مسئلے کا حل نکل آئے۔

پیٹر مودب بولا۔

پیٹر..... تم ہمارے دوست ہو..... تمہیں بتائے بغیر ہم کسی انجام تک نہیں پہنچ سکتے۔

بیدار بخت کھڑے ہو گئے۔

پیٹر صرف نظریں اٹھا کر دیکھتا رہ گیا۔

ایک لڑکی ہے۔

بیدار بخت واپس صوفے پر بیٹھ گئے۔

مرتی ہوگی آپ پر۔

ایک دم پیٹر ہنس دیا۔

ہم مرٹے ہیں..... اس کی سادگی اور معصومیت مار گئی ہے ہمیں۔

بیدار بخت بڑی الجھن میں گرفتار نظر آ رہے تھے۔

کون ہے وہ خوش نصیب..... جو اچھی لگنے لگی ہے آپ کو۔

پیٹر بے تکلفی سے بولا۔

وہ پوری آب و تاب کے ساتھ ہمارے دل میں جگہ بنا رہی ہے۔

بیدار بخت سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

پیٹر نے چونک کر دیکھا..... اور حیرت بھی ہوئی کہ ایسی کونسی چیز

ہے اس میں جو آپ کی توجہ کا مرکز ہے۔

وہ دل میں سوچ رہا تھا۔ یہ الفاظ زبان سے ادا کرنے کی جسارت

میں رکھتا تھا۔

پیٹر کیا سوچ رہے ہو۔

بیدار بخت نے کہا۔

نہیں ہے آپ کے پاس۔

پیٹر نے ایک دم کہا۔

صرف آسائش ہی پر اہلکار کا حل نہیں ہوتی میرے دوست۔

انہوں نے آخری جلتے ہوئے سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگایا۔

مت کیجئے اس قدر سگریٹ نوشی..... بیگم نور الدین نے

ہوئے کیا نصیحت کی تھی بلکہ آپ کے لئے مجھے ڈانٹ دیا تھا۔

پیٹر ہنس دیا۔

تو ٹھیک ہے نا..... واپسی پر بھی ماما سے ڈانٹ کھا لینا.....

تمہاری بات کا یقین ہی بہت کرتے ہیں۔

پیٹر مودب سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔

خداوند ہمیشہ میرے اعتماد کو بحال رکھے..... اور میں سیٹھ نورال

کی امیدوں پر پورا اتر سکوں۔

پیٹر نے محبت اور اپنائیت سے کہا۔

لیکن اب کیا ہوگا۔

بیدار بخت بولے۔

اب کیا ہوگا..... کیا کہہ رہے ہیں آپ..... وضاحت کیجئے سر۔

پیٹر تذبذب کے عالم میں کہنے لگا اور بڑی گہری نظروں سے

بخت کو دیکھنے لگا۔

پیٹر کے سانوے چہرے پر ذہانت و فطانت کے گہرے نقوش ابھ

ہوئے تھے۔ پیٹر غیر ملکی اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ جس کے آباؤ اجداد

بیدار خاندان سے ازلی تعلق تھا۔ ایک طرح کی موروثی ملازمت تھی۔

نسل در نسل وفاداری کے حوالے سے پیٹر کی صورت میں بیدار بخت

تھی۔ اس سے پہلے پیٹر کے والد اور اس کے دادا بھی سیٹھ نور الدین

سکریٹری رہ چکے تھے۔ اب بیدار بخت تک آتے آتے یہ منصب پیٹر

سنبھال لیا تھا۔ جبکہ ولایت میں پیٹر کے والد سیٹھ نور الدین کے دست

Sir ..... انگلش عورتیں کس قدر Like کرتی تھیں آپ کو لیا اور بیدار بخت مسکرائے۔  
 ابھی تک کتنے خطوط موصول ہوتے ہیں۔  
 پیٹر حیرت زدہ سا لگ رہا تھا۔  
 انگلش عورت میں وہ نہیں جو میں نے پاکستانی عورت میں دیکھی تھی۔  
 ہے۔  
 بیدار بخت فضا کو گھورتے ہوئے بولے۔  
 آپ نے درست فرمایا ..... پاکستانی عورت وفا کی پتلی ..... شوہر  
 ایک اشارے پر جان کی بازی لگانے والی ..... کتنی وفا ..... بلکہ وہ شوہر  
 پر تش کرتی ہے۔ پوجتی ہے۔  
 پیٹر نے تعریف میں دونوں جہان کے قلابے ملا دیے۔  
 تم درست کہہ رہے ہو ..... کم از کم میں ایسا اظہار نہیں کر رہے ہیں۔  
 تھا۔  
 وہ کھل کر مسکرائے۔  
 فون کی بیل بار بار ہو رہی تھی ..... ملازم اٹھا کر بیدار بخت  
 پاس لے آیا۔ بیدار بخت نے پیٹر کی طرف اشارہ کیا (جس کا مطلب تھا  
 پیٹر کو موبائل فون دو)۔ ملازم نے ریور پیٹر کو تھما دیا۔  
 آ رہا ہوں ..... جٹ کم انگ۔  
 پیٹر نے فون ملازم کو دوبارہ تھما دیا اور خود کھڑا ہو گیا۔  
 دلفریب فضا ہے باہر کی ..... لان میں نکل جائیے۔  
 پیٹر نے کہا۔  
 تم سائڈ کو دیکھ آؤ ..... جو لڑکی تمہیں اچھی لگے اس کا نام  
 لینا۔  
 یہ کیا بات ہوئی ..... میری اور آپ کی پسند فرق بھی ہو سکتی ہے۔  
 پیٹر ہنس دیا۔  
 میرا تو خیال ہے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بیدار بخت نے ٹھنڈا سا

اور پیٹر چند فائلیں اٹھائے گاڑی میں سوار روانہ ہو گیا۔  
 شام پانچ کا عمل تھا۔ مزدور قطار در قطار مزدوری ملنے کے انتظار  
 میں کھڑے تھے۔  
 آئے آئے جناب ..... یہاں تشریف رکھئے۔  
 منشی جی نے فوراً "ایک کرسی میز کے پاس رکھی۔  
 کام کہاں تک پہنچا منشی جی ..... غیر ملکی ٹیم مدد کر رہی ہے آپ کی۔  
 پیٹر نے کہا۔  
 بس جی چند دنوں میں اختتام ہو جائے گا ..... غیر ملکی ٹیم پوری طرح  
 ہماری مدد کر رہی ہے۔ ہمارے مزدوروں کو بھی بہتر کام کے مواقع حاصل ہو  
 رہے ہیں۔  
 منشی دوسری کرسی پر میز پر کھانا کھول کر بیٹھ گیا۔  
 Pay Time ہے۔  
 پیٹر نے کہا۔  
 جی ہاں ..... آج سات دن پورے ہو چکے ہیں بدھ کے بدھ  
 دہائی دیتے ہیں۔  
 منشی نے کہا۔  
 باباجی مزدوری لیں گے آپ۔  
 پیٹر نے ایک نہایت العربوڑھے کو بیٹھے دیکھا۔  
 ہاں جی۔  
 خدا بخش۔  
 آگیا سرکار۔  
 بوڑھا بڑی مشکلی سے اٹھتا ہوا منشی کے پاس پہنچا۔  
 باباجی کس کام پر ہیں آپ۔  
 سرکار پتھر ڈھونڈنے پر۔

شمشیر کی تنخواہ دے دو منشی جی۔

وہ اپنی رقم اوڑھنی کے پلو میں باندھنے لگی۔

کیوں دے دوں ..... شمشیر کام پر نہیں آیا کیا۔

منشی تڑپ کر بولا۔

وہ پلو کو ہونٹوں پر رکھ کر دل کش ہنسی ہنس دی۔

آپ نے خود ہی شمشیر کو پھٹے پر بھیجا ہے۔ یادیں کمزور ہو گئیں منشی

جی۔

اچھا اچھا ..... لے لو اس کی بھی تنخواہ۔

منشی کو یاد آگیا ..... نوٹ دے کر شمشیر کی جگہ پر بھی دستخط کروا

لئے اور انگوٹھا لگوا لیا۔

سلام صاحب۔

جاتے جاتے سوہنی نے سلام کیا اور واپس لوٹ گئی۔

پیٹر کو یوں محسوس ہوا جیسے اب یہاں بیٹھنے کا مقصد فوت ہو گیا ہے۔

جس مقصد کے لئے وہ آیا تھا اس مشن کو پورا کرنا تو فرض اولین تھا۔ اس

لئے تمام چیکنگ تک بیٹھا رہا۔ شام میلی ہونے تک تنخواہوں کا سلسلہ چلتا

رہا۔ ہر بار سوہنی نے نئے نئے روپ میں اس کی نگاہوں میں جلوہ گر ہوتی اور وہ

مدہوش ہو جاتا۔

کام ختم ہونے کے بعد وہ اٹھا چھوٹی چھوٹی رکاوٹیں دور کرتا .....

پیروں کی ٹھوکروں سے پتھر ہٹاتا پیٹر سڑک پر رکا جہاں اس کی گاڑی کھڑی

تھی۔ وہ ایک دم چونکا۔

سوہنی سڑک کے کنارے شمشیر کے ساتھ کھڑی تھی۔

وہ گاڑی کو شارٹ کر کے ان کے قریب ہی لے آیا۔

تم لوگ کیوں کھڑے ہو۔ پیٹر نے سوہنی کو دیکھا۔

شمشیر نے سوہنی کو پلٹ کر دیکھا۔

ہمیں بس کا انتظار ہے صاحب جی ..... ہماری سائیکل خراب ہے۔

بوڑھا رقم وصول کر کے انگوٹھا لگاتے ہوئے بولا۔

منشی جی ..... بابا جی کو پانی لگانے پر لگاؤ ..... آپ جانتے نہیں

مشکل کام اس بڑھاپے میں ہو سکتا ہے۔ پیٹر کو منشی کی سفاکی پر غصہ آگیا۔

پاپ سے پانی تو بچہ بھی دے سکتا ہے جناب۔

منشی بولا۔

تو پھر بابا جی کے قدموں سے زمین کھینچ لو ..... تاکہ ان کا زندہ

دو بھر ہو جائے۔

پیٹر نے غصے سے کہا۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے عالی جا ..... ہم تو حکم کے غلام ہیں .....

آپ کہیں گے وہی کریں گے۔

اگلا شخص بلاؤ۔ ہم کسی کی حق تلفی نہیں کرنا چاہتے۔ تم مالک ہیں

بجٹ کو نہیں جانتے۔ وہ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔

بہتر سرکار۔

منشی باری باری تمام مزدوروں کو تنخواہ دیتا رہا۔ پیٹر مطمئن اند

میں سب کچھ دیکھتا رہا۔

سوہنی۔

منشی نے آواز لگائی۔

آگئی منشی جی۔

وہ ہاتھ پونچھتی چوکر زیاں بھرتی پاس آگئی۔

سلام صاحب۔

دیکھتے ہی سوہنی نے پیٹر کو سلام کیا۔

پیٹر نے چونک کر سر ہلایا ..... وہ ایک لمحہ کے لئے سوہنی کی آنکھ

کے سحر میں اتر گیا۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے عارض اناری ہو رہے

تھے۔ آنکھوں کے عنبابی ڈورے اپنی رنگت تبدیل کر کے موسم کے ہم رنگ

ہو چکے تھے۔ ٹوک مرگاں کی تھر تھراہٹ جیسے کائنات اٹھائے ہوئے ہو۔



پیٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کے وجود کا مکمل احاطہ سوہنی کئے ہوئے تھی۔

اے خداوند ..... میں کہاں پھنس گیا ..... اس لڑکی کے تصور سے میری آنکھ سیرکیوں نہیں ہوتی۔

بے بس ہو کر پیٹر سیدھا ہو گیا۔  
سامنے سوہنی کو پھر جلوہ گر دیکھا۔

ملازم نے چائے رکھ دی۔

چائے حاضر ہے جناب۔

ٹھیک ہے تم جاؤ۔

پیٹر نے کہتے ہوئے گرم گرم چائے کی چسکی لی تو ذہن کو سکون نصیب ہوا۔

سوہنی نے اونچی آواز میں کہا۔

کہاں جانا ہے آپ لوگوں کو۔

ادھر جانا ہے صاحب جی ..... ادھر۔

وہ رک گئی۔

اوہو ..... وہ بڑی سی عمارت ہے ..... نور ..... نور محل۔

شمشیر بولا۔

میں سمجھ گیا ..... بیٹھو بیٹھو ..... اس میدان میں آپ۔

پیٹر کو یاد آگیا۔

ہاں جی ..... وہاں ہماری جھکیاں بھی ہیں۔

شمشیر کو ایک دم یاد آگیا۔

پیٹر نے دروازہ کھولا ..... دونوں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چند لمحوں میں گاڑی نور محل کی بڑی سڑک پر رک گئی۔

شمشیر اور سوہنی اترے۔

شکریہ صاحب۔

شمشیر نے کہا۔

ارے کوئی بات نہیں ..... میرا راستہ ہی یہی ہے۔

پیٹر نے گاڑی کا رخ موڑ لیا۔

رات کے سات بج رہے تھے۔

ملازم نے دروازہ کھولا۔

پیٹر اپنے کمرے میں ہی چلا گیا۔

لباس تبدیل کر کے ابھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ ملازم داخل ہوا۔

کھانا لگا دوں سرکار۔

نہیں ..... صرف چائے پیوں گا۔

بہتر جناب۔

ملازم واپس لوٹ گیا۔

دوسری صبح نور محل کی گھما گھمی شروع ہو چکی تھی۔ بیدار بخت وقت سے پہلے ہی اٹھ کر سیر کو جا چکے تھے۔ نور محل کے وسیع و عریض باغات اور دلکش پھولوں سے مزین لان ان کو بہتر تفریح مہیا کرتے تھے۔ کئی ایکٹر راضی پر پھیلا ہوا نور محل مالک کے ذوق سلیم کا ترجمان تھا۔ اس وقت صبح کے نو بج چکے تھے۔ بیدار بخت سیر سے واپسی پر غسل کرنے کے بعد پوری رات تازہ ڈانگ ہال میں تشریف لے جا چکے تھے۔ انواع اقسام کا ناشتہ ران ساختہ میز پر لگ چکا تھا۔ دست بستہ ملازم سامنے کھڑا تھا۔ بیدار بخت نے چائے بناتے ہوئے نظریں اٹھائیں۔ پیٹر کو موجود نہ پا کر انہوں نے ہاتھ ماکڑا ہوا اخبار ایک طرف رکھا۔  
پیٹر سو کر نہیں اٹھا۔

وہ ایک دم سوہنی کے تصور میں کھو گیا۔

وہ کون ہے؟

بیدار بخت ناشتہ بھول گئے۔

اس لڑکی کا نام سوہنی ہے۔

سوہنی ..... وہی سوہنی۔

بیدار بخت نے ایک دم جیسے اچھل کر کہا۔

جی ہاں ..... وہ یہاں کی لگتی ہی نہیں ..... اوپر کی مخلوق لگتی ہے۔

اچھا ..... ایک دم بیدار بخت نے زور دار قہقہہ لگایا اور ایک ہاتھ

پیٹر کے شانے پر رکھا۔

یہی لڑکی میرے حواس چھین کر لے گئی ہے پیٹر ..... یہی لڑکی۔

بیدار بخت نے آہستہ سے کہا۔

سوہنی۔

پیٹر حیرت سے جھکا۔

سوہنی ..... ہم اسے بھلا نہیں پا رہے ..... بہت یاد کرتے ہیں ہم۔

بیدار بخت نے خوشخوہ ہی دیواروں کو گھورا۔

کوئی سنگین مسئلہ مت بنائیے گا ..... بات کو ہمیں دفن کر دیجئے۔

پیٹر نے دیکھا کہ بیدار بخت سنجیدگی سے سوہنی کے بارے میں

سوچنے لگے تھے۔

مسئلہ تو سنگین بن چکا ہے ..... بلکہ وہ سادہ لڑکی ہماری نیندیں چرا کر

لے گئی ہے۔ ہم اسے بھول نہیں پا رہے۔

بیدار بخت نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

وہ جگیوں میں رہنے والوں کی لڑکی ہے اور ذات کی اوڈ ہے .....

یہ اوڈ بڑے ظام ہوتے ہیں ..... بات نہیں مانتے کسی کی۔

پیٹر نے بیدار کو خوف دلایا۔

ہمیں کسی سے کیا لینا دینا ..... ہمارا واسطہ صرف سوہنی سے ہے۔

رات دیر سے لوٹے تھے سرکار۔

قریب ہی بوڑھا خانساں مسکرایا۔

لیکن اب تو دس بجنے کو آ گئے ..... بلاؤ ان کو بھی ..... ہم

ناشتہ کیسے کریں۔

بیدار بخت نے کہا۔

Sorry Sir ..... ایک دم پیٹر کمرے میں داخل ہوا۔

پیٹر نے بیٹھتے ہی دیوار پر لگے کلاک کو دیکھا۔ دس بج گئے۔

تھک گئے ہو۔

بیدار بخت نے چائے کا کپ پیٹر کے سامنے رکھا۔

Thank you ..... پیٹر نے کپ کو ہونٹوں سے لگایا۔

بہت دیر خاموش ناشتہ کرتے رہے کہ اچانک بیدار بخت کو جیسے

یاد آگیا۔

کل تمام وقت سائڈ پر ہی رہے۔

جی صاحب ..... کام بہت جلد ختم ہو رہا ہے۔ وہی مزدور سزا

کام کرنے کو بھی تیار ہیں۔

پیٹر نے کہا۔

ٹھیک ہے لیکن اس قدر کام کرنے کے باوجود مزدوروں میں

کاشائے تو نہیں پایا گیا۔

بیدار بخت ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے بولے۔

بالکل نہیں سر ..... مزدور بڑے چاک و چوبند اور توانا ہیں۔

دیکھ کر مجھے بڑی خوش ہوئی۔

اس کا مطلب ہے کہ تم نے بہت انجوائے کیا۔

وہ کپ واپس رکھتے ہوئے بولے۔

بہت ہی انجوائے کیا میں نے ..... جس لڑکی سے میں متاثر

ایک Active اور باشعور لڑکی ہے۔

اب ایسا نہیں ہو سکتا ..... سوہنی اب ہمارے ساتھ چلے گی ..... بلکہ اس کے بغیر زندگی ممکن نہیں نظر آتی۔

بیدار بخت پویشان سے نظر آنے لگے۔  
سر ..... آپ بھلانے کی کوشش کیجئے ..... آپ کو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے ..... بلکہ سیٹھ افتخار کی بیٹی مس روبی ..... جسے بچپن سے آپ کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔  
پیٹر نے بہت کچھ یاد دلایا

یہ سب باتیں بعد کی ہیں پیٹر ..... اب تم سوہنی کو مجھ سے جدا نہیں کر سکتے۔

بیدار بخت سخت الفاظ میں بولے۔  
لیکن سر چند ماہ بعد بیگم صاحبہ اور سیٹھ صاحب بھی تو تشریف لانے والے ہیں۔

پیٹر نے کہا۔  
بیدار بخت اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔  
پیٹر نے ان کی پشت کو دیکھا ..... ان کے قدموں کی لغزش بتا رہی تھی کہ وہ کسی گہری سوچوں میں غرق ہیں اور ایسے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اب ان کے بس کی بات نہیں رہی۔

سوہنی کا کزن بھی کام کرتا ہے۔  
پیٹر نے کہا۔

میں جانتا ہوں ..... وہ شریف نوجوان ہے اور اکثر سوہنی کے ملا ہی رہتا ہے۔

وہ مسکرا کر بولے۔  
شمشیر نام ہے اس کا۔  
پیٹر بولا۔

اچھی چیز کے ساتھ ایک Gard (محافظ) تو ہونا چاہیے۔  
بیدار بخت شریر انداز میں بولے۔  
Very Good ..... آپ نے درست فرمایا۔  
ناشتہ کرو یا ر۔

بیدار بخت نے دیکھا وہ ناشتہ سے ہاتھ کھینچ چکا تھا۔  
گرم چائے لے آؤں سرکار۔  
خانساں قریب سے بولا۔

سب ٹھیک ہے ..... پیٹر نے اپنی چائے میں جھج ہلایا۔  
بیدار بخت گہری سوچوں میں متغرق نظر آ رہے تھے۔ چونک کر ہانپنے لگا۔  
نے دیکھا۔

آپ کہاں کھو گئے۔  
پیٹر نے کہا۔

میں اسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہوں ..... کسی طور بھی وہ سے جدا نہیں ہو رہی۔

بیدار بخت افسردہ نظر آ رہے تھے۔

ویسے چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے ..... آپ اپنے مرتبے وقار اور حیثیت کو دیکھئے گا۔ بہت بڑا خاندان ہے۔  
پیٹر نے کہا۔

کب ختم ہوا ..... بہت تھک گئی ہوں ..... ساری چھٹی کپڑوں میں  
خراب ہو گئی۔  
شمشیر نے کہا۔

ہاں چھٹی کپڑوں نے خراب کر دی ..... چاچا شرفو بھی دے گیا  
ہے۔  
وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

اچھا۔  
وہ آہستہ سے بولا۔  
کوئی بات ہے یا کوئی کام۔  
وہ چونک کر بولی ..... وہ شمشیر کے انداز سے جان لیتی تھی کہ اس  
کے دل میں کیا ہے۔

میرادل چاہتا تھا کہ آج ہم سیر کو جاتے۔  
شمشیر نے کہا۔  
سائیکل پر ..... وہ ایک دم بولی۔

اور گاڑی ہے ..... جب میرے پاس سائیکل ہے تو اسی پر جائیں  
گے۔  
شمشیر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

قسم اللہ کی گاڑی میں کتنا مزہ آتا ہے ..... دیکھا تھا اس دن وہ چھوٹا  
صاحب ہمیں چھوڑنے آیا تھا ..... وہی پیٹر بابو۔  
وہ بڑے مسرت بھرے انداز میں بولی۔

اچھا اچھا ..... جلدی سے کپڑے دھولے ..... پھر چلیں گے۔  
وہ بات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔  
مجھ سے نہیں ہوتا اب کام۔

وہ ایک پتھر سے اٹھ کر دوسرے پر بیٹھ گئی۔  
اے ہے .....  
سوہنی رانی نابن کام کر کام۔

(8)

زندگی کے سلگتے ساحل پر پلٹ کر دیکھتی تو چاروں جانب گھپ  
اندھیرے۔ طوفانی ہواؤں کا شور خزاں رسیدہ پتوں کی چڑچڑاہٹ، کڑکٹی  
بجلیوں اور بادلوں کی مہیب گرج کے سوا اور کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کا  
مستقبل کیا تھا۔ ماضی بھی اسی ریت اور گارے میں دفن نظر آتا تھا۔ جو کام  
اس کے آباؤ و اجداد کرتے آئے تھے۔ اس کی زندگی کیا تھی۔ ہوش  
سنہالنے سے اب تک اس کو مشقت کرتے دیکھا۔ اس کے والدین، شمشیر  
سب مٹی گارہ ہی ڈھوتے ہوئے نظر آئے۔ اس پر رہنے کو کپڑے کے  
چیتھڑے جوڑ کر ایک جھگی ..... رہنے کو مضبوط چھت بھی نہیں ..... ذرا  
آندھی چلے تو یہ چھت خس و خاشاک کے ساتھ ہواؤں کے دوش پر اڑتی  
چلی جائے۔

نہیں ..... نہیں ..... مجھے جھگیوں میں نہیں رہنا۔  
آخری چادر کو گھاس پر پھیلا کر وہ درخت کے نیچے پتھر پر بیٹھ گئی۔  
سوہنی۔

شمشیر نے دور سے آواز دی۔  
یہاں آ جا ..... ابھی کپڑے باقی ہیں دھونے والے۔  
وہ تھکی تھکی بیٹھی ہی بولی۔

ابھی کام ختم نہیں ہوا۔  
وہ پھلانکتا ہوا پاس آگیا۔

آتے آتے شمو نے کہا۔

اس نے شمشیر اور سوہنی کی باتیں سن لی تھیں۔

رانی بننا ہمارے مقدر میں کہاں۔

وہ مایوسانہ انداز میں شمشیر کی طرف دیکھ کر بولی۔

میرے لئے تو رانی ہی ہے۔

وہ پیار سے بولا۔

پر تو راجہ نہیں ہے ..... کہاں ہے تیرا محل ..... سنا ہے راجے محلوں

میں رہتے ہیں۔

وہ ہنس دی۔

شمشیر اسے دیکھتا رہ گیا ..... جس گھر میں تو رہے گی وہ محل سے کم

نہ ہوگا۔

شمو قریب آگئی۔

نہیں ہے تو تجھے محل بنوا دے گا۔

کہاں سے بنوا دے گا ..... دو وقت کی روٹی کے لئے سارا دن

مزدوری کرنا پڑتی ہے۔

سوہنی جل کر بولی۔

شمو ہنس دی۔

شمشیر خاموش اسے دیکھتا رہ گیا۔

ہائے اللہ سوہنی تو باتاں کیسی بڑی بڑی کرے ..... ہم نے تو کبھی

ایسی باتاں سوچی بھی نہیں ..... جو مل گیا سو کھالیا اور پہن لیا۔

شمو نے اپنے گھاس پر سے کپڑے اٹھائے اور ہنستی ہوئی چل دی۔

سوہنی۔

شمشیر نے پکارا۔

کیا ہے۔

وہ چونکی۔

تو آخر چاہوے کیا۔

شمشیر آج پوچھنا چاہتا تھا۔

تجو میں چاہوں وہ تو نا چاہے۔

تو محل چاؤے ..... نوکر چاؤے اور ایک راجہ ..... بس یہی ہے نا

تیری بات۔

شمشیر نے غصے سے کہا۔

ہاں ..... میں تو یہی چاہوں ..... عیش سے بھینا چاہوں۔

آنجل کو اپنی پشت پر گرا کر بولی۔

ہمارے نصیب میں تو ایسا جینا ہے۔ جب جھگی میں پیدا ہوئے تو جھگی

میں مرنا ہے۔

شمشیر بولا۔

شمشیر۔

وہ پھر بولی۔

ہاں

وہ نور محل ہے ..... اس میں بھی کوئی عورت رہتی ہوگی۔

سوہنی نے دور اشارہ کیا۔

اس میں کوئی عورت نہیں رہتی۔

شمشیر نے کہا۔

اکیلا صاحب ہی رہتا ہے۔

ہاں ..... پیٹر بھی ساتھ ہے۔ بڑے نوکر ہیں۔

کوئی تو عورت ہوگی ..... دنیا میں مالک بیدار اکیلا تو نہیں آگیا۔

وہ ایک ہی سانس میں بولی۔

پاگل چھوڑی ..... مالک کے سب گھر والے ولایت میں رہتے ہیں

..... یہاں تو وہ صرف کام کے لئے آیا ہے۔

شمشیر نے سب تلخی بھلا کر جھک کر بڑی چاہت سے اسے دیکھا۔

شمشیر۔

مجھے وہ بڑا اچھا لگے۔  
 تو جھگی میں رہنے والی ہے۔ جھگی سے پیار کر ..... نور محل سے تیرا  
 کیا واسطہ۔  
 شمشیر نے بڑے اضطراب سے کھڑے ہو کر کہا۔  
 کیوں نہیں واسطہ ..... بڑا صاحب بھی تو وہاں رہتا ہے۔  
 وہ ایک دم کہہ گئی۔  
 دیکھ سوہنی ایسے خواب نا دیکھ ..... منہ اٹھا کر چلے گی تو ٹھنڈا  
 کھاوے گی۔  
 ایسے خواب کیوں نا دیکھوں ..... پہرے بٹھا دے میرے خوابوں پر۔  
 وہ چلتے چلتے چلائی۔  
 ہوش کر ..... ہم زمین کے باسی ہیں ..... زمین پر رہیں گے ..... تو  
 آسمان کو چھونے کی کوشش نہ کر۔  
 اچھا سن شمشیر ..... ہم نور محل میں نوکری نا کر لیں ..... بڑی تنخوا  
 دے گا بڑا صاحب ..... اتنا امیر کبیر ہے وہ۔  
 وہ بھرپور مسرت بھرے انداز میں بولی۔ اس کی خوشی دبائے نادب  
 رہی تھی۔  
 کیسی باتاں کر رہی ہے ..... یہ تو نہیں ہو سکتا۔  
 وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 جا جا رہنے دے ..... تو خود گھٹ گھٹ کر مرنا چاوے۔ چھوٹی چھوٹی  
 ضرورتوں کے لئے ترسنا چاوے ..... تو عادی ہو گیا ہے بھک تنگ کا۔  
 وہ ایک جگہ ٹھوکر لگنے سے گرتے گرتے پئی۔  
 ایک دم شمشیر نے اس کو تھام لیا۔  
 دیکھ کے چل نا ..... اوپر دیکھ گی تو گر جائے گی۔  
 جھگی آ پچی تھی۔  
 اچھا ان باتوں کا ذکر اماں سے نہ کریو۔

سوہنی نے کہا۔  
 کیا ہے۔  
 شمشیر بولا۔  
 چلو پھر مالک کے پاس چلیں۔  
 وہ بڑی تمنا سے بولی۔  
 بغیر کام کے ہم جاتے اچھے نہیں لگتے ..... ہم جیسوں کو تو وہ ویسے  
 ہی گولی مار دے گا۔  
 شمشیر نے سوہنی کو ڈرانے کی کوشش کی۔  
 جانے دے ..... ایسے ہی گولی مار دے گا ..... ہم چور ہیں۔  
 سوہنی نے بڑی حسرت سے نور محل کے اونچے اونچے میناروں کو  
 دیکھا۔  
 اٹھ یہاں سے۔ اب ایک پل یہاں نہیں بیٹھنے دوں گا۔ تیرا دماغ  
 بہت خراب ہو گیا ہے۔  
 وہ سوہنی کا بازو کھینچ کر بولا۔  
 ارے واہ جھگی سے نور محل نظر نہیں آوے گا گیا۔  
 میں کب کہوں کہ نور محل نظر نہیں آوے گا ..... نور محل تو تیری  
 آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہے۔ جسے تو ہمیشہ دیکھتی رہے۔  
 اس کے لہجے میں بڑا کرب شامل تھا۔  
 پھر کیوں رو کے مجھے۔  
 وہ تن کر بولی۔  
 تجھے اچھی بری بات سے روکنا میرا فرض ہے کہ تو میری ہے .....  
 میں تجھے اپنی حد میں رکھنا چاہوں ..... باہر نکلے گی تو ماری جاوے گی ..... تو  
 بھولی بھالی لڑکی ۔۔۔ باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے ..... تو ناہی سمجھے۔  
 وہ آخر یہاں چلایا۔  
 مجھے تیرن باتاں نا سمجھ آویں ..... بس میں تو نور محل جانا چاہوں۔

سوہنی ماں سے ڈرتی بھی تھی۔  
کیوں کروں گا میں ..... بے فکر رہو ..... تیری منظوری کے بغیر کوئی  
بات کرتا ہوں بھلا۔

وہ جھگی میں داخل ہو گئی اور شمشیر دوسری طرف چل دیا۔  
شمشیر ..... کہاں جا رہا ہے۔  
جیراں نے کہا۔

چوپال میں بیٹھوں گا چاچی ..... ابھی آتا ہوں۔  
وہ جاتے جاتے بولا۔

اچھا اچھا ..... جا۔

وہ واپس جھگی میں آ گئی۔

اندر کنیراں بیٹھی تھی۔

چاچی سلام۔

سوہنی نے کھڑے کھڑے کہا۔

میری سوہنی ..... تو تو ہے ہی سوہنی ..... جس گھر میں جاوے گی  
چاندنی اتر آوے گی ..... کنیراں ایک دم اٹھی اور سوہنی کو گلے لگاتے ہوئے  
بولی۔

جیراں پاس بیٹھ کر ہنس دی۔

کنیراں نے سوہنی کو ساتھ لگا کر خوب بھیج بھیج کر پیار کیا۔

یہاں بیٹھ میرے پاس۔

اور سوہنی کو اپنے ساتھ ہی بیٹھا لیا۔

سوہنی جا ..... چاچی کے لئے گڑ والی اچھی سی چائے بنا۔

سوہنی اٹھی اور باہر نکل گئی۔

جیراں میں تو تیرے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔ دیکھنا انکار نہیں

کرنا۔

کنیراں نے آہستہ سے کہا۔

کو ..... میرے کرنے کا ہوا تو ضرور کروں گی۔  
جیراں مسکرا دی۔

میں سوہنی کے رشتے کے لئے آئی ہوں ..... دارا کے لئے۔  
دارا کے لئے۔

جیراں چونک گئی۔

ہاں دارا کے لئے ..... دارا بہت اچھا لڑکا ہے میرا ..... کھاتا بھی ہے  
اور روز اچھی اچھی چیزیں لاوے کھانے کے لئے۔

کنیراں نے روعب جمانا چاہا۔

یہ تو ٹھیک کہتی ہے ..... لیکن سوہنی کا رشتہ کرنا بہت مشکل ہے  
کنیراں۔

جیراں نے کہا۔

کیوں۔

کنیراں حیرت سے بولی۔

تمہیں معلوم تو ہے کہ سوہنی کی شادی جب بھی کروں شمشیر سے  
کروں ..... سوہنی شمشیر کی امانت ہے۔ بس تو منگ ہی سمجھ۔

جیراں نے صاف صاف کہہ دیا۔

میں اپنے بیٹے کا کیا کروں ..... جو رات دن میری جان کھاوے۔

وہ پریشان ہو گئی۔

جان تو قبیلے کے کئی لڑکے کھائیں ..... میں کیا کروں ..... شمشیر کے

ملاوہ میں اور رامو بالکل اس کی شادی کسی سے ناکریں۔

جیراں نے صاف صاف کہہ دیا۔

سوہنی چائے رکھ کر جا چکی تھی۔

لیکن کنیراں نے چائے نہیں پی یوں ہی اٹھ کر چلی گئی۔

چائے تو پی لو کنیراں۔

جیراں نے اصرار کیا۔

نہیں ..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کی بات پوری ہوتی! پتی بھی اور پلاتی بھی۔

کنیزاں افسردہ باہر نکل گئی۔  
اماں ..... میں کسی فقرے سے شادی نہیں کروں گی۔  
سوہنی ایک دم اندر آگئی۔

ہائے اللہ ..... تو اتنی منہ پھٹ ہو گئی ہے ..... شرم کر تو کیا کہہ رہے ہیں۔

جیراں پیالی رکھ کر کھڑی ہو گئی۔  
تیری شادی قبیلے میں ہی ہوگی ..... اور اپنے کے ساتھ۔  
وہ پھر بولی۔

میں نہ مانوں ..... قبیلے میں کون ہے جو مجھے بیاہے گا ..... سب لپٹے ہیں ہیں۔

سوہنی نے نفرت سے کہا۔  
باہر سے شہزادہ کون آوے گا تیرے لئے ..... تو ہوش میں تو ہے؟  
جیراں نے کہا۔  
میں ہوش میں ہوں۔  
وہ زور سے بولی۔

سوہنی ..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے ..... اپنی اوقات سے باہر نہ نکل  
جیراں غصے سے بولی۔  
کیا ہماری اوقات یہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی سوہنی نے زمین پر رکھی مٹی کی پیالی کو زور  
ٹھوکر ماری ..... جو لڑھکتی ہوئی کئی ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر خیمے کی دو  
دیوار سے ٹکرا کر باہر نکل گئی۔  
تو پاگل تو نہیں ہو گئی ..... آج تیرا باپ آئے ..... تجھے اس  
حوالے کروں گی۔

ہنسہ۔

پاؤں مارتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کیا ہو گیا چاچی ..... غصہ کیوں چڑھ گیا میری چاچی کو۔

شمشیر لہکتا لہکتا اندر داخل ہوا۔ جیراں کو دیکھ کر ایک دم ٹھنکا۔

ہونا کیا ہے ..... دارا کی ماں آئی تھی ..... آخر قبیلے کی عورت ہے  
آگئی تو کیا ہوا۔

جیراں نے سر پر پٹی باندھ لی۔

ہوا کیا۔ کس لئے آئی تھی۔

وہ پاس بیٹھ کر بولا۔

میں بتاؤں ..... کیا ہوا۔

وہ ایک دم اندر آتے ہوئے بولی۔

بتاؤ۔

شمشیر نے بوئے پیار سے سوہنی کی طرف دیکھا۔

دارا کی ماں۔

سوہنی آگے خاموش ہو گئی۔

کیا دارا کی ماں ..... کھل کر بات کرو۔

وہ آئی تھی ..... میرا رشتہ مانگنے۔

شمشیر ایک دم سے پوری جان سے لرز گیا ..... جیسے پوری کائنات  
اس کے سر پر آن گری ہو۔ اس کا ذہن پاش پاش ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گیا  
ہو۔

تجھے کیا ہوا میرے لعل۔

جیراں نے چونک کر کہا۔

چاچی ..... دارا تو بد معاش ہے ..... وہ اچھا انسان نہیں ہے۔

میرے بچے وہ اچھا بھی ہوتا تو میں کونسا سوہنی کی شادی اس سے  
کرنے لگی تھی۔ سوہنی تو بس تمہاری ہے تمہاری۔ میرے شمشیر کی ہے۔



جیراں نے سوہنی کو دیکھا۔ جو جھگی سے باہر جا چکی تھی۔  
 شمشیر کو جیسے ڈھارس ملی۔  
 جیراں نے بغور شمشیر کو دیکھا..... جو بیٹھا سوچ رہا تھا۔  
 شمشیر یہ سوہنی کی باتاں تیری سمجھ میں آویں۔  
 جیراں نے کہا۔  
 میری سمجھ میں سب باتاں آویں ہے چاچی..... پر میں۔  
 وہ چپ ہو گیا اور دروازے سے باہر ڈوبتے سورج کو دیکھ کر بولا۔  
 آگے بول کیا کہے۔  
 جیراں بولی۔  
 بس کچھ نہیں چاچی..... ڈوبتے سورج کو وقت شام دیکھ رہا ہوں۔  
 وہ اداس ہو گیا۔  
 سورج تو روز ہی ڈوبے..... تو آج کی بات کر..... سوہنی کی بات  
 پر غور کر۔  
 جیراں نے کہا۔  
 چاچی تو فکر کیوں کر رہی ہے..... سوہنی ابھی نا سمجھ ہے۔  
 وہ پرسکون انداز میں بولا۔  
 تو ہمیشہ ہی سوہنی کو نا سمجھ کہے..... وہ جو باتیں کرتی ہے..... اس  
 مطلب ضرور ہے۔ جیراں چیخ کر بولی۔  
 چاچی آہستہ بول..... دیواروں کے کان ہوتے ہیں..... اور یہ۔  
 یہ تو پھر بھی کمزور پھیتڑے ہیں..... جن سے باہر سانس بھی جاسکتی ہے۔  
 وہ جیراں کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔  
 مجھے تو خوف آنے لگا ہے شمشیر۔  
 جیراں نے کہا۔  
 مت گھبرا چاچی..... کچھ نہیں ہوگا..... سوہنی کی باتوں سے خوف  
 کھا..... وہ بیوقوف ہے..... ابھی اس میں بچپن ہے۔

شمشیر نے بڑی محنت کے بعد جیراں کے دل سے سارے خوف دور  
 کئے..... اس نے جھک کر دیکھا وہ چولے کے پاس خاموش بیٹھی تھی..... نہ  
 جانے کیا سوچے جا رہی تھی۔  
 سوہنی..... ادھر آ جا..... جھگی میں۔  
 شمشیر نے اندر سے آواز دی۔  
 تم دونوں جی بھر کے باتیں کر لو۔ چنگلی کر لو میری ہاں۔  
 وہ باہر سے ہی بولی۔  
 او ہو آ جاؤ نا..... تیری چنگلی کیوں کریں گے۔ وہ ہنسا۔  
 نہیں آؤں گی۔  
 وہ وہیں جم کر بیٹھی رہی۔  
 جا تو لے آ..... سردی بڑھ رہی ہے۔  
 جیراں نے شمشیر کو کہا۔  
 شمشیر اٹھا۔  
 اٹھ چل اندر  
 شمشیر نے سوہنی کا ہاتھ تھاما۔  
 تو اماں کا پیارا ہے..... تو ہی اماں کے پاس بیٹھ۔  
 وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی۔  
 شمشیر ہنس دیا اور اس کے بازو کو زور سے کھینچا۔  
 وہ ہنستی ہوئی اٹھی اور شمشیر کے ساتھ چل دی۔ شام سے گذر کر  
 وقت رات میں تبدیل ہو چکا تھا..... کھانا کھا کر سب لیٹ چکے تھے..... رامو  
 کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی..... اس لئے لیٹتے ہی سو گیا..... جیراں اپنے بستر پر  
 خاموش منہ لپیٹے پڑی تھی۔  
 شمشیر لیٹ گیا۔  
 سوہنی کی ہر کسی گئی بات اس کے جگر میں نشتر چھوٹی رہی..... وہ بار  
 بار مرتا رہا۔ بار بار زندہ ہوتا رہا۔ ہر بار نزع کا عالم جان لیوا ہوتا جیسے اس

کے جسم سے کھال اکھیڑ لے ..... وہ سبک اٹھا ..... لیکن اپنی سسکی کو ہونٹوں میں ہی دبا گیا۔ سوہنی اس کے لئے منبع حیات تھی ..... وہ سوہنی کے لئے چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کی ہر خوشی صرف سوہنی کے لئے تھی اور وہ بلبل پرواز کر رہی تھی۔ آسمانوں کو چھو رہی تھی ..... فرش میں رہ کر عرش کو چھو رہی تھی ..... زمین پر تو اس کے پاؤں نکلتے ہی نا تھے۔ وہ سکتے میں آگیا سوہنی کے خوابوں کی تکمیل کیسے ہوگی۔ اگر تکمیل نہ ہوئی تو سوہنی کھو نہ جائے۔ اگر سوہنی کھو گئی تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ کاش وہ دنیا کے میلے میں سوہنی کے ساتھ ساتھ چل سکے۔ کہیں دنیا کی بھیڑ میں ہم دونوں کھو نہ جائیں۔ وہ تمام شب سوچتا رہا ..... سوچیں اس کے مقدر میں شامل ہو چکی تھی۔ وہ سوچوں کی اتھا گھرائیوں میں ڈوبتا رہا۔ چاروں جانب گھپ اندھیرا تھا ..... وہ اپنے ارد گرد صرف سوہنی کا ہی ہیولہ دیکھ رہا تھا۔

(9)

تاریکی کے لب بستہ سائے پھیلنے لگے تھے۔  
فضا میں خنکی کی سرد لہر کی سرسراہٹ تیرنے لگی تھی۔ فضا کی ٹھسراہٹ، اشیانوں سے دور جانے والے پرندوں کو اپنے آشیانوں کی طرف لانے کی دعوت دے رہی تھی۔ اسی وجہ سے پرندے تھکے ہارے اپنے آشیانوں میں آچھپے تھے اور تاریکی کے شہ پاروں نے بازو پھیلا دیئے تھے۔ چاروں اور ایک گھپ اندھیرا تھا۔ کائنات نے جیسے گھنیر سیاہ چادر اوڑھ لی ہو۔ سوہنی چت لیٹ گئی تھی۔ میلا بوسیدہ سائیکہ اس نے کھینچ کر سینے پر رکھ لیا اور کٹیف سی چادر سے منہ ڈھانپ لیا۔ بیدار بخت اس کی نس نس میں اتر رہا تھا۔ سانس کے تار نور محل کی روشنیوں میں ہی تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو جھگی میں نہیں نور محل میں دیکھ رہی تھی۔ وہ رانی بننا چاہتی تھی۔ جہاں بیدار بخت راجہ اس کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہو۔ بیدار بخت پوری آب و تاب کے ساتھ اسی کی زندگی کو احاطہ کئے ہوئے تھے۔ وہ اس کی خوش گفتاری اور سلیقہ مندی پر مر مٹی تھی۔ محبت کی آگ میں جل کر وہ خاکستر ہو چکی تھی۔ ادھر بیدار بخت دوسری طرف بیدار بخت ..... وہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ شمشیر مجھے نور محل لے چلو ..... لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ لینے لینے اس نے ارد گرد دیکھا۔ جیراں رامو خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ رامو کے خزانے سارے ماحول کا سکوت درہم برہم کر رہے تھے۔ وہ آہستہ سے انہی ..... چاروں طرف دیکھا ..... آج وہ صاحب جی سے

چھوڑ ..... وہ زور سے بولی۔

نہیں چھوڑوں گا۔

چل ..... وہ اسے کھیٹا ہوا جھگی کے پاس لے گیا اور ہاتھ جوڑ کر

اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

دیکھ ..... تجھے خدا کا واسطہ ..... سارے قبیلے میں بدنامی ہو جاوے

گی ..... اس طرح نہ کر سوہنی ..... عزت رکھ لے ہم سب کی۔

وہ گڑ گڑانے لگا۔

دیکھ چاچا کی شرافت کو ..... نا لگا ..... قبیلے والے کیا کہیں گے۔

مجھے قبیلے کا کوئی ڈر نہیں ہے ..... جو میں چاہتی ہوں تم روک نہیں

سکتے۔

وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

سوہنی کے لہجے کی پختگی شمشیر کے اندر کی عمارت ہلا گئی۔ وہ ریزہ

ریزہ ہو گیا۔ میں کس امیدوں اور چاہتوں سے سوہنی کو پروان چڑھتے دیکھنا

چاہتا ہوں۔ میرے بدن میں گردش کرتے خون کی طرح ہے ..... اور یہ کیا کر

رہی ہے۔ وہ سوچوں کی سولی سے ایک دم اترا اور سوہنی کو گھسیٹ کر جھگی

کے اندر لے گیا۔

سو جا اب آرام سے ..... اب اٹھی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔

جیراں بیٹھی ہوئی تھی ..... اس نے اپنے آنسو صاف کئے اور سوہنی

سے بولی۔

لیٹ جا۔

وہ دردازے میں ہی بولا۔ چاچی تو جاگ رہی ہے۔

شش ..... ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اس نے رامو کی طرف اشارہ کیا

جو بخار سے تپ رہا تھا۔

سوہنی نے ایک نظر رامو پر ڈالی اور اپنے بستر پر چلی گئی۔

شمشیر بارے ہوئے جواری کی طرف جھگی کے دردازے پر بیٹھ گیا۔

ضرور ملے گی۔ دوسری طرف اس نے دیکھا شمشیر بھی سویا ہوا تھا۔ سوہنی نے آہستہ سے کروٹ لی اور بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا ٹھنڈی شاخیں شاخیں کرتی پاگل ہوا چل رہی تھی۔ شمشیر بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر دبے قدموں اٹھی اور جھگی سے باہر آ گئی۔ نور محل کی طرف جانے والا راستہ اس کو اپنی طرف کھینچے جا رہا تھا۔ وہ سب کو چھوڑ کر ادھر ہی چل دی۔

لیکن شمشیر ابھی بے بس نہیں ہوا تھا کہ غافل ہو کر سو جاتا۔ وہ دل میں محبت کے شعلے دبائے چلی جا رہی تھی کہ ایک دم اس کی چیخ نکلتے نکلتے ..... کسی طاقت نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا اور اپنی گرفت میں لے لیا۔ چل واپس ..... تو واقعی دیوانی ہو گئی ہے۔

شمشیر نے اسے بری طرح جھنجھوڑ دیا کہ اس کی نازک ہڈیاں ٹٹا اٹھیں۔ کہاں جاؤں۔

وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔

وہیں جھگی میں ..... جہاں کی تو ہے۔

وہ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

نہیں جاؤں گی جھگی میں ..... صاحب جی سے ملوں گی ..... ان کا کام کروں گی۔

وہ مطمئن انداز میں بولی۔

نوکرانی بنے گی۔

شمشیر نے کہا۔

ہاں ..... جھگی میں رہنے سے تو اچھا ہے۔

وہ اندر مصمم ارادہ رکھتی تھی۔

دیکھ ..... اگر میری نہیں تو چاچا کی عزت کا خیال کر لے ..... نہ

جھکا اس کا۔

وہ اسے کھینچتا ہوا بولا۔

رامو تو شمشیر کے ساتھ چلا گیا۔

جیراں پلٹ کر جھگی میں آئی۔

اب تو بھی اٹھ جا..... منہ دھو لے..... رات بھر جاگتی رہی ہے۔

جیراں نے طنز کیا۔

چونک کر سوہنی نے ماں کی طرف دیکھا..... سن لیا سارا کچھ۔

وہ دل میں سوچ کر رہ گئی۔

تو کیا سمجھے..... مجھے کچھ نہیں پتہ..... رات بھر جو تو نے اس چھو کرے کو ذلیل کیا۔

وہ غصے سے بولی۔

میں نے تو کچھ نہیں کہا تیرے چھو کرے کو۔

وہ آہستہ سے بولی۔

بس اب چپ کر جا..... ساتھ ساتھ جھگیوں میں بھنک بھی پڑ گئی نا..... ساری برادری تھو تھو کرے گی..... نکال دیویں قبیلے سے۔ کاش تو مر جاتی۔

جیراں دانت پیس کر آہستہ سے ہونٹ دبا کر بولی کہ آواز بھی باہر نہ جاوے۔

نکال دیویں گے برادری والے قبیلے سے..... تو جی نہ سکیں گے ہم..... روٹی نہ ملے گی۔ اب بھی محنت مزدوری کرتے ہیں..... تب بھی کریں گے۔

وہ اطمینان سے بولی۔

ہائیں..... جیراں نے خوفزدہ ہو کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔

یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ اپنی رسوائی سے خوف نہ آوے تجھے۔ تجھے عزت پیاری نا لاگے۔

جیراں پاس آگئی۔

کیسی رسوائی ماں..... غریب کی کوئی عزت نا ہوئے..... ہر کوئی

جیراں حیراں ششدر بیٹھی رہی..... اس کا سر گھوم رہا تھا۔

نیند تینوں سے کوسوں دور تھی۔ تینوں کے خیالات مختلف تھے جیراں قبیلے میں رسوائی کے خوف سے افسردہ تھی۔ رامو بے خبر تھا اور شہزاد اپنی برباد محبت پر ماتم کناں تھا اور سوہنی آزاد فضا میں سانس لینا چاہتی تھی اپنی زندگی سے جھگی پل سڑک اور مزدوری ختم کر دینا چاہتی تھی..... وہ را بن کر گھر میں بیٹھنا چاہتی تھی۔ اسے سک سک کر جینا اچھا نہیں لگتا تھا وہ جینا چاہتی تھی۔ اپنی ہر تشنہ تکمیل آرزو کو تکمیل کر کے۔ یہ بھی کوا زندگی ہے..... ایک اوڑھنی خریدنے کے لئے دو ہفتے مزدوری کرو۔

ایک آہ کے ساتھ سوہنی نے کروٹ لی اور پھر صبح اپنی تمام رعنا یوں کے ساتھ طلوع ہو گئی۔

چاچی..... اٹھا چاچا کو..... حکیم کے پاس لے جاؤں۔

شمشیر نے اپنے کاندھے پر رکھے رومال سے ہاتھ اور منہ صاف کیا ہاں لے جا بیٹا..... سارے سیاپے تیرے جو گے ہی ہیں..... اخیر کاباب تو ہی سرمایہ ہے۔ ہماری راہ کے کانٹے بھی بجھی کو ہٹانے ہیں۔ جیراں نے ٹھنڈی سانس بھری اور رامو کی طرف پلٹی۔

اٹھو نا..... شمشیر کے چاچا..... حکیم کے پاس..... دوائی لاؤ جا کر..... اتنے دن ہو گئے تپ کیوں نہیں اتر رہا۔

-رامو آہستہ سے جیراں کے سہارے اٹھا۔

ایک نظر سوہنی نے بھی دیکھا..... رامو بڑا کمزور ہو رہا تھا..... کاباب جل رہا تھا بخار میں..... ندامت سے اتنی ہمت نہ پڑی کے باپ کے پاس چلی جاوے۔ جیراں نے شاید سب کچھ سن لیا تھا۔ اس لئے اس کا منہ خراب تھا۔

چلو چاچا۔

شمشیر رامو کے پاس آیا۔ دونوں ہاتھوں سے اس کو محبت سے ہلاتا اور آہستہ آہستہ قبیلے کے حکیم کے پاس لے گیا۔

شمشیر..... ہیں تو بیٹھا ہے رے..... سوہنی کدھر ہے۔  
جیراں گھی والی روٹی اور اچار کی پھاگ چنگیر میں رکھے اس کے لئے  
لے آئی۔

باہر چاچا کے پاس ہے۔  
شمشیر نے کہا۔

تو کام پر نہیں جائے گا..... لے روٹی کھا لے۔  
جاؤں گا چاچی..... کام کے بغیر گزارہ تو نہیں ہے۔  
سوہنی جھگی میں آئی۔

کام پر نہیں جاتا۔ بیٹھا کیوں ہے۔ وہ آنچل سے چہرہ صاف کرتے  
بولی۔

جیراں باہر چلی گئی۔ پھر پلٹ کر آئی۔  
سوہنی تو بھی کھا لے..... رات بھی تو نے کچھ نہیں کھایا۔  
شمشیر نے چونک کر سوہنی کی طرف دیکھا۔  
ادھر آ جا میرے ساتھ کھا لے۔  
وہ شمشیر کے پاس بیٹھ گئی۔

شمشیر نے بغور سوہنی کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔  
میرا خیال ہے تو آج پل پر نا جاوے گا۔  
جیراں نے کہا۔

پل کا کام اب ختم ہو رہا ہے چاچی۔  
تو پھر کیا کریں گے۔ ایک دم جیراں بولی۔  
مزدوری کریں گی۔ اللہ واسطے کوئی روٹی نادے گا۔  
تو باتاں کیسی کرے ہے..... اٹھ پل پر۔

جیراں نے سوہنی کو دیکھا جو خاموش کھا رہی تھی اور شمشیر نے ایک  
لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔  
پل پر نہیں جاؤں گا۔

ٹھوکر مار کر گذر جاوے۔

وہ آہستہ سے بولی۔

ہوش میں رہ کر بات کر چھو کرے..... تو جس رستے پہ جاوے کانٹے  
ہی کانٹے ہوویں اس رستے پر..... کون تیرے کانٹے چنے گا۔  
جیراں نے پھر کہا۔  
مجھے اچھا لگے ہے یہ رستہ..... چاہے کانٹوں بھرا ہے۔  
سوہنی نے کہا۔

ابھی تجھے اس رستے میں تارے نظر آویں..... ککشاں لاگے تجھے  
..... تو انگاروں سے کھیل رہی ہے۔ یہی تارے انگارے بنیں گے تیرے  
رستے کے۔

جیراں نے ماتھا پکڑ لیا۔

میں جانوں میرا کام..... تو کیوں پریشان ہووے میرے لئے۔  
وہ غصے سے بولی۔

کیوں نا پریشان ہوں..... تو دھی ہے میری..... تجھے برباد ہوتا نہ  
دیکھ سکوں۔

جیراں نے باہر کی طرف دیکھا۔ رامو اور شمشیر آچکے تھے۔  
یہ لے چاچی..... تین پڑیاں ہیں۔ صبح شام اور رات کو۔  
شمشیر نے ایک لفافہ جیراں کو تھمایا۔

اور تو خیریت ہے نا..... بتایا نہیں حکیم جی نے..... آخر بخار کیوں  
نہیں اترتا۔

جیراں رامو کو پکڑ کر باہر لے گئی۔ دھوپ چڑھ رہی تھی۔ سوہنی  
نے چارپائی بچھائی اور اس پر چادر ڈالی اور رامو کو پکڑ کر لٹا دیا۔  
سردبا دوں ابا۔

سوہنی ایک طرف سردبانے بیٹھ گئی۔

جیراں چائے بنانے بیٹھ گئی اور شمشیر اندر چلا گیا۔

شمشیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
جھگڑا ہو گیا کسی کے ساتھ ..... جیراں نے حیران ہو کر دیکھا۔

نہیں چاچی ..... اپنا دامن بچانا چاہتا ہوں ..... شمشیر کہ لہجے میں دکھ  
ہی دکھ تھا۔

دامن بچانا چاہے ..... کوئی تیری عزت پر ہاتھ ڈالے۔  
جیراں نے دیکھا۔ درد و کرب کی گہری لکیریں شمشیر کے چہرے پر  
کھنڈ آئی تھیں۔ وہ شکستہ شکستہ سا لگ رہا تھا۔  
شمشیر نے سوہنی کو دیکھا جو باہر جا چکی تھی۔  
بات کیا ہے ..... تو مجھے پریشان لگے ..... تیرے اندر کچھ ہو رہا  
ہے۔

میرے اندر بہت کچھ ہو رہا ہے ..... اندر سے سارا ٹوٹ گیا ہوں  
میں ..... یہ ..... یہ جو میری کھال ہے ناکسی دن پھٹ جائیگی۔  
وہ ایک دم کھڑے ہو کر گرج کر بولا ..... اس کا رواں رواں لڑ  
رہا تھا۔

میں صدقے جاؤں ..... کون تجھے دکھ دیوے ..... میں کھون پی  
جاؤں اس کا۔

جیراں نے دانت پیسے۔  
خون ہی نہیں ناپی سکتا۔ کوئی میرے اندر زندگی بن کر گردش کرنا  
ہے ..... نہیں رہ سکتا اس کے بغیر۔

وہ مسکرایا اور جیراں کو ساتھ لگا لیا۔  
میری جند تیرے پر واری شمشیر علی ..... میں تیری چاچی ہی نہیں  
ماسی بھی ہوں ..... تیرا دکھ نہ دیکھا جاوے مجھ سے ..... اللہ تجھے جندگی دے  
جیراں نے آنکھیں صاف کیں۔  
دیکھا ..... اس لئے تجھے بات نہیں بتاتا جو تو چھوٹی چھوٹی باتوں سے  
بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ تیری پریشانی سے دل دکھتا ہے میرا۔

شمشیر نے اپنے رومال سے جیراں کی آنکھیں صاف کیں۔  
چلو شمشیر چلیں۔  
وہ اوڑھنی لپیٹے اندر آئی۔ بالکل سنجیدہ سی۔  
جاؤ ..... رب راکھا تمہارا۔  
جیراں نے دعا دی۔  
اور دونوں سڑک کی طرف چل دیئے۔  
سڑک پر سائیکل کھڑی کر کے سوہنی اس پر بیٹھ گئی اور سائیکل اپنی  
مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔

سوہنی تصورات کی دنیا میں کھوئی ہوئی بیدار بخت کے ساتھ مرشدیز  
پر خوبصورت گاڑی میں بہترین لباس زیب تن کئے بیٹھی تھی۔ بیدار بخت کا  
خوبصورت دلکش ساتھ سوہنی کو مدہوش کئے ہوئے تھا۔ گاڑی فرائے بھر رہی  
تھی۔ وہ خیالات میں ہی خیاباں ہوٹل میں بیدار بخت کے ساتھ ایرانی طرز  
آرائشی فرنیچر پر بیٹھی تھی۔ بیدار بخت کے ساتھ سوہنی نے چائے لے آیا تھا۔ بیدار  
بخت گھور رہے تھے۔ سوہنی کا حسن ان کی نس نس میں امرت گھول رہا تھا۔  
بیدار بخت نے چائے خود بنائی اور اس کو پیش کی۔

سوہنی مدہوش سی بیدار بخت کو دیکھتے دیکھتے کپ کی طرف ہاتھ  
دھاتی ہے لیکن ٹھک سے کپ میز پر گرتا ہے اور یوں خیالات اور حسین  
تصورات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔

شمشیر ..... یہ تم کہاں جا رہے ہو۔  
وہ چلتے چلتے سائیکل سے چھلانگ لگا کر اتری اور دور جاگری۔  
ایک جھٹکے سے وہ بھی گرتے گرتے بچا۔  
یہ کیا کر رہی ہو ..... اگر تمہاری ٹانگ ٹوٹ جاتی تو۔  
وہ لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آیا۔  
سوہنی بیٹھی ٹانگ پکڑے مسکرا کر شمشیر کو دیکھنے لگی۔  
تمہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

شمشیر نے ایک دم بریک لگائی ..... کیا کر رہی ہے ..... کیوں بے سکون کر رہی ہے۔

سوہنی کی آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

اچھا چل ..... بیٹھ جا ..... وہاں ہی چلیں گے جہاں تو کہے گی۔

وہ بار مان گیا ..... یوں جیسے جلتے دوزخ پر ٹھنڈے پانی کی تیز دھار ڈال دی ہو۔

وہ اچھل کر سائیکل پر بیٹھی ..... حسب معمول وہ پیڈل مارتا ہوا پل کی طرف بڑھ گیا۔

کام شروع ہو چکا تھا۔ سب مزدور اپنے اپنے تعین کردہ کام پر پہنچ چکے تھے۔ صرف سوہنی اور شمشیر کی جگہ ابھی خالی تھی۔

منشی نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔

منشی جی سلام ..... شمشیر نے کہا۔

اوائے تم علاقے کے ڈی سی ہو ..... اتنی دیر سے۔

منشی دور سے بولا۔

سوہنی نے گردن اٹھا کر منشی کو دیکھا۔

شمشیر نے مخصوص جگہ پر سائیکل کھڑی کی۔

اچھا اچھا .....

میرا مطلب ہے کہ تم تو پہلے کبھی لیٹ نہیں ہوئے۔

سوہنی کھڑی رہی۔

شمشیر نے دیکھا۔

راستے میں دیر ہو گئی منشی جی۔

چلو چلو کام پر ..... صاحب آج موجود ہیں۔

سوہنی ایک دم سے چوکی۔

شمشیر اپنی سمت بڑھ گیا اور سوہنی بھی لمبی چوٹی لہراتی کام کی طرف روانہ ہو گئی۔

سوہنی

وہ قریب بیٹھ کر اس کی ٹانگ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

نہیں ..... تمہیں تو چوٹ نہیں آئی۔

وہ شمشیر کے سارے اٹھ کر بولی۔

میری فکر نہ کرو ..... ایسی چوٹیں کھانے کا میں عادی ہوں۔

سوہنی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور سائیکل پر سوار ہو گئی۔

پھر سوہنی نے راستے کو بغور دیکھا۔

یہ تو کس راستے پر چل رہا ہے ..... ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

وہ پھر حیرت میں ڈوب گئی۔

کام پر اور کہاں۔

وہ پیڈل مارتے ہوئے بولا۔

لیکن یہ تو وہ سڑک نہیں ہے۔

سوہنی نے ارد گرد دیکھا۔

ہم پل پر نہیں جا رہے کہیں اور جا رہے ہیں۔

وہ تیز رفتاری سے سائیکل چلانے لگا۔

پل پر چل ..... میں کہیں اور کام نہیں کروں۔

وہ ٹانگیں پھینکے کو مار کر بولی۔

پاگل نہ بن مزدوری کرنا ہے ..... کہیں بھی کر لیں گے۔

وہ بولا۔

کہیں بھی نہیں ..... صرف پل پر ..... وہیں کروں گی مزدوری میں۔

وہ چیخ کر بولی۔

نہیں جانا وہاں ..... نہیں جاؤں گا وہاں ..... آرام سے بیٹھی رہ۔

وہ بھی زور سے چلایا۔

جان سے مار دے ..... مر جاؤں گی ..... لیکن کہیں اور کام نہیں

کروں گی۔

وہ پھر سائیکل سے اتر گئی۔

جلدی سے سوہنی نے سلام کر دیا۔  
 سوہنی ..... تم آؤ ..... آگے آ جاؤ۔  
 وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے ..... اخبار واپس میز پر رکھ دیا۔  
 آپ نے ہمیں بلایا تھا صاحب جی۔  
 وہ مدہوش سی مسکرا کر بولی۔  
 سوہنی آج اس قدر لیٹ پچنی ہو ..... کوئی پرابلم۔  
 وہ رسٹ واپس کو بغور دیکھ کر بولے۔  
 راستے میں دیر ہو گئی صاحب جی ..... کل سے ہم جلدی آ جائیں  
 گے سرکار ..... سائیکل ہے نا۔  
 وہ گلگیا سی گئی۔

وہ دوسری طرف منہ کر کے تھوڑا سا مسکرائے اور کن اکھیوں سے  
 سوہنی کو دیکھا۔ وہ اس وقت کسی رانی سے کم نظر نہ آ رہی تھی۔ سرخ گلابی  
 اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے سلا ہوا گھاگرا اور اس پر ویسی ہی قمیض اور  
 عنابی اوڑھنی ..... دارز چوٹی میں سنہری بال ..... وہ ایسا مدہوش کن حسن  
 دیکھ کر حیران رہ گئے ..... دلانقی حسن کیا ہے ..... پاکستان میں ایسا حسن ہے جو  
 ہوش اڑا دیتا ہے۔

وہ گہری سوچ میں کھو گئے۔  
 صاحب جی ..... بس یہی ہمارا قصور ہے۔  
 تم نے بہت بڑا قصور کیا ہے بلکہ بہت قصور وار۔  
 وہ بیٹھ گئے۔  
 جی ..... وہ دو قدم سرک کر آگے آ گئی۔  
 تم قصور وار ہو ..... تمہیں سزا ملے گی۔  
 وہ پھر اٹھے۔

صاحب جی معاف کر دیجئے ..... میں کل سے کام پر جلدی پہنچ جایا  
 کروں گی۔

اچانک کسی کی پکار پر اس نے تڑپ کر دیکھا۔  
 پیٹر بابو ..... آپ ..... کیوں بلایا مجھ کو۔  
 وہ قریب چلی گئی۔  
 تم سے صاحب ملنا پاتے ہیں۔  
 پیٹر نے کہا۔  
 کوئی غلطی ہو گئی ہم سے۔  
 وہ پریشان ہو گئی۔  
 یہ صاحب بتا سکیں گے ..... تم چلو۔  
 پیٹر دوسری طرف بڑھ گیا۔  
 اور وہ دبے قدموں خیمے کی طرف بڑھ گئی۔  
 آہستہ سے سوہنی نے پردا اٹھایا۔

بیدار بخت خوبصورت کرسی جس کی رنگت سفید تھی۔ ان کے  
 سامنے ویسا ہی سفید میز رکھا تھا۔ وہ آج کے تازہ اخبار سے لطف اندوز ہو  
 رہے تھے۔

سوہنی آہستہ سے اندر آئی۔  
 سیاہ قیمتی سوٹ میں ملبوس عظمت و وقار کی تصویر بیدار بخت بیٹھے  
 تھے ان کی گہری سمندر جیسی آنکھیں اخبار پر جمی ہوئی تھیں۔  
 وہ چند لمحے کھڑی رہی ..... پھر آہستہ سے بولی۔  
 آ جاؤں صاحب جی۔  
 وہ کانپ رہی تھی۔ بیدار بخت کے رعب و جلال سے وہ خوفزدہ  
 بھی ہو چکی تھی۔

صاحب جی آ جاؤں۔

وہ پھر بولی۔

ہوں۔

بیدار بخت نے گردن اٹھائی۔



بس صاحب تم سے چند باتیں کرنا چاہتے ہیں ..... آؤ۔  
وہ بڑے خلوص سے سوہنی کو ڈرائنگ روم کے دروازے تک لے گیا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا لیکن ریشمی دبیز پردے لہرا رہے تھے ..... اندر سے سبز روشنی چھن چھن کر رہی تھی اور انگلش دھن کی مدھر آواز سنائی دے رہی تھی۔

پیٹر بابو۔

وہ ہراساں ہو گئی۔

جلدی کرو ..... اندر چلی جاؤ ..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا ..... چلو شاباش۔

پیٹر نے تسلی دی۔

آپ۔

وہ پیٹر سے بولی۔

نہیں ..... ہم واپس جا رہے ہیں۔

پیٹر جلدی جلدی سیڑھیاں اتر گیا۔

سوہنی نے چند سیکنڈ دروازے پر لٹکے پردے کو دیکھا ..... پھر دل کڑا کر کے اندر قدم رکھا۔

ایک دم اس کی چیخ نکلتے نکلتے بچی۔

بیدار بخت پہلے سے موجود تھے۔

آپ۔

وہ اندر داخل ہو کر دیوار کے پاس کھڑے ہو کر بولی۔

آؤ ..... آؤ ..... سوہنی ..... گھبراؤ نہیں۔

وہ قریب آئے اور سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔

نہیں صاحب جی ..... آپ کھڑے ہیں اور ہم بیٹھے ..... ایسا تو ہم نہیں کر سکتے۔ وہ ایک دم سے گھڑی ہو گئی۔

نہیں ..... تمہیں کڑی سزا ملے گی۔

وہ صرف اتنا کہہ سکے۔

پیٹر اندر داخل ہوا۔

نگاہوں ہی نگاہوں میں بات ہوئی اور پیٹر نے پلٹ کر سوہنی کی طرف دیکھا۔

اتنی بڑی خطا ہو گئی ہے پیٹر بابو۔

سوہنی کے رخسار اناری ہو گئے۔

سوہنی تمہیں خطا کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

جی۔

سوہنی نے پیٹر کی طرف دیکھا۔

آؤ ..... میرے ساتھ۔

پیٹر نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

گاڑی میں بیٹھو ..... فوراً

وہ باہر نکلی ..... پیٹر بابو ..... شمشیر کے بغیر ہی۔

ہاں شمشیر کے بغیر ہی ..... ورنہ صاحب ناراض ہو جائیں گے۔

وہ تیز رفتاری سے پیٹر کے پیچھے پیچھے چل دی۔

بیٹھو۔

پیٹر نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

سوہنی خاموش لرزیدہ لرزیدہ بیٹھ گئی۔

گاڑی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی نور محل کے خفیہ راستے

ہوتی ہوئی پورچ میں آکر رکی۔

یہ کیا کر رہے ہیں پیٹر بابو ..... ہم اگر قصودار ہیں تو سزا اتنی بڑی

دیجئے گا۔

وہ باہر نکلتے ہوئے بولی۔

تم ڈرائنگ روم میں چلو ..... گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے

اچھا..... بیٹھو۔

وہ خود بھی بیٹھ گئے اور سوہنی کو پاس بٹھالیا۔

صاحب جی..... ہماری جگہ آپ کے قدموں میں ہے..... ہم آپ کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ارے سوہنی..... تم کیسی باتیں کر رہی ہو..... تمہیں کیا معلوم کہ تم نے کہاں جگہ بنالی ہے۔

وہ مضبوطی سے سوہنی کا شانہ تھام کر بولے۔

جی۔

وہ دم بخود سی بیٹھ گئی..... بیدار بخت کی باتوں سے اسے حیرت مچھلنے لگی تھی۔

وہ کچھ کچھ تو سمجھ چکی تھی۔

کہاں جگہ بنالی ہے صاحب جی۔

وہ آہستہ سے بولی۔

ہمارے دل میں..... جس دن سے ہم نے تمہیں دیکھا ہے..... ہماری نیندیں اڑ گئی ہیں۔ ہم تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

وہ سوہنی کے عارضوں کو بغور دیکھ کر بولے۔

ہم تو بچپن سے آپ کی پوجا کرتے آئے ہیں۔

بچپن سے..... یہ کیا کہہ رہی ہو۔

ہاں صاحب جی..... ایک بہت بڑا محل ہماری نظروں میں سایا رہا تھا اور اس کے بڑے دروازے سے آپ جیسا ایک لڑکا نکلتا جو ہمارے

کے اندر سا گیا تھا..... ہم نہیں بھلا سکے صاحب جی..... سارا بچپن یوں ہی دیا ہم نے۔

کس تم دریا والے بنگلے کی بات تو نہیں کر رہی۔ آج سے انہیں بیس سال پہلے ہم وہاں رہا کرتے تھے اور ایک لڑکی میرے ساتھ کھیلنے

تھی..... اس کے ساتھ ایک لڑکا ہوتا تھا..... وہ شمشیر تھا شاید۔

بیدار بخت بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔

ہاں جی ہاں..... شمشیر ہی ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے۔

Yes ہاں..... تم ہی وہ لڑکی ہو..... جس نے محبت کا زہر ہمارے

اندر اندیل دیا ہے..... ہم تمہیں چاہنے لگے ہیں سوہنی۔ تم ہماری محبت ہو۔

وہ سوہنی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولے۔

صاحب جی..... ہم آپ کی چاہت میں پاگل ہو گئے ہیں..... ہمیں

سوائے آپ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا..... اس بات سے روز ہمارا جھگڑا شمشیر سے ہوتا ہے۔

وہ سچ بولنے کی عادی جو تھی۔

وہ تمہیں منع کرتا ہو گا..... محبت کے نشیب و فراز سمجھاتا ہو گا۔

جی..... کیا۔

سوہنی نے کہا۔

کچھ نہیں..... شمشیر شریف آدمی ہے۔ لیکن اس بارے میں وہ تمہاری مخالفت ضرور کرے گا۔

کلاک نے دن کے دو بجادئیے۔

سوہنی نے درتپے کے پردے سرکا دیئے۔

دھوپ ڈھل گئی ہے صاحب جی۔ اب چلیں۔

وہ ایک دم سے پریشان صورت بنا کر بولی۔

کوئی بات نہیں..... چلے جائیں گے..... ایک مدت کے بعد تو تم سے ملنے کا موقع ملا ہے۔ وہ سوہنی کے دارز بالوں کو تکتے تکتے اس کی پشت کے قریب کھڑے ہو گئے۔

بیدار بخت کے جسم سے اٹھنے والی مست کر دینے والی مہک اس کی روح میں اتر گئی۔ محبت و چاہت کا ایک سمندر ٹھانیں مار رہا تھا..... وہ اس

دیکھ لینا۔

بیدار بخت نے ہاتھ سے بالوں کو درست کیا۔  
چلیں صاحب جی۔

ٹھیک ہے ..... جی تو نہیں چاہتا ..... اب تم کہتی ہو تو چلتے ہیں۔  
دونوں ایک ساتھ باہر آ گئے۔  
ایک لمحے میں گاڑی سڑک پر رکی۔

یہاں ہی اتر جاؤں گی ..... کوئی دیکھ نہ لے۔  
وہ سنبھلتی ہوئی اتری اور بیدار بخت ہنس دیئے۔  
اور وہ گاڑی دوسری طرف گھما کر لے گئے اور سوہنی پچتی بچاتی  
اپنے کام پر پہنچ گئی۔

شام کے پانچ بجتے کو آئے تھے ..... سب اپنے اپنے کام میں مشغول  
تھے ..... کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ  
گئی۔

ارے سوہنی ..... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ..... شاید تو نے کام  
نہیں کیا۔

ایک مزدور بازو جھاڑتے ہوئے اس کے پاس کھڑے ہو کر بولا۔  
ہاں بھائی ..... آج بخار ہوئے ..... کام ناکر سکوں میں ..... اسی لئے  
ڈیٹھی ہوں۔

وہ آہستہ سے بولی۔  
شمشیر بھی صبح سے نظر نہیں آوے۔  
اشرف جاتے جاتے بولا۔  
شمشیر کہاں چلا گیا۔

وہ دور تک نظر دوڑاتے ہوئے بون ..... اور دل میں ہزار بار شکر  
لیا کہ شمشیر بھی نہیں ہے اور اس کی عدم موجودگی کا کسی کو احساس بھی  
نہیں ہوا۔

سمندر کی گہرائی سے واقف نہ تھی ..... بس وہ اپنے آپ کو خوش نصیب  
تصور کر رہی تھی۔

بیدار بخت نے پشت کی جانب سے سوہنی کے نازک شانوں پر اپنے  
ہاتھ رکھے ..... بے بس ہو کر سوہنی نے آنکھیں موند لیں ..... وہ ایک لمحے  
میں سب کچھ نچھاور کر چکی تھی۔ یہ لمحے اس کی ساری زندگی پر محیط تھے۔  
بیدار بخت اس کے بخت میں شامل ہو چکے تھے۔

دیکھو سوہنی ..... ہم تمہیں بھول نہیں پائیں گے۔  
ہم چھوٹی سی دنیا کے باسی ہیں صاحب جی ..... آپ کی دنیا میں قدم  
رکھا تو یوں لگا جیسے یہ دنیا جنت میں بدل گئی ہو ..... ہم آپ کے بغیر جی  
سکیں گے صاحب جی۔

وہ پلٹ کر بیدار بخت کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔  
اپنی دنیا کو بھول جاؤ سوہنی ..... ہم تمہیں اپنی دنیا میں لے جائیں  
گے۔

انہیں آج سوہنی حد سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ اپنی مثال  
اپنے مرتبے جاہ و جلال کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔  
صاحب جی۔

وہ آہستہ سے بولی۔  
کو۔  
وہ نظریں جھکا کر بولے۔

کام پر چلیں ..... شمشیر بہت ناراض ہو گا۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو۔  
وہ خوفزدہ ہو گئی۔

نہیں ناراض ہوتا ..... بلکہ اسے علم بھی نہیں ہو گا۔  
وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے کے قریب لے گئے۔  
علم نہیں ہو گا ..... وہ کیسے؟

وہ حیرت و استعجاب کے عالم میں اوڑھنی درست کرنے لگی۔

مجھے پیٹر بابو سویرے ہی شہر لے گئے تھے۔ بس ان کے ساتھ ہی پھرتا رہا۔ پیٹر بابو کو سائڈ پر اپنے ساتھ ایک آدمی کی ضرورت رہتی ہے۔ پیٹر بابو نے مجھے ہی چن لیا۔ شمشیر کے انداز میں تقاضا کی چمک تھی۔ اچھا..... پھر تو تو صاحب بن گیا..... تنخواہ بھی دیں گے پیٹر بابو۔ وہ کہتے کہتے ایک دم سے چپ ہو گئی۔ اور کیا..... تنخواہ ملے گی..... پھر دیکھنا خوب عیش کرواؤں گا تمہیں۔

وہ مسرت کے بھرے اظہار کے لئے سائیکل پر کھڑے کھڑے ہی بیٹھ گیا۔ سوہنی اس کے پیچھے کیرئیر پر بیٹھ گئی۔ دوسرے دن وقت سے پہلے ہی دونوں کام پر پہنچ گئے۔ شمشیر تو پیٹر کی گاڑی صاف کرنے چل دیا اور سوہنی اپنے کام پر پہنچ گئی۔ سوہنی..... اچانک پیٹر کا گذر ہوا۔

جی پیٹر بابو۔ سوہنی اینٹیں اٹھانے کے لئے جھکی ہی تھی۔ تم آج سے اینٹیں نہیں اٹھاؤ گی۔ پیٹر نے کہا۔ جی..... اینٹیں نا اٹھاؤں گی..... تو اور کیا کروں۔ وہ حیران ہو کر بولی۔

تم صرف مزدوروں کی نگرانی کرو گی۔ پیٹر نے کہا۔

نگرانی کروں گی..... میں افسری کروں گی..... پیٹر بابو۔ وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔

ہاں..... تم افسری کرو گی..... صاحب کا یہی حکم ہے۔ اچھا جی..... پیٹر بابو..... اللہ صاحب کو سلامت رکھے..... کتنا خیال

ہے ان کو بیمار۔ وہ محبت میں سرشار ہو گئی۔ سوہنی نے ہاتھ اٹھایا۔

گھنٹی بج گئی۔

سب مزدور کام چھوڑ کر چھٹی کرنے لگے۔ شمشیر نے اسے پکارا۔

سوہنی۔

میں یہاں ہوں شمشیر..... برگد کے نیچے۔ وہ وہیں سے بولی۔

ہیں تو نے کام نہیں کیا۔

وہ اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ کو چمکتا دیکھ کر بولا۔

ٹانگ بڑی درد کرے..... پیٹر بابو ادھر آئے تھے صبح..... کہنے لگے بیٹھ جا کام نہ کر..... لیکن تو کہاں تھا۔

میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا..... تو سائیکل سے پھلانگیں مارنا چھوڑ دے..... آج تیری ٹانگ میں درد ہے۔ کل تڑوا کے بیٹھ جاوے گی۔

وہ بڑی ہی پریشانی میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

وہ ہنسنے لگی..... تو ایسے ہی پریشان ہو جاوے..... چل گھر..... انہیں نہیں جاوے۔

اٹھا کے لے چلوں۔

وہ اٹھانے کے لئے جھکا۔

وہ ہنس دی۔

اب تو تلاش ہی اٹھاوے گا تو۔

مذاق کے موڈ میں تھی۔

کیا بکواس کر رہی ہے..... تیرے ساتھ تو میری زندگی ہے۔ تیرے بعد جی لوں گا..... تو ہی میرے اندر سانس کی طرح چل رہی ہے۔

وہ مسکراتی ہوئی اس کے ساتھ ہی باہر آ گئی۔

تو کہاں چلا گیا تھا۔

سوہنی نے کہا۔

پنیر آگے بڑھ گیا۔  
 اور سوہنی نگرانی پر چل دی۔  
 علی بخش .... چھوڑ سگریٹ ..... نہیں پینے دوں گی ہاں۔  
 ایک دم ایک جگہ بیٹھے ہوئے نوجوان علی بخش کے منہ سے سگریٹ  
 نوج کر اس نے اپنے قدموں تلے مسل دیا۔  
 تجھے کیا .... سگریٹ میں پی رہا ہوں ..... تجھے کیوں دکھ ہو رہا ہے۔  
 علی بخش کو غصہ آگیا۔  
 تو میرا بھائی ہے ..... اس لئے میں تمہیں تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی  
 ..... پھر تیرے چھوٹے چھوٹے بچے بھی تو ہیں۔  
 وہ پاس جا کر نصیحت بھرے انداز میں بولی۔  
 پاگل تو نہیں ہو گئی ..... بچوں کا سگریٹ سے کیا واسطہ۔  
 علی بخش حیران ہو کر بولا۔  
 کیوں نہیں واسطہ ..... بڑا گرا واسطہ ہے ..... تمہیں پتا بھی ہے۔  
 وہ تیز آواز میں بولی۔  
 جا ..... بڑی آئی ڈاکٹرنی۔  
 تو سمجھتا کیوں نہیں ..... سگریٹ پینے سے آدمی کے مھینڈے کمزور  
 ہو جاتے ہیں۔ سانس نہیں آتا۔  
 وہ ہمدردی کرنے لگی۔  
 اچھا اچھا نہیں بیٹا۔  
 علی بخش کھانے لگا۔  
 دیکھا ..... اسے ..... کھانسی لگ گئی نا تجھے۔  
 وہ ایک دم دیکھ کر بولی۔  
 سوہنی ..... تو نے آج کام نہیں کیا۔  
 یہ افسری کرے گی منشی جی۔  
 علی بخش نے کہا۔

افسری ..... کیا کہہ رہا ہے تو ..... ہم جو صبح سے شام تک منشی  
 پھاٹکتے ہیں۔ ایسے ہی۔  
 سوہنی ہنس دی اور منشی جل کر راکھ ہو گیا۔  
 ہاں منشی جی پیٹر بابو نے سوہنی کو ہماری نگرانی کے لئے لگا دیا ہے۔  
 علی بخش نے کہا۔  
 سوہنی ہنس دی۔  
 ہنہ ..... قسمت کی بات ہے۔  
 منشی کہتا ہوا آگے چل دیا۔

وہ بولی۔

ارے کیا دال میں کالا ہو گا..... بس یوں ہی پل بھر کو اچھی لگی۔  
دوسری نے سامنے دیکھا وہ لہکتی لہکتی چلی آ رہی تھی۔  
جانو..... تیرا بیٹا روئے تھا..... میں نے اس کو ہلکے دے دیا۔  
سوہنی نے پاس آ کر کہا۔

ہیں میں مری۔ میرا بیٹا روئے تھا..... بیٹی کہاں ہے میری..... پاس  
بیٹھی تھی اس کے۔ جانو گھبرا کر بولی۔

وہ پانی پینے لگی تھی..... پر تو گھبرانہ..... اب وہ خوش ہے۔ تیری  
بیٹی اس کے ساتھ کھیل رہی ہے۔  
سوہنی آگے بڑھ گئی۔  
ہے بڑی اچھی..... بچوں کا بڑا ہی کھیل کرے۔  
جانو نے کہا۔

ہاں ہے تو اچھی۔

گھنٹی کی آواز آئی اور تمام مزدور اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے  
..... وہ اوڑھنی کو درست کئے دوسری طرف چل دی۔ وہ بہت خوش تھی۔  
سارا دن نگرانی کرتی اور مفت کی مزدوری لے کر شمشیر کے ساتھ گھر روانہ  
ہو جاتی۔ جیراں شمشیر اور سوہنی کی تنخواہ سے خوش تو بہت تھی لیکن کبھی کبھی  
وہ خائف ضرور ہو جاتی تھی۔ وہ اب شمشیر اور سوہنی کے لئے پریشان رہنے  
لگی تھی۔ آج کافی دنوں کے بعد رامو کی طبیعت ٹھیک تھی تو اس نے کہا۔

سوہنی کے ابا..... ایک بات کہوں۔

رامو ذرا سا کھانا..... ہاں کہو۔

میرا تو جی کرے کہ اب سوہنی اور شمشیر کی شادی کر دیں۔

اپنی بیٹی اپنا بیٹا۔

جیراں خوش ہو رہی تھی۔

یہ بات میرے دل کو بھی لگی ہے..... کونسا روپیہ لگے گا..... نکاح

(10)

محبت فطرت کا ایک بہت بڑا مذاق ہے۔ آدمی شباب کی سرحدوں پر  
قدم رکھتا ہے تو ایک چیونٹی بھی ہاتھی نظر آتی ہے اور عام نوجوان جسے چاہت  
کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ شہزادہ لیکن وہ واقعی شہزادے کے من میں رہا  
بس گئی۔ رانی بن گئی تھی۔ بیدار بخت دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔  
کھانے کا وقفہ ہو گیا۔

ایک مزدور عورت دوسری عورت کے پاس بیٹھ گئی۔

شمشیر اور سوہنی پاس سے گزرے۔

مالک نے اس کو ہماری نگرانی کے لئے رکھ دیا۔

ایک عورت بولی۔

ہاں..... بندہ کوئی نا ملا..... سوہنی کے علاوہ نگرانی کوئی نہیں

کر سکتا۔

دوسری نے کہا۔

دیکھ لے..... بھاگنی صاحب جی کے من کو۔

پہلی نے کہا۔

اے نہیں بھائیوں گئی..... بس دو وقت کو اچھی لگی اور افسر

دے دی۔ پہلی عورت نے آخری گھونٹ جو اس کے پیالے میں بچ گیا تھا

مٹی پر پھینکا اور پیالہ پاس رکھ لیا۔

میں تو جانوں کوئی بات ہے۔ وال میں کالا ہے۔

کرو۔

رامو بہت خوش ہو کر بولا۔

بس پھر ٹھیک ہے ..... پہلے سوہنی سے پوچھ لوں۔

جیراں نے کہا۔

پوچھ لوں ..... کیا ضرورت ہے پوچھنے کی۔

رامو اٹھتا ہوا بولا۔

پھر بھی ..... جوان اولاد سے پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔

جیراں بات بدل کر بولی ..... وہ رامو سے کھل کر بات بھی نہیں کرتا

چاہتی تھی۔

تمہارا خیال ہے کہ شمشیر سے وہ راضی نہیں ہے۔

یہ بات نہیں ہے ..... جیراں تو جانتی تھی سوہنی کے حالات کیسے

ہیں۔

لیکن پھر بھی دوسرے اندیشے اس کا جگر چاٹ رہے تھے۔

یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ دونوں اکٹھے پل کر جوان ہوئے ہیں .....

ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں ..... پھر انکار کی وجہ۔

رامو نے سیدھا جواب دیا اور دیوار سے ٹیک لگائی۔

تھی۔ کہ سائیکل کھٹ سے ان کے پاس رکا۔

رامو نے خوش خوش بیٹی کی طرف دیکھا ..... جو انتہائی پرسکون اور

مطمئن نظر آ رہی تھی۔

شمشیر نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور نلکے کی طرف بڑھ گیا۔

چائے پی لے شمشیر۔

جیراں نے کہا۔

آ رہا ہوں چاچی ..... ہاتھ دھو لوں۔ گریس لگ گئی ہے۔

وہ جاتا جاتا بولا۔

گریس ..... وہاں گریس کا کونسا کام ہے۔

رامو نے کہا۔

ابا شمشیر اب پیٹر بابو کی موٹر صاف کرتا ہے ..... مزدوری نہیں کرتا

اور رہتا پیٹر بابو کے ساتھ ہی ہے۔

سوہنی نے کھڑے ہو کر اوڑھنی بھاڑی۔

تو اب اینٹیں اٹھانے کا کام نہیں کرتی۔

جیراں نے پرسکون اور سنجیدگی سے کہا۔

ہاں اماں ..... مجھے تو پیٹر بابو نے نگرانی پر لگا دیا۔

سوہنی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

اے سوہنی۔

جیراں نے ارد گرد دیکھ کر کہا۔

کیا بات ہے اماں۔

وہ پاس آ گئی۔

تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔

جیراں نے آہستہ سے کہا۔

مجھ سے ..... باتیں شمشیر سے کرتی ہے تو ..... میرے ساتھ کیسے

کرے گی۔

شام ملجی سی ہونے لگی تھی۔ آفتاب کا سنہری تھرکتا ہوا گولہ

سسکیاں لے رہا تھا۔ آخری سانس سورج نے مغرب کی گود میں لیا اور

چاروں جانب شام میلی میلی سی لگنے لگی۔ چراغ جل اٹھے تھے۔ سارے دن

کے تھکے ہارے پیچھے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف اڑنے لگے تھے۔ رامو

باہر ہی چارپائی پر بیٹھا تھا اور جیراں نے چائے کی دیگچی ایک طرف رکھ دیا

بری بات کہی ہے میں نے ..... شمشیر سے اچھا بر کوئی ٹاہی ملے گا  
..... وہ لاکھوں میں ایک ہے۔ جیراں ایک دم سے بولی۔  
لاکھوں میں ایک تو ہے ..... لیکن۔

وہ آہستہ سے بولی۔

پھر کیا بات ہے .....

جیراں کھڑی ہو گئی۔

بہت بڑی بات ہے ..... نہ اس کا کوئی گھر ہے اور نہ کوئی ٹھکانہ۔  
سوہنی نے کہا۔

تیرے باپ کا تھا کوئی گھر ..... تیرے دادا کا کوئی گھر تھا ..... یہ جو  
مارے جھگیاں لگا کر بیٹھے ہیں ..... کس کے باپ کے کوٹھے تھے ..... سارے  
یوں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔

میں جھگی میں نہیں زندگی گزار سکتی .....

وہ چلا کر بولی۔

تو کھل کے بات کر ..... کہنا کیا چاہے۔

جیراں نے کہا۔

ایک دم شمشیر آ گیا۔

چاچی ..... کیوں سر کھپا رہی ہے۔ اب کیا ہو گیا ہے ..... کیوں تنگ  
کے ہے سوہنی کو۔

وہ رومال سے ہاتھ اور گردن صاف کرتا مسکرا کر بولا۔

سوہنی نے دیکھا اور جھگی میں چلی گئی۔

جیراں پریشان سی کام میں لگ گئی۔

چائے دے دو چاچی ..... آج تو سر میں درد بھی ہو رہا ہے۔

شمشیر پاس ہی بیٹھ گیا۔

ہاں لے ..... جتنی مرضی پی لے۔

جیراں نے جلدی سے پیالی بھری اور شمشیر کے ہاتھ میں دے دی۔

وہ ہنس دی۔  
ارے نہیں آج تم سے بات ضروری کرنی ہے ..... کیونکہ وقت نکلا  
جا رہا ہے۔

جیراں نے کہا ..... چرے سے بڑی اداس لگ رہی تھی۔

کیا کہہ رہی ہے تو۔

وہ حیرت سے بولی۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ..... تیرا باپ تم دونوں کے لئے پریشان رہتا

ہے۔

جیراں تمہید باندھ رہی تھی۔

کیوں ..... کیا کیا ہے ہم نے ..... صبح جاتے ہیں شام کو گھر آ جاتے

ہیں۔ پھر اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے۔

سوہنی نے بڑے غور سے ماں کی طرف دیکھا۔

یہی تو پریشانی ہے کہ ایک ساتھ پلے جوان ہوئے ہو ..... پھر بھی دو

ہو۔

جیراں نے بغور سوہنی کے چرے کی طرف دیکھا۔

جب دو ہیں تو دو ہی رہیں گے۔

سوہنی ہنس دی۔

ایک ہو جاؤ نا بیٹی ..... شادی ہو جائے تمہاری ..... تمہارے ماں

باپ کی بھکر بھی دور ہو جائے۔ اخیر عمر میں سکھ کا سانس لیں ہم۔

جیراں ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

اماں ..... سوہنی ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

کیا ہوا ..... شادی کے نام پر گھبرا کیوں گئی ہو۔

جیراں نے نگاہیں اٹھا کر کہا۔

بات ہی ایسی کی ہے تم نے۔

سوہنی بولی۔



جگہ رہتے زندگی گزار دیتے ہیں۔  
 جیرا نے آہستہ سے کہا۔  
 میں کنوئیں سے باہر نکلنا چاہتی ہوں ..... ایک ہی طرح کی زندگی  
 نہیں گزارنا چاہتی۔  
 سوہنی نے کہا۔  
 تو کسی راجکمار کی رانی بننا چاہو۔  
 جیرا نے کہا۔  
 رانی نہ سہی روٹی تو بیٹھ کے ملے ..... یہ مزدوریاں کر کر کے تھک  
 گئی ہوں میں۔  
 وہ نفرت سے بولی۔  
 اے واہ ..... شرم تو نہ آوے تجھے ..... ابھی تیری عمر ہی کیا ہے جو  
 تو تھکنے لگی ہے۔  
 جیرا نے ٹھک سے اپنی خالی پیالی چائے کی خالی دیگچی میں رکھی۔  
 شمشیر جیسا بانکا سجیلا تجھے کہیں نہ ملے گا ہاں۔  
 جیرا دل کے پچھو لے پھوڑتی رہی ..... لیکن وہ پتھر تھی ..... اس  
 پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مست تھی۔ بیٹھی رہی۔  
 دل میں جو آگ بھڑک اٹھی تھی وہ دنیا بھر کے سمندروں کے پانی  
 سے بھی نہ بجھ سکتی تھی۔ اگر سوہنی کے اندر عشق کی آگ بھڑک رہی تھی تو  
 بیدار بخت کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ وہ سوہنی کے عشق میں بری طرح  
 گرفتار ہو چکے تھے۔ وہ لاکھ اپنے آپ کو اس آگ سے دور رکھنے کی کوشش  
 کرتے لیکن عشق کے شعلوں سے ان کا دامن راکھ ہو چکا تھا۔ وہ یہی چاہتے  
 سوہنی ہر وقت ان کے پاس ہو ..... پل کا کام ختم ہو چکا تھا۔ سوہنی سے  
 ملاقات کیے بہت دن ہو چکے تھے۔

موسم سرمئی سا ہو چلا تھا۔ ٹھنڈی سرشار سی ہوائیں چل رہی  
 تھیں۔ وہ ابھی تک اپنے کمرے میں لیٹے تھے۔ کلاک نے ٹن سے شام کے

آخری گھونٹ حلق سے اتار کر وہ سیدھا ہوا۔  
 بہت گرم تھی چائے ..... کیسے پی لی تم نے۔  
 جیرا حیرت سے بولی۔  
 بس پی لی چاچی ..... آگ پھانکنے کی عادت ہے مجھے۔  
 وہ بڑا بے کس نظر آ رہا تھا۔  
 خدا نا کرے کہ تو آگ پھانکے ..... مجھے تو دکھ میں نہیں سکھ م  
 اچھا لگے۔  
 جیرا نے کہا۔  
 سکھ میرے مقدر سے روٹھ گئے ہیں چاچی۔  
 وہ سامنے آتی سوہنی کو دیکھ کر بولا۔  
 اماں مجھے چائے دے۔  
 سوہنی نے کہا۔  
 پی لے آکر۔  
 جیرا غصے سے بولی۔  
 شمشیر نے پیالی میں چائے ڈالی اور پیالی سوہنی کی طرف بڑھائی۔  
 سوہنی نے شمشیر کے ہاتھ سے پیالی پکڑ لی۔  
 جیرا نے زہر خند نظروں سے سوہنی کو دیکھا۔  
 شمشیر اٹھ کر رامو کے پاس چلا گیا تھا۔  
 اتنا تنگ نا کر ..... تو اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی وجہ۔  
 جیرا نے کہا۔  
 میں کچھ نہیں کر رہی اماں اور نہ میں شمشیر سے نفرت کر رہی ہوں  
 ..... اس کی وجہ تو جانتی ہے ..... سوہنی خالی سی نگاہ سامنے شمشیر پر ڈال کر  
 گئی جو رامو کے سر کو دبا رہا تھا۔  
 تو جو خواب دیکھ رہی ہے نا وہ پورے نہیں ہو سکتے ..... ہم لوگو  
 کو شہزادے نہیں ملا کرتے ..... ہم تو کنوئیں کے مینڈک کی طرح ایک

چھ بجادیے تھے۔ اس وقت صرف سوہنی سے ملاقات کا سوچ رہے تھے۔  
ملازم نے مغربی خوبصورت لان میں معہ لوازمات کے چائے رکھ دیا  
تھی۔ وہ سامنے ایک کرسی پر خاموش بیٹھا عجیب عجیب سوچوں میں غرق تھا  
کب سے ملازم بلانے گیا تھا۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ  
ہو رہا تھا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔

پیٹر نے چائے دانی پرٹی کوزی درست کر دی۔  
کہ اچانک اس کی نظر اٹھی وہ لان کا زینہ اتر کر ادھر ہی آ رہے  
تھے۔

ہیلو پیٹر۔

وہ سفید شلوار قمیض میں بہت تروتازہ لگ رہے تھے۔

بیدار بخت نے کہا۔

آئیے سر۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

بیٹھو بیٹھو۔

وہ کہتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئے۔

کیا بات ہے جب تک پیغام نہ بھیجا جائے لان میں نہیں آتے آپ  
..... دیکھئے تو کس قدر اچھا موسم ہے۔

پیٹر نے جھومتی ہوا سے سرشار ہو کر کہا۔

جب دل کا موسم اچھا نہ ہو تو باہر کا موسم اچھا نظر نہیں آتا۔

جی (What is matter) کیا بات ہے ..... نصیب دشمنانِ ناساز کا

طبیعت کی وجہ؟

پیٹر نے سوال کر دیا۔

تم جانتے تو ہو۔

بیدار بخت نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

سوہنی کے بارے میں تو نہیں پریشان آپ۔

پیٹر نے قیافہ لگایا۔

یہی بات ہے۔ سکون برباد ہو چکا ہے۔

بیدار بخت اتنا ہی کہہ سکے۔

سر۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ..... اور وجہ تو نہیں۔

پیٹر تفصیل سے بات سننا چاہتا تھا۔

ایسی بات ہے ..... بلکہ پاکستان میں عشق بڑا منگتا پڑتا ہے۔ آدمی

انظار میں ختم ہو جاتا ہے۔

بیدار بخت نے کہا۔

میں تو سمجھا تھا کہ سوہنی کا خیال جناب کے دل سے محو ہو چکا ہو گا

..... وہ خالی نظر سے بولا۔

تمہارا وہم ہے پیٹر ..... سوہنی ہمارے وجود میں بری طرح سا چکی

ہے۔ ہم اس کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتے۔

ان کے الفاظ میں مضبوطی نظر آ رہی تھی۔

چھوٹا منہ اور بڑی بات والی مثال صادق آتی ہے سر ..... کہاں

آپ اور کہاں وہ جھگی والی۔

پیٹر نے بیدار بخت کے دل سے سوہنی کے خیال کو محو کرنا چاہا۔

سب کچھ تم درست کہتے ہو ..... لیکن ہم کیا کریں ..... سوہنی کا

خیال دل سے نہیں نکل سکتا۔

بیدار بخت بڑے مضطرب نظر آ رہے تھے۔

اگر گستاخی نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں۔

پیٹر مودب ہو گیا۔

ضرور کرو ..... تمہیں ہر طرح کے سوالات پوچھنے کی اجازت ہے۔

بیدار بخت نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

آپ سوہنی سے شادی کریں گے۔

پیٹر ایک دم سے بولا۔

کیا شادی ..... وہ بھی ہو سکتی ہے ..... لیکن اس وقت کا مسئلہ ہے ..... جسے حاصل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

بہتر سرکار۔

مالی برتن اٹھا کر لے گیا۔

تم کتنا کیا چاہتے ہو۔

بیدار بخت پھر گویا ہوئے۔

میرا مطلب واضح ہے سر ..... کہ سوہنی سیدھی سادھی بھولی بھالی

ہی ہے ..... کیا آپ اس کا تاحیات ساتھ دے سکتے ہیں۔

پیٹر نے کہنے کی جسارت کر ہی لی۔

ساتھ دیں گے ..... کیوں نہیں دیں گے ..... آخر ہم اس سے محبت

کرتے ہیں۔

وہ مسکرا کر کرسی سے ٹیک لگا کر بولے۔

آپ نے اپنے آپ کو سوہنی کے برابر رکھ کر دیکھا ..... بیگم صاحب

کبھی بھی۔

اوپر ..... پیٹر ..... اس قصے کے تاریک پہلو مت دیکھو ..... روشن

پہلوؤں پر نظر دوڑاؤ کہ اب کیا کیا جائے۔ بیدار بخت نے بات کاٹ دی۔

سر ..... آپ باعزت بادقار انسان ہیں ..... یہ جھگیوں والے کہیں۔

پھر تم نے کہا ..... محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

بیدار بخت بولے۔

خاناماں چائے لے آیا تھا۔

دونوں نے مل کر چائے نوش کی۔

تمہیں علم ہے نہ ..... یہ جھگیوں والے I meen ..... میرا مطلب کہ یہ

اڑکیسے لوگ ہوتے ہیں۔

بیدار بخت بولے۔

بہت ظالم۔

وٹ از سینک آف ظالم ..... بیدار بخت نے کہا۔

اپنے اصولوں پر قربان ہونے والے ..... اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی

بیدار بخت خاصے مجبور نظر آرہے تھے۔

آپ حکم کیجئے ..... سوہنی کو ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔

پیٹر کے انداز میں شرارت عود آئی تھی۔

Good ..... کوشش تو کرو ..... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

آپ بے فکر رہیے سر ..... آج تو نہیں کل ضرور کوشش کروں

گا۔

بیدار بخت نے تشکر امیز نگاہیں پیٹر کے نرم چہرے پر ڈالیں۔

ایک بات اور ہے سر .....

بیدار بخت نے سراٹھایا۔

آپ سینھ نورالدین صاحب اور بیگم مہر سلطان کے جلال سے تو

واقف ہوں گے ..... وہ تو کتا بھی نسل کا خریدتے ہیں ..... سوہنی کو کس

طرح برداشت کریں گے۔

پیٹر نے واضح کر دیا۔

لیکن یہاں سب خوف پانی کی طرح بہہ گئے ہیں ..... مجھے سوہنی کے

علاوہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

بیدار بخت نے چائے کی طرف دیکھا۔

میرا خیال ہے ٹھنڈی ہو چکی ہے ..... باتوں باتوں میں خیال ہی نہیں

رہا۔

پیٹر نے سامنے پھولوں کی تراش خراش کرتے مالی کو انگلی کے

اشارے سے بلایا۔

مالی بھاگتا ہوا قریب آیا۔

برتن لے جاؤ ..... خاناماں کو کھوپڑی گرم کر دے۔

پیٹر نے کہا۔

بیدار بخت نے کہا۔  
اور پیٹر نے چونک کر اس دولت مند کو دیکھا جو دولت سے ہر خوشی  
خریدنے کا عادی تھا۔  
وہ سوچ کی گہرائی تک پہنچ گیا ..... بیدار بخت ایک انتہائی دولت  
مند بگڑا ہوا رئیس تھا۔ وہ اپنی زندگی میں کسی ناکامی سے دوچار نہیں ہوا تھا۔  
پیٹر نے آنکھیں بند کر لیں۔

ولایت میں ہزاروں کلب گرل بیدار بخت کی دوست تھیں ..... وہ  
سب کو پسند کرتا تھا۔ ہر لڑکی بیدار بخت سے شادی کی خواہاں تھی لیکن اس  
نے آج تک شادی کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ بیدار بخت کی ہر رات  
شب برات اور ہر دن عید ..... دولت اس کے گھر کی لونڈی تھی۔ سوہنی  
بری طرح اس چکر میں پھنس چکی تھی۔ وہ کس طرح بیدار بخت سے سوہنی کو  
بچا سکے۔

پیٹر ..... کہاں چلے گئے ہو۔  
بیدار بخت نے پیٹر کو چونکا دیا۔  
میں بہت دور چلا گیا تھا سرکار۔  
وہ ٹال گیا۔  
ہمیں بتاؤ۔

بیدار بخت نے کہا۔  
شمشیر سوہنی کا منگیتر ہے۔  
پیٹر نے کہا۔

ہونے دو ..... تمہیں معلوم ہے پایا نے ہمیں کسی ضرورت کے لیے  
ترسے نہیں دیا۔

بیدار بخت کے انداز میں تکبر کا شائبہ شامل تھا۔  
آپ درست فرماتے ہیں جناب ..... شمشیر سوہنی کو بہت چاہتا ہے۔  
پیٹر ہر طرح سے بیدار بخت کو باز رکھنا چاہتا تھا۔

شادیاں اپنے قبیلوں میں ہی کرتے ہیں۔ خاندان سے باہر ہرگز نہیں کرتے۔  
پیٹر نے وضاحت کر دی۔

اس کا مطلب ہے کہ اپنے ڈھنگ سے زندگی گزارنے پر مجبور  
ہوتے ہیں۔ بے شک کتنی ہی سہولتیں میسر آ جائیں۔  
بیدار بخت نے کہا۔

جی ہاں ..... آپ نے درست فرمایا ..... سوہنی کا قبیلہ بھی ایسی  
روایات کا امین ہے۔

اچھا۔

وہ پیٹر کی بات سن کر سوچنے پر مجبور ہو گئے۔  
ان کی عورتیں محنت کش ہوتی ہیں اور ان کے مرد گھروں میں  
کھیلتے ہیں۔

پیٹر ایک دم بولا۔

مجھے ان لوگوں سے کیا لینا دینا ..... میرا واسطہ صرف سوہنی تک  
ہے۔

بیدار بخت نے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چائے کا آخری  
گھونٹ ابھی تک کپ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے سوہنی کے رنگ  
جلوؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

پیٹر۔ یہ لوگ دولت سے رام ہو سکتے ہیں۔

بیدار بخت ایک دم چونکے۔  
دوسروں کے بارے میں کچھ علم نہیں ..... البتہ سوہنی ایسی  
لگتی۔

پیٹر نے کہا۔

تم ان کے والدین سے رابطہ کرو ..... غربت بہت بری چیز ہے۔  
جب انسان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستا ہے تو اس وقت دولت کا  
قدرو قیمت کا احساس ہوتا ہے۔

ہمیں شمشیر کی چاہت کی چنداں پرواہ نہیں ہے۔ ہم صرف سوہنی کو چاہتے ہیں اور بس!

بیدار بخت کا فیصلہ حتی تھا۔

ٹھیک ہے سر..... پیٹرنے سر تسلیم خم کیا۔

بیدار بخت ذرا سا مسکرائے اور کھڑے ہو گئے۔

جار ہے ہیں۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

(11)

آج سورج نئے انداز سے جلوہ گر ہو رہا تھا۔ سرما کی نکھری نکھری دھوپ اوڈوں کی میلی بوسیدہ کثیف جھگیوں میں نئی زندگی بخش رہی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے بستر کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے تھے۔ عورتیں اپنے تنگ دھڑنگ بچوں کو غسل کے بعد کنگھی تیل اور مالش کر رہی تھیں۔ نوجوان مرد نلکوں میں غسل کرنے چل دیے تھے یا پھر پاس ہی ٹیوب ویل تھا وہاں چلے گئے تھے لیکن الزبائیاں گھروں اور جھگیوں میں ہی غسل کرتی تھیں۔

بیدار بخت اپنے کمرے کا دریچہ کھولے دور بین آنکھوں کو لگائے مطمع حیات کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ان کو سوہنی جھگیوں سے کافی فاصلے پر ایک پتھر کے اوپر بیٹھی اپنے دراز بالوں کو کھولے نظر آئی۔

وہ ایک دم سے پلٹے۔ دور بین کو پٹنگ پر پٹھا اور دوسری طرف سے گھوم گھما کر موٹر سائیکل کو سوہنی کے پاس روک دیا۔

اوئی اللہ صاحب جی..... آپ کہاں سے آ گئے۔

وہ ایک دم بالوں کو پشت کی جانب گرا کر بولی اور سر پر بڑے سلیقے سے آنچل اوڑھ لیا۔

تمہارے پاس آنے کے تمام راستے میری نظر میں ہیں۔

وہ موٹر سائیکل سے اتر کر چابی گھماتے پاس آ گئے۔

ادھر سے کون سا راستہ ہے۔

کمرے میں جا رہا ہوں..... طبیعت کو قرار نہیں ہے..... نہ جانے کیوں۔

وہ خراماں خراماں اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ طویل راہ داریاں اور خوبصورت لان - وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چل رہے تھے۔ چلتے چلتے کہیں کہیں گھاس کو بھی مسل کر گزرتے۔

پیٹر دور تک ان کی تمام حرکات و سکنات کو بغور چیک کر رہا تھا۔ پیٹر سمجھدار، زیرک اندیازہ شناس نوجوان تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ جس قدر عشق کا بھوت جلدی چڑھا ہے اور کہیں اتنی جلدی اتر نہ جائے لیکن بیدار بخت کے ارادے کی پختگی سے تو یہ عیاں ہے کہ وہ تن من دھن سوہنی پر دار سکتا ہے۔

وہ ایک دم چونکے شام تاریکی میں بدل چکی تھی۔ نور محل کی روشنیاں جگمگ جگمگ جل رہی تھیں۔ ایک نور کا سیلاب تھا جو چاروں جانب ایک خوبصورت سنن قیامت ڈھا رہا تھا۔

بابو جی..... اندر چلے..... سردی بڑھ گئی ہے۔

خانساں کی آواز پر پیٹر چونک گیا۔

ہاں بابا..... جا رہا ہوں۔

وہ اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سچ کہہ رہی ہو۔

انہوں نے آہستہ سے سوہنی کا ہاتھ چھوڑا۔

سوہنی نے ہاتھ کو آنکھوں سے لگایا۔

کیسے بتائیں صاحب جی ..... آپ کی محبت ہمارے اندر طوفان برپا کر رہی ہے۔ ہمیں کوئی اچھا نہیں لگتا ..... دن رات آپ کی راہ نکلتے رہتے ہیں۔ رات کو میں نور محل کو دیکھ کر جی بہلاتی ہوں۔

وہ بولی۔

ہمارے پاس آ جایا کرو۔

وہ جھکے۔

نہیں صاحب جی ..... ہم رات کو تنہا آپ کے پاس آ نہیں سکتے۔

کیوں ..... کوئی راستہ روکتا ہے تمہارا۔

کوئی ایک نہیں سب ہی میرا راستہ روکتے ہیں۔

وہ آہستہ سے بولی۔

میں آ جایا کروں ..... یہاں ..... یہ جگہ اچھی ہے ..... ارد گرد زیادہ لوگ بھی نہیں ہیں۔

ارے ..... یہاں کوئی ہے۔

سوہنی ایک دم چونکی۔

نہیں کوئی بھی نہیں ..... وہم ہے تمہارا ..... ہوا تیز چل رہی ہے۔ جھاڑیاں گمان پیدا کر رہی ہیں۔

بیدار بخت نے ہاتھ بڑھا کر سوہنی کے چہرے پر جھولنے والی آوارہ لٹوں کو ہٹانا چاہا۔

سوہنی نے ہاتھ بڑھایا اور اپنا کمزور ہاتھ بیدار بخت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

صاحب جی ..... کوئی دیکھ نالے ..... آپ چلے جائیں۔

بیدار بخت نے ارد گرد دیکھا۔

وہ دور تک پگھنڈی کو دیکھتی رہی۔

دل کا۔

وہ رومانی انداز میں بولے۔

وہ شرمائی لجائی ساری جان سے لرز گئی۔

بڑی پیاری باتاں ہیں آپ کی۔

سوہنی کی نگاہیں چمک رہی تھیں۔

تم پاس ہوتی ہو تو ہر شے پیاری ہو جاتی ہے۔

وہ سامنے رکھے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے۔

ہائے اللہ صاحب جی ..... آپ کو کہاں بٹھاؤں ..... یہاں تو آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے ..... اٹھنے میں صاف ..... وہ جھکی اور بیدار بخت نے سوہنی کا نازک ہاتھ تھام لیا۔

نہیں رہنے دو ..... ہمیں تمہارا قرب چاہیے ..... یہ کپڑے تو۔ وہ سوہنی کے نازک کومل ہاتھ کو دبا کر بولے۔

سوہنی کے رگ و پہ میں ایک بجلی سی کوندی۔ وہ ساری جان سے لرز گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک روز وہ اتنی بلندیوں کو چھو لے گی۔

وہ چھوٹی موٹی کی طرح زمین پر بیٹھ گئی۔

چھوڑ دتے صاحب ..... کوئی دیکھ نہ لے ..... ورنہ ہم بدنام ہو جائیں گے۔

وہ مسکرائی۔

عشق میں بدنامی تو ہوتی ہے سوہنی ..... بدنامی سے ڈرو گی تو ہمیں کیسے حاصل کرو گی۔

ساری دنیا کا پیار ان کی مست نگاہوں میں سمٹ آیا تھا۔

ایسا نہ کہیں صاحب جی ..... ہم آپ کو نہیں چھوڑنا چاہتے ..... آپ ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔

سوچ کہ وہ کتنا بڑا آدمی ہے۔ ولایتی ہے ولایتی۔  
شمو نے آنکھیں پھیلانیں۔

میں کیا کروں ..... میں خود کو اس کے بغیر آدھا جانوں ..... مجھے  
چین نہ آوے۔

سوہنی نے بالوں کی چٹیا گوندی۔  
امیر لوگوں کا عشق چڑھتے چاند کی طرح ہووے ہے سوہنی ..... تو  
نے دنیا نہیں دیکھی۔ وہ مجھے کھرانٹ لگے۔  
میں کیا کروں گی دنیا دیکھ کر مجھے اس کے روپ میں سارا جگ  
دکھے۔

سوہنی کا لہجہ چٹان کی طرح اٹل تھا۔  
تو پاگل ہے ..... میں تمہیں نیک مشورہ دوں ..... اب بھی پلٹ جا۔  
دیکھ پھر ہاتھ نہ لیو۔

شمو اب سنجیدہ ہو چکی تھی۔  
نہیں شمو ..... تو میری پیاری سہیلی ہے ..... میں تمہیں کیسے کہوں  
کہ صاحب جی میری زندگی بن چکے ہیں ..... میں چھوڑ نہ سکوں۔  
سوہنی سنجیدہ سی ہو گئی۔

اور وہ جو ترے سانس کے ساتھ ساتھ جیوے ..... اس کا کیا بنے  
گا۔

شمو کو شمشیر کی معصوم صورت نگاہوں میں نظر آنے لگی۔  
وہ کیوں میری سانس کے ساتھ جیوے ہے ..... کیوں جیوے میرے  
ساتھ۔

سوہنی کو غصہ آ گیا۔

وہ تیرا منگیتر ہے۔

شمو نے کہا۔

کیسا منگیتر ہے ..... نہ کسی نے پوچھا ..... نہ مشورہ لیا نہ مرضی

اچھا میں اب چلتا ہوں ..... رات کو جب چاند تمہارے سر پر ہو  
اس وقت یہاں ہونا۔

بیدار کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

یہ کیا بات ہوئی بھلا۔

وہ بھی کھڑی ہو گئی۔

ٹھیک ہے سوہنی ..... تمہیں وقت کا اندازہ نہیں ہے ..... میں جانتا  
ہوں۔ ٹھیک اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔

وہ موٹر سائیکل پر سوار مخصوص راستے سے ہوتے ہوئے واپس چلے  
گئے۔

وہ مدہوش ارد گرد سے بے نیاز دنیا مافیا سے دور بس دیکھے جارہی  
تھی کہ کسی نے زور سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

سوہنی بری طرح تڑپ کر پیچھے ہو گئی اور شمو کھل کھلا کر ہنس دی۔  
بڑی بے شرم ہے تو ..... ساری جان نکال دی۔

سوہنی نے ایک زوردار مکہ شمو کی پیٹھ پر جڑ دیا۔  
تو کس راستے پہ چل نکلی ہے سوہنی ..... تمہیں معلوم ہے یہ کون  
ہے۔

شمو نے پراسرار انداز میں کہا۔

میں جانتی ہوں ..... یہ نور محل کا باسی ہے۔

سوہنی ہنس دی۔

پھر بھی تو .....

شمو کے انداز میں حیرت کا شائبہ پایا جاتا تھا۔

ہاں ..... بیدار بخت مجھے بہت چاہتے ہیں شمو ..... وہ جان دیتے ہیں

مجھ پر۔

سوہنی نے اندازِ قفاخر سے شمو کو دیکھا۔

میں سب جان چکی ہوں ..... واقعی وہ تمہیں چاہتا ہے ..... تو یہ بھی

پوچھی۔

سوہنی نے کہا۔

کون پوچھے ہے ہمارے قبیلے میں ..... مالک مرضی اپنی اپنی کریں۔  
بس دوسروں کے ڈھنگ سے زندگی گزاریں ہم۔  
شمو نے کہا۔ اسے بھی اپنے قبیلے کے رسم و رواج سے نفرت ہوئے  
لگی تھی۔

اپنی کوئی مرضی نہ ہوئی ..... کولو کے بیل کی طرح آنکھوں پہ پٹی  
باندھ کر اپنی مرضی سے ہانک دیں۔  
سوہنی نے کہا۔

ہاں سوہنی یہی دستور ہے ہماری ذات کا ..... ہم اوڈکسی کی بات نہ  
مانیں۔

شمو نے کہا۔

سوہنی نے اوڈھنی کو اچھی طرح لیا اور چند سیکنڈ کھڑی ہوئی پھر شمو  
کی طرف دیکھ کر ہنس دی۔  
کیا دیکھ کر ہنسی ہو۔

میں یہ دیکھوں کہ بڑھے سے بیاہی جاوے گی تو ..... اور کہہ بھی نہ  
سکے کہ نہ چاہوں۔

سوہنی نے دانتوں تلے زبان رکھ کر چیخ کی آواز نکالی۔  
کیسے کہوں ..... بھائی کے بٹے پر رشتہ ہوئے میرا ..... بڑھا ہی لکھا  
تھا تقدیر میں۔

شمو نے کہا۔

میں ہوتی نا ..... کبھی ہاں نہ کرتی ..... بڑھے سے زندگی گزارنے کا  
کیا لطف۔

وہ بیدار بخت کے تصورات میں کھو گئی۔

تو اونچے خیالوں میں اڑ رہی ہے سوہنی ..... زمین پر بیٹھ جا۔ میرا

شورہ مان لے۔

شمو نے اصرار کیا۔

چل چل جھگی میں ..... ایسا سبق نہ پڑھا مجھے جو میرے اختیار میں نہ  
ہوے۔  
سوہنی نے شمو کا ہاتھ پکڑا اور اپنی اپنی جھگی میں چل دیں۔

سوہنی نے جھگی میں قدم رکھا۔

شمشیر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اماں کہاں ہے۔

سوہنی کو شمشیر کی آنکھوں میں کئی سوال ابھرتے نظر آ رہے تھے۔

چاچی اور چاچا، چاچی کنیزاں کی خبر لینے گئے ہیں اس کی جھگی میں۔

شمشیر نے سیدھے بیٹھ کر کہا۔

اسے کیا ہوا ہے۔

سوہنی ایک کونے میں بچھے کپڑے پر بیٹھ گئی۔

گر پڑی تھی ..... گھٹنے کو چوٹ لگ گئی ہے ..... اب تو فرق ہے۔

شمشیر نے سوہنی کی طرف منہ کر لیا۔

سوہنی نے نگاہیں چرائیں ..... اسے یوں احساس ہو رہا تھا جیسے شمشیر

مارے بھید جان گیا ہو۔

تو اتنی دیر کے بعد کہاں سے آ رہی ہے۔

شمشیر نے بوے غور سے اس کے سلیقے سے بنے بالوں کو دیکھا۔

بال سکھانے گئی تھی ..... وہاں شمو بھی آ گئی۔

سوہنی نے کہا۔



میں شہر گیا تھا ..... لیکن میری نظروں میں ہر وقت تو ہوے، جب  
گھر آؤں تو تجھے دیکھوں ..... جاؤں تو تب بھی میری اندر کی آنکھ تجھے  
دیکھے۔

شمشیر نے بڑی محبت سے سوہنی کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے  
شمشیر ..... مجھ سے اتنا پیار نہ کر ..... میں ترے پیار کے قابل نہیں  
ہوں۔

سوہنی نے مجبوراً "شمشیر کو کہہ ہی دیا۔  
تو میرے پیار کے قابل ہے سوہنی ..... میں تیرے پیار کے قابل  
نہیں ہوں۔

تو پھر میری محبت میں کیوں دیوانہ ہو رہا ہے ..... مت چاہو مجھ کو۔  
وہ پریشان سی ہو گئی۔  
تمہیں چاہنے کا اختیار میرے بس میں نہیں ہے۔  
شمشیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔  
کیوں نہیں ہے۔

سوہنی خود بے کس لگ رہی تھی۔  
بس نہیں نا ..... بس تمہیں میں چاہتا ہی جاؤں ..... میرے لیے یہ  
بات تکلیف دہ نہیں ہے کہ تو مجھے چاہتی ہے یا نہیں۔

وہ منہ پھیر کر اٹھا اور اپنے بستر پر چل دیا۔  
سوہنی چند لمحے دیکھتی رہی اور پھر لیٹ گئی۔  
شمشیر!

وہ اٹھ کر شمشیر کے پاس بیٹھ گئی۔  
کیا بات ہے۔  
وہ کروٹ بدل کر بڑی چاہت سے بولا۔  
تو مجھ سے محبت کیوں کرتا ہے۔

اتنی دور نہ جایا کر۔  
شمشیر کو اک دم سے سوہنی اچھی لگنے لگی۔ اس کا سنورا ہوا معمور  
حسن اسے خواستہ چاہت پر اکسانے لگا۔  
دور کہاں تھی ..... چند قدموں کا تو راستہ ہے۔  
راستے بھی قدموں سے لپٹ جاتے ہیں سوہنی ..... پھر تو تو اتنی اچھی  
ہے کہ ہر کوئی تجھے چاوے۔

وہ اٹھ کر سوہنی کے پاس آگیا اور زومعنی انداز میں بولا۔  
کیسی باتاں کرے ہے شمشیر۔  
سوہنی نے بغور شمشیر کو دیکھا۔  
میں ٹھیک کہوں ..... ذرا بچ کے رہیو ..... ارد گرد دیکھ لیا کر ہاں۔  
شمشیر نے سوہنی کے نرم و ملائم ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا۔  
تو کہنا کیا چاوے ..... کھل کے بات کر۔

سوہنی اک دم سے کانپ گئی۔ (کیس دیکھ تو نہیں لیا)  
بس میں نے کہا نا اتنی دور نہ جایا کر ..... وہ رستہ جہاں تو کھڑی تھی  
وہ تو رستہ بہت ہی خراب ہے۔  
دیکھ لیا ظالم نے۔

وہ سوچ کر رہ گئی۔ اس رستہ میں کیا ہے۔  
وہ بولی۔

وہ رستہ شہر سے آوے ہے ..... کبھی کبھی آوارہ لڑکے بھی موڑ  
سائیکل پر وہاں سے گزریں۔  
شمشیر نے کہا۔

اچھا ..... نہیں جاتی ..... میں کونسا اکیلی تھی، شمو تھی میرے پاس۔  
سوہنی نے ٹھنڈا سانس لیا۔  
پر تو کہاں تھا ..... شہر نہیں گیا تھا تو۔  
سوہنی نے کہا۔

وہ مسکرائی۔  
 کیوں کرتا ہوں۔  
 وہ حیرت سے بولا۔  
 ہاں ..... کیوں کرتے ہو ..... حالانکہ میں .....  
 تم سے محبت نہیں کرتی۔  
 شمشیر نے فوراً "بات کاٹ دی۔  
 وہ شرمسار سی دیکھنے لگی۔ وہ کہنا تو نہ چاہتی تھی لیکن اچانک ام  
 کے منہ سے نکل گیا۔  
 یہی کہنا چاہتی ہو نا تم۔  
 وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 نہیں ..... یہ تو میں نہیں کہتی ..... تم نے خود ہی کہہ دیا۔  
 سوہنی نے شمشیر کو غور سے دیکھا۔  
 میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔  
 کیا سمجھتے ہو تم۔  
 تم مجھے پیار نہیں کرتی ..... اور نہ ہی مجھے چاہتی ہو ..... مل  
 تمہارے باپ کے ٹکڑوں پر پلنے والا کتا ہوں ..... تم کیسے مجھ سے محبت کر  
 سکتی ہو۔  
 شمشیر کے لبے میں سارے جہاں کی محرمیاں سمٹ آئیں۔  
 یہ تمہارا وہم ہے ..... اماں اب تمہیں مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں۔ کتا  
 پیار کرتے ہیں وہ تم سے۔  
 وہ شمشیر کے دل سے گزشتہ تلخی ختم کرنا چاہتی تھی۔  
 اچھا چھوڑ سب باتیں ..... تو بیدار بخت سے بڑی محبت کرتی ہے نا۔  
 وہ ایک دم سے بولا۔  
 ہاں .....  
 وہ بے ساختہ کہہ اٹھی "یہ آواز اس کے شعور سے نکلی۔

تو مجھے ٹھوکروں سے اڑا دے ..... لیکن اس کو چھوڑ دے ..... وہ  
 زہی محبت کے قابل نہیں ہے۔  
 وہ بے چین سا مضطرب ہو کر بولا۔  
 کیوں ..... میری محبت کے قابل کیوں نہیں ہے ..... کیا میں اچھی  
 نہیں ہوں۔  
 تم بہت اچھی ہو ..... کاش میرے دل میں جھانک کر دیکھو ..... کتنی  
 پاتوں اور محبتوں کے انبار سجائے ہوئے ہیں میں نے ..... لیکن تو ہے کہ  
 پہنچتی ہی نہیں۔  
 وہ اداس نظریں سوہنی کے چہرے پر ڈال کر بولا۔  
 شمشیر، تو بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا ہے ..... میں تمہیں  
 پاتنی ہوں ..... لیکن تیری اور اس کی محبت میں فرق ہے۔ تو میرا بچپن کا  
 ماضی ہے۔  
 صبح وہ تمہیں ملنے آیا تھا۔  
 شمشیر نے کہا۔  
 کون؟  
 وہ ایک دم سے تڑپ اٹھی۔  
 وہی بیدار بخت ..... جو اپنی دولت کے بل بوتے پر تجھے جیتنا چاہتا  
 ہے۔  
 وہ صرف شمشیر کو دیکھتی رہ گئی۔  
 تم لاکھ پردوں میں رہو تو تمہارے تمام شب و روز میری نظر میں  
 آتے ہیں۔  
 ہاں بیدار بخت ان ٹیلوں کے پاس میرے پاس آیا تھا لیکن میں  
 نہ ہوں وہاں وہ کیسے آگیا ..... وہ جگہ تو نور محل سے بہت دور ہے۔  
 سوہنی نے دور نور محل کے بلند و بالا میناروں کو دیکھا۔  
 کی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھ لیا : د گا کہ تم وہاں ٹیلوں کے

پاس موجود ہو۔

لیکن کیسے۔

پہچانے والے عقاب کی نظر رکھتے ہیں میری جان۔

شمشیر نے ہنس کر اس کے عارضوں کو دیکھا جو چمک رہے تھے۔

تم کبھی کبھی پڑھے لکھوں والی باتیں کرتے ہو ..... اس لیے مجھے

تمہاری باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔

سوہنی نے کہا۔

اب سمجھنے کی کوشش کرو ..... جن سے تمہارا نانا ہے وہ تو بہت

پڑھا ہوا ہے۔

شمشیر نے طنزاً کہا۔

شمشیر تو ایسی باتیں نہ کیا کر ..... تیری باتوں سے مجھے دکھ پہنچتا ہے۔

سوہنی نے دکھ سے کہا۔

ٹھیک ہے ..... لو ..... معافی چاہتا ہوں۔

شمشیر نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔ سوہنی ہنسنے لگی۔

بڑا ہنس رہی ہے۔ تمہارا مذاق اڑا رہی ہے کیا۔

جیراں نے کہا۔

رامو اور جیراں اندر داخل ہوئے۔

نہیں چاچی ..... میں نے لطیفہ سنایا تھا ..... اس لیے ہم ہنس رہے

تھے۔

رامو شمشیر کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

لیٹ جاؤ چاچا۔

شمشیر نے جگہ بنائی۔

سوہنی ایک طرف کو ہو گئی۔

جیراں اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اپنی چادر کے ایک کونے کو

کھولا۔

یہ کیا ہے ماں۔

سوہنی جھک کر بولی۔

یہ منت کی شیرینی ہے۔ شرفو کی بھانجی کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اس لیے وہ لائی تھی۔

جیراں نے قریب سے چنگیر اٹھائی اور شیرینی اس میں ڈال دی۔

سوہنی نے ایک برنی کا ٹکڑا اٹھالیا۔

تو بھی لے لے ..... پکڑ۔

جیراں نے بڑا سا ٹکڑا شمشیر کو دیا۔

چاچی بہت زیادہ ہے ..... بس تھوڑا سا کھاؤں گا۔

وہ آدھا ٹکڑا رکھتے ہوئے بولا۔

سوہنی آرام سے کھائے جا رہی تھی۔

سوہنی کو دو چاچی ..... یہ میٹھا شوق سے کھاتی ہے۔

وہ سوہنی کو دیکھ کر بولا۔

لے لے اور ..... سوہنی لے پکڑ۔

جیراں نے اور مٹھائی سوہنی کو دی۔ دوسرا ٹکڑا شمشیر اور رامو کی

طرف بڑھا دیا۔

شمشیر نے تھوڑا سا لیا اور باقی سوہنی کو دے دیا۔

تو کھالے۔

جیراں نے کہا۔

تو بھی کھالیا کر ..... اپنے حصے میں سے ضرور نکال دیا کر حصہ۔

جیراں کو شمشیر کے نہ کھانے پر غصہ آ رہا تھا۔

اماں۔ شمشیر مجھے خود دے رہا ہے۔ میں نے مانگا تو نہیں۔

سوہنی نے مسکرا کر کہا۔

تو میٹھے کی بڑی شوقین ہے ..... دو کلو برنی اکیلی کھلا دوں تجھے اگر

ایک بات مان جائے۔

وہ مطمئن انداز میں بولا۔  
اے سوہنی ادھر آ جا..... جانے دے کام اسے۔  
اندر سے جیراں چلا کر بولی۔  
آ رہی ہوں اماں۔  
چل چل شاباش..... چاچی بلا رہی ہے۔  
وہ سوہنی کو جھگی کی طرف دھکیل کر بولا۔  
وہ تیز رفتاری سے نور محل کی طرف چل دیا۔  
وہ ست روی سے جھگی میں واپس آ گئی۔

جیراں نے ایک دم چونک کر کہا۔  
چھوڑ چاچی..... ایسے ہی برقی ضائع کرے گی..... اچھا یہ بتا کہ چاہا  
شرفو کیسا ہے۔  
وہ سوہنی کے چہرے پر ناگوار تاثرات دیکھ کر بات کو ختم کرنا چاہتا  
تھا۔  
اچھا ہے..... اللہ کا شکر ہے بچارے کی ٹانگ بچ گئی۔  
جیراں نے کہا۔  
شمشیر اٹھا۔  
کہاں چلا ہے بچہ۔  
رامو نے کہا۔  
پیٹر بابو نے بلایا تھا..... نور محل جا رہا ہوں۔  
پل کا کام ختم ہو گیا۔  
رامو نے پھر کہا۔  
ہاں چاچا پل کا کام ختم ہو گیا..... میں تو اب پیٹر بابو کے ساتھ کام  
کرتا ہوں۔  
جو تا پن کر شمشیر نے رومال اٹھایا۔  
سوہنی نے بغور دیکھا۔  
پیٹر بابو اچھی تنخواہ دے دیتا ہے..... بڑا اچھا آدمی ہے۔  
جیراں نے کہا۔  
سب ہی اچھے ہیں چاچی۔  
وہ باہر کی طرف آیا۔  
سوہنی لپک کر اس کی طرف آئی۔  
مجھے لے چل نور محل..... میں تیرے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی۔  
وہ بڑے بے قرار انداز میں بولی۔  
مالکن آجائے تو پھر چلی جایا کرنا۔ اب نس کے پاس بیٹھو گی۔

لاؤ..... اور کچھ رقم دے کر ان کا منہ بند کر دو۔  
بیدار بخت نے دولت مندوں کی بات کی۔  
سر.....

پیٹر حیران رہ گیا۔

میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو..... اور کچھ سنا نہیں چاہتا۔  
جناب وہ شمشیر۔  
پیٹر نے مجبوری ظاہر کی۔  
گولی مارو شمشیر کو..... وہ ہر راستے کی دیوار بنتا جا رہا ہے۔  
بیدار چلا اٹھے۔

جوں ہی موقع ملا میں سوہنی کو نور محل لے آؤں گا۔  
یہاں نہیں کورٹ میں، ماما کے آنے تک یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔  
وہ اونچی آواز میں بولے۔  
بہتر سر۔  
پیٹر نے سر تسلیم خم کر دیا۔

اور وہ اسی تاڑ میں رہنے لگا کہ کب سوہنی سے ملاقات ہو اور وہ  
بیدار بخت کے خیالات سے آگاہ کرے لیکن وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے  
بس سمجھنے لگا۔ اس کا اظہار پیٹر نے آج کھلے الفاظ میں کر دیا۔  
سر!

بولو..... نہ جانے بیدار بخت کا رویہ ایک دم تبدیل کیوں ہو گیا  
تھا۔  
جناب سوہنی کو کورٹ لے جانا بہت مشکل ہے۔  
پیٹر بولا۔

پھر کسی مولوی کا یہاں بندوبست کرو..... چند دن ہی رہ گئے ہیں ماما  
کے آنے میں..... اس طرح سارا پلان Dead ہو جائے گا Dead۔  
وہ زور سے بولے۔

(12)

زندگی حقیقتوں کا نام ہے۔  
متحرک ارتقائی سلسلہ ہے۔ انسانی ہستی ایک حیاتیاتی مشین ہے۔  
جنت اور دوزخ فضول مفروضے ہیں۔ انسان کی حدود اس کی پہلی اور آخری  
سائنس ہے اور یہ بھی مانی ہوئی حقیقت ہے کہ زندگی کی تمام رنگینیاں اتفاقی  
حادثے کے تحت ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ بیدار بخت کے لیے مزید اور وقت  
سوہنی کے بغیر گزارنا مشکل تھا۔ چنانچہ پیٹر کے ساتھ مشورہ کر کے انہوں نے  
شادی کا پلان بنایا۔

سرکار بہت بڑا قدم ہے..... اس سے کیسے نمٹیں گے آپ۔  
پیٹر نے کہا۔

اوہو..... ہم سوہنی سے شادی کرنا چاہتے ہیں..... نہیں رہ سکتے  
اس کے بغیر۔

بیدار بخت چلائے۔  
سر، کچھ دنوں میں بیگم صاحبہ بھی پاکستان آنے والی ہیں۔  
تم سمجھتے کیوں نہیں..... یہ سب مسئلے بعد کے ہیں۔ ابھی ہمیں  
سوہنی کی اشد ضرورت ہے۔  
لیکن سر! سوہنی کو نور محل لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔  
پیٹر نے مشکل بیان کی۔  
What..... اتنا سا کام تم سے نہیں ہو سکتا..... آج رات سوہنی کو

..... Yes sir

پیٹر کہتے ہی باہر نکل آیا۔

دوسری شام ڈھلتے ہی وہ جھگیوں کی طرف جانے والے راستے پر چل دیا۔ لوگ سردی سے بچنے کے لیے اپنی اپنی جھگیوں میں لٹائوں میں گھسے ہوئے تھے۔ پیٹر نے دور سے ہی رامو کی جھگی میں جلتے سسکتے چراغ کو دیکھ لیا تھا۔ سائیں سائیں کرتی تیز سینہ چیرتی ہوا خواخواہ ہی شور پیدا کر رہی تھی۔

پیٹر آہستہ سے اندر داخل ہوا۔

کون ہے؟

سوہنی ایک دم اٹھ کر دروازے کے پاس آئی۔

سوہنی ..... میں پیٹر ہوں۔

وہ آہستہ سے بولا۔

پیٹر بابو ..... خیریت تو ہے ..... صاحب جی ٹھیک تو ہیں۔

وہ پریشان ہو گئی۔

سب ٹھیک ہے ..... میرا خیال ہے تم اکیلی ہو یہاں۔

پیٹر نے ٹارچ سے ساری جھگی کو غور سے دیکھا۔

میں اکیلی ہوں ..... ابا بہت بیمار ہے۔ اماں حکیم جی کے پاس لے کر

گئی ہے اور شمشیر ابھی شہر سے لوٹ کر نہیں آیا۔

سوہنی نے کہا۔

شمشیر کو میں نے بھیجا ہے ..... وہ دیر سے ہی لوٹے گا ..... وہاں

بہت کام ہے۔

وہ اٹھرا اکھڑا بول رہا تھا۔

کیا بات ہے ..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ..... یہاں بیٹھ جائیں نا

.....

سوہنی نے ٹوٹا ہوا بانس کا مونڈھا رکھا۔

نہیں میں بیٹھنے نہیں آیا ..... تم سے کام ہے۔

وہ باہر کی طرف دیکھ کر بولا۔

مجھ سے ..... ہم غریبوں سے آپ کو کیا کام ہو سکتا ہے۔

سوہنی نے کہا۔

صاحب نے آج تمہیں نور محل بلایا ہے ..... وہ تمہیں ملنا چاہتے

ہیں۔

پیٹر نے دیے کی ملگجی روشنی میں سوہنی کو دیکھا۔

ہائے اللہ پیٹر بابو ..... یہ کیا کہہ دیا آپ نے ..... میں تو اڑ کے آ

جاؤں صاحب جی کے پاس ..... پر کیا کروں۔

وہ چپ سی ہو گئی۔

کوئی پرابلم ہے ..... آ نہیں سکتی ..... فاصلہ ہی کتنا ہے۔

پیٹر نے کہا۔

فاصلہ تو نہیں ..... نور محل ..... ہائے اللہ کیسے آؤں۔

وہ بے چین سی ہو گئی۔

تمہیں آنا ہو گا ..... صاحب بڑے بے چین ہیں ..... وہ آج رات

تم سے ضروری ملنا چاہتے ہیں۔

آج کی رات کوئی خاص ہے پیٹر بابو۔

وہ ہنس دی۔

بس خاص ہی سمجھو ..... وہ عشق کی آخری سرحد تک پہنچ چکے

ہیں۔

پیٹر نے کہا۔

میں آپ کو کیا بتاؤں ..... جس دن صاحب جی سے ملاقات نہیں

ہوتی چین نہیں پڑتا ..... جینا دو بھر ہو جاتا ہے میرا۔

سوہنی نے آنکھیں بند کر کے بیدار بخت کو تصور کی روشن آنکھ سے

دیکھا۔

ٹھیک ہے ..... جب سب سو جائیں ..... جھگیوں کا شور بند ہو

کے کام شہر گیا تھا۔

مجھے کہیں کام لے دے۔ تنگ آگئی ہوں بیٹھ کر۔

سوہنی نے کہا۔

اتنا کچھ مل جاتا ہے جو ہماری ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ اب تو گھر میں رہے گی اور میں کماؤں گا۔

وہ رومال کو چہرے اور گردن پر پھیر کر بولا۔

سوہنی خاموش ہو گئی۔

روٹی کھائے گا۔

ہاں تیرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں گا۔

وہ بڑی چاہت سے بولا۔

کچھ لایا ہے شہر سے۔

سوہنی نے اس کے ہاتھ میں پکڑا پلاسٹک کا لفافہ دیکھا۔

چاچا اور چاچی آلیں، پھر کھائیں گے۔

وہ لفافے کو مونڈھے پر رکھ کر بولا۔

اسی وقت ہانتا ہوا رامو اندر داخل ہوا۔ جیراں پکڑے ہوئے تھی۔

ارے چاچا، اتنا بخار ہے تمہیں۔

بڑھ کر شمشیر نے تھام لیا۔

بڑے صاحب کی گاڑی مانگ کر شہر لے جاتا ہوں چاچے کو۔

شمشیر نے رامو کو لٹا کر لحاف اوڑا دیا۔

نہیں بیٹا..... سردی کا بخار ہے۔ آرام آ جائے گا..... یہ مٹھی

گولیوں کی دی ہے حکیم جی نے۔

جیراں نے چھوٹا لفافہ شمشیر کو دکھایا۔

رامو تیز تیز سانس لے رہا تھا۔

سوہنی خاموش سب کو تنکے جا رہی تھی۔ ڈوبتی رات کا انتظار تھا۔

نہ جانے کب چراغ بجھے پائیں گے۔ شام ڈھل چکی تھی۔ تاریکی چاروں

جائے تو نور محل چلی آنا۔

وہ باہر کی طرف لپکا۔

آ جاؤں گی پیٹر بابو..... ضرور آؤں گی۔

پیٹر تیز رفتاری سے باہر نکل گیا۔

اور وہ..... گنگناتی ہوئی اپنے بستر پر گر گئی۔

ہائے صاحب جی..... میں آپ کو اتنی اچھی لگتی ہوں..... آپ نے

تو اپنے پیار میں رنگ کر کندن بنا دیا ہے..... آپ سونا تھے میں بھی سونا بن

گئی..... میں کیا تھی اور آپ کی محبت میں کیا بن گئی..... وہ جھوم اٹھی۔

ہمارا انی بنی خوبصورت صوفے پر بیٹھی تھی۔ کنیز باندیاں اس کے اور

گرد حکم کی تابع کھڑی تھیں..... بیدار بخت اس کے قریب آئے..... اسے

اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر نور محل کے پائیں باغ میں لے گئے.....

طاؤسی فوارے کے پاس بیٹھ کر اس نے بیدار بخت کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

سوہنی..... دیکھنا ہمیں چھوڑنا نہیں۔

بیدار بخت نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے صاحب جی..... آپ تو ہماری زندگی ہیں، ہماری

رگوں میں گردش کرتے خون کی طرح ہیں..... ہم کیسے بھولیں گے آپ کو

..... آپ نے ہماری عزت افزائی کی..... چین سے جینا سکھایا، جھگی سے محل

میں سجا دیا۔

وہ مدہوش اوندھے منہ لیٹی رہی۔ دنیا و مافیہا سے دور.....

سوہنی۔

ایک دم اندر شمشیر داخل ہوا۔

آگیا تو..... اتنی دیر کیوں لگا کر آیا ہے..... ابا اماں تو نہیں آئے۔

وہ بری طرح تڑپ اٹھی، حسین خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو وہ شمشیر

محل ہونا برا خیال کرنے لگی۔

تمہیں معلوم تو ہے کہ میں پیٹر بابو کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اتنا

جانب پھیل چکی تھی ..... راتیں بھی اماوس کی تھیں ..... آخری تاریکیوں کے چاند نے چاروں جانب سناٹا پھیلا دیا تھا۔

رامو کی شدید بیماری نے سب کو پریشان کر رکھا تھا۔ شمشیر شمرے جو لایا تھا وہ زہر مار کر کے سب اپنے اپنے بستر پر دبکے ہوئے سو چکے تھے۔ شمشیر اپنا بستر ہمیشہ جھگی کے دروازے میں بچھاتا تھا۔ آج وہ لیٹتے ہی سو گیا۔ سارے دن کا تھکا ہارا شمشیر ایسا سویا کہ ارد گرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ اچانک رامو کے خزانوں سے اس کی آنکھ کھلی ..... جیراں بھی سو رہی تھی اور دوسری طرف لحاف میں سوہنی لیٹی تھی۔ وہ مطمئن ہو کر لیٹ گیا۔ ایک دم جیراں اٹھ بیٹھی۔

دیوانوں کی طرح جیراں نے سوہنی کا لحاف پرے پھینکا۔ سوہنی .....

چاچی ..... کیا ہوا۔

وہ تڑپ کر قریب آ گیا۔

سوہنی نہیں ہے ..... رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پھر چلی گئی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

چاچی آہستہ بول ..... اس دیوار سے باہر آواز چلی گئی تو رسوائی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

شمشیر نے جیراں کا منہ بند کر دیا۔

تیری آواز ہونٹوں سے باہر نہ نکلے چاچی ..... ورنہ ہم بدنام ہو جائیں گے ..... اگر تو نے رونا ہے تو آہستہ ..... آواز نہ آئے۔

وہ جھگی سے باہر گیا مگر پھر پلٹ آیا۔

سوہنی تو کہاں ہے۔

وہ گھٹ کر تڑپی اور اندر ہی اندر چلا اٹھی ..... اس کے اندر آہوں جینوں کا طوفان اٹھ آیا۔

چند سیکنڈ شمشیر نے دیکھا ..... اس کی نگاہوں میں نور محل گھوم گیا۔

جھگیوں والے جمع ہو چکے تھے۔

جمع میں سے طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ایک کونے میں کانوں پہ انگلی رکھے کھڑا تھا۔

سوہنی بھاگ گئی۔

کس کے ساتھ۔

سنا ہے مالک کے ساتھ عشق تھا اس کا۔

کون مالک۔

وہ ہی بیدار بخت ..... نور محل والا۔

ان کی زمین پر تو ہماری جھگیاں ہیں۔

بس دولت پر مر مٹی۔

شورخ چنچل تو وہ پہلے ہی بہت تھی ..... قبیلے والے کسی نوجوان کو بھتی ہی نا تھی۔

ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیوے۔

شمشیر کو لوٹ گئی ..... کتنا چاہوے تھا اس کو ..... بچپن کا ساتھی۔

رامو کا کیا بنے گا۔

جمع میں سے آواز آئی۔

اور دلدوز چیخ نے سارے پردے چاک کر دیے ..... رامو تو جیراں کی پہلی چیخ پر ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملا تھا۔ سوہنی کی عدم موجودگی اس کی موت کا باعث بنی۔

سارے عذاب شمشیر کے حصے میں آ گئے تھے ..... سوہنی یہ تو نے کیا کیا ..... میرا خیال تو کیا ہوتا۔

صف ماتم بچھ چکی تھی۔ قبیلے کے لوگوں نے رامو کی میت کو باہر ہارپائی پر لٹا دیا تھا۔ جیراں ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ ایک ہی وقت میں دو صدے بڑے جان لیوا ثابت ہوئے۔ جیراں نے بال نوج لیے۔ سینہ پیٹ لیا۔ رامو سے زیادہ وہ سوہنی کا ماتم کر رہی تھی۔



وہ جلدی سے باہر آئی۔  
تم اندر چلو۔

بیدار بخت نے سوہنی کو اندر جانے کو کہا۔  
پیٹر بابو ..... پیٹر بابو ..... کوئی مر گیا ہے جھگیوں میں .....  
چوکیدار بھاگتا ہوا آیا۔  
ہمیں اس سے کیا۔

بیدار بخت نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔  
پیٹر اور چوکیدار اپنا سامنہ لے کر چل دیے۔  
صاحب جی ہمیں جانے دیجئے۔  
سوہنی نے کہا۔

کیسے بھی ..... اب تم ہماری بیوی ..... ہماری ملکیت ہو، کیسے جانے  
دیں تمہیں۔

وہ سوہنی کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر بولے۔  
ایسا لگتا ہے ہماری وجہ سے کوئی مصیبت آئی ہے ..... نہ جانے کتنی  
رسوائی ہوئی ہوگی۔

وہ بے حد دگیر انداز میں بولی۔  
تمہیں ایسی رسوائیوں کا خوف نہیں ہونا چاہیے۔ اب تم صاحب  
اختیار ہو۔

وہ مسکرائے۔

جی .....

وہ اتنا ہی کہہ سکی۔  
ہاں ..... اب ہم تمہیں وہاں جھگیوں میں نہیں جانے دیں گے۔  
بیدار بخت نے کہا۔

کیا میں اپا اماں سے کبھی نہ مل سکوں گی۔  
سوہنی کا جگر اچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

ہاچی نہ اپنی جان کو دکھ دے ..... میں ہوں نا تیرے پاس۔  
شمشیر نے بڑی محبت سے جیراں کے آنسو صاف کیے۔

تبھی چلا جائے گا ..... سوہنی مر گئی ..... تیرا چاچا مر گیا ..... تو زہر  
ہے نا میرے لیے ..... میری جان داری ..... تجھے کہیں نہیں جانے دوں گی۔  
جیراں نے دیوانوں کی طرح شمشیر کے دونوں بازو پوری سختی سے  
اپنی گرفت میں لے لیے۔

میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا ..... تو بس رونا بند کر دے۔  
اپنے آپ کو تسلی دے۔

وہ محبت سے اپنے دونوں ہاتھوں سے جیراں کے آنچل کو اس کے  
سر پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

جو جاتا ہے وہ واپس نہ آوے ..... تو نہیں جاوے گا۔  
وہ اس کو پکڑ کر بولی۔

رامو کی تجنیز و تکفین ہو چکی تھی۔ موزن نے اذان دی۔  
ٹھک ٹھک ٹھک .....

پیٹر نے بیدار بخت کی خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔  
اپنے گاؤں کی ڈوریاں باندھ کر وہ باہر نکلے۔

پیٹر ..... اس وقت تم ..... خیریت تو ہے۔  
جھگیوں میں کوئی ہنگامہ ہو گیا ہے سر۔

پیٹر پریشان سا بولا۔

اس ہنگامے کا مجھ سے کیا تعلق۔

وہ دونوں ہاتھوں کو سیدھا کرتے ہوئے بولے۔  
سوہنی سے واسطہ ہے سر ..... بڑا شور اور بین ڈالنے کی آوازیں

رہی ہیں۔

وہ بڑی جسارت کے بعد بولا۔

کیا ..... پیٹر بابو۔

نہیں ..... ہم تمہیں اپنے رنگ میں رنگ دیں گے ..... تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ بیدار بخت نے ایک جھگی والی سے شادی کر لی۔  
وہ دیکھتی رہ گئی۔

یہ آپ کہہ رہے ہیں۔  
سوہنی نے کہا۔

(13)

ہم درست کہہ رہے ہیں سوہنی ..... ہم تمہیں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لائے ہیں ..... تمہارے حسن نے ہماری نیندیں حرام کر دی تھیں۔ ہمیں تمہاری جھگی سے کوئی واسطہ نہیں ہے ..... ہم تمہیں مسز بیدار بخت بنانا چاہیں گے۔ تمہارے اس روپ نے ہمیں خرید لیا ہے۔  
وہ بڑی چاہت سے سوہنی کو دیکھ کر بولے۔

صاحب جی یہ کیا بات ہوئی۔

وہ احتجاجاً بولی۔

کوئی بات نہیں ..... فکر کی کوئی ضرورت نہیں ..... چند دنوں میں گورنس تمہیں سب کچھ سکھا دے گی۔  
وہ اٹھے۔

میں واپس آ جاؤں گی صاحب جی۔

وہ گڑگڑا اٹھی۔

نہیں ..... جاؤ غسل کرو۔

وہ اپنے ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

سوہنی نے ایک ایک کر کے تمام زیورات اتارے ..... ریشمی لباس

تبدیل کیا اور اپنا لباس زیب تن کیا ..... اوڑھنی لئے وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ ہی لڑکیاں ہوتی ہیں جنہیں ان کے والدین بڑی چاہت اور محبت سے دلہن بنا کر رخصت کرتے ہیں وہ بیٹی کے دامن میں نصیحتوں اور وفاداریوں کے پھول ڈالتے ہیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں آنسوؤں کی جھللاہٹ میں لڑکیاں سرخ جوڑا پن کر پی کے دیس میں رخصت ہو جاتی ہیں اور اپنے پیچھے لازوال داستانیں چھوڑ جاتی ہیں۔ لیکن وہ ان بے شمار لڑکیوں میں سے نہیں ہے۔ میں کس برتے پر ناز کروں۔ کس کو سرمایہ حیات سمجھوں۔ کون میری بے کسی پر آنسو بہائے گا۔ وہ لئے ہوئے جواری کی طرح ننگے پاؤں بھاگی آرہی تھی۔  
مجمع چھٹ چکا تھا۔

تمام لوگ اپنی اپنی جھگیوں میں دبی دبی زبانوں میں جیراں رامو اور سوہنی کی داستانیں دہرا رہے تھے۔ سورج پوری تمازت کے ساتھ پرسکون جسموں کو حرارت بخش رہا تھا لیکن آج کوئی دھوپ کا مزا لینے باہر نہیں آ رہا تھا۔ سب ایک دوسرے کو سوال کر رہے تھے۔

یہ کیا ہو گیا ..... سوہنی ایسی تھی ..... شمشیر اچھا انسان تھا ..... بس سنا ہی سنا چاروں جانب پھیل چکا تھا۔ صرف اس گھمبیر فضا میں جیراں کی آواز گونج رہی تھی۔

جیراں نے جھگی کے باہر کھڑے ہو کے چلا کر آواز دی۔ یہ جیراں کے اندر سے آواز آرہی تھی۔

انہی۔

شمشیر.....

سوہنی نے چلا کر آواز دی۔

سوہنی..... تو.....

وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا..... سوہنی کی خستہ حالی اور بے کسی دیکھ کر وہ

زپ اٹھا۔

شمشیر.....

وہ بھاگ کر شمشیر سے لپٹ گئی۔

کیوں آئی ہے ہماری میتوں پر ماتم کرنے..... یہاں کون ہے تیرا

..... کیوں آئی ہے.....

وہ سوہنی کے دونوں شانے پکڑ کر بری طرح چلایا۔

کون..... قبر سے اٹھ کر آئی ہے۔

جیراں ویران چہرہ لئے پاس آگئی۔

سوہنی آگئی ہے..... کیوں آوے ہے..... نکال دو اس کو..... یہ

مرگئی ہے..... نکال دے اس کو..... نکال دے اس کو۔

جیراں نے پوری طاقت سے سوہنی کو باہر کی طرف دھکیلا۔

شمشیر مجھے مت نکالو..... شمشیر۔

لیکن وہ تڑپتی رہی اور جیراں اس کو دھکے دیتی رہی۔

یہ مرگئی ہے..... یہ مرگئی ہے۔

سارے قبیلے والے باہر کھڑے تھے۔

کسی نے روکنے کو نہیں کہا۔ نہ ہی کسی نے روکا۔ اس نے چاروں

بازب دیکھا۔

ٹھیک ہے چلی جاتی ہوں۔

سوہنی نے اپنے آپ کو چھڑایا اور نور محل کی طرف بھاگ گئی۔

شمشیر ہاتھ ملتا رہ گیا۔

شمشیر.....

شمشیر تڑپ اٹھا۔

جیراں نے پھر دیکھا..... خوفناک نگاہیں چاروں جانب گھمائیں۔

تو کہاں ہے شمشیر..... میرے بچے کہاں ہے تو۔

جیراں چلائی۔

چاچی کیا بات ہے۔

شمشیر نے بھاگ کر جیراں کو لپٹا لیا۔

تو کہاں چلا گیا ہے..... میرے پاس رہ..... میرے بچے۔

تو چائے پئے گی..... تیرے لئے چائے بناؤں۔

شمشیر بڑی چاہت سے بولا۔

ہاں بیوں گی..... اپنے چاچا کو بھی دے..... تاپ میں تپ رہا

ہے۔ دے دے نا اسے۔

وہ شمشیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

ہاں دے دوں گا چاچا کو..... تو پی لے۔

شمشیر افسردہ سا ہو گیا۔

جیراں خلا میں گھور رہی تھی۔

شمشیر واپس چولے کے پاس چلا گیا۔

ایک پیالی خود اور دوسری پیالی جیراں کے لیے لے گیا۔

چاچی..... چائے پکڑ لے۔

شمشیر نے جیراں کے دونوں ہاتھوں میں پیالی تھما دی۔

جیراں ساکن سی پیالی تھام کر پینے لگی۔

دروازے میں بیٹھ کر شمشیر بھی پینے لگا۔

جھک کا بوسیدہ پردہ اٹھا ہوا تھا۔

سوہنی.....

شمشیر پوری جان سے لرز گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پیالی جھلک

جیراں چیختی رہی۔

وہ باہر نکلا۔

سوہنی رک جا.....

وہ چلایا۔

وہ چلی گئی ہے..... کیوں نہیں روکا تم نے اسے..... وہ چلی گئی ہے۔

کیسے روکتے..... میرے بیٹے وہ رکنے والی نہیں ہے۔

قبیلے کا ایک معمر شخص اس کے پاس آیا۔

وہ اچھوت ہو گئی ہے۔

شمشیر چلایا۔

ہاں..... ہماری ناک کاٹ کر بیدار بخت کے ساتھ بھاگ گئی.....

لوگ کہتے ہیں ہم لوگ باعزت نہیں..... اوڈوں کی بیٹیاں اچھی نہیں ہوتیں

..... بتا ہم کیا کریں۔

بزرگ شمشیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور لوگوں کو جانے کا

اشارہ کیا۔

دوسری طرف سے لوگ واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے۔

وہ تنہا جھگی کے پاس کھڑا رہا۔ بزرگ بھی چلے گئے۔

شمشیر تو یہاں کس لیے کھڑا ہے۔

جیراں باہر آئی۔

ایسے ہی چاچی۔

شمشیر نے آنکھیں صاف کیں۔

تو رو رہا ہے..... سوہنی کے مرنے کا غم ہے تجھے۔

دیکھ نا..... ہم سب مر چکے ہیں..... سوہنی، رامو..... جیراں،

کو موت لے گئی..... پر..... پر تو زندہ رہ..... تجھے موت نہ لے کر

جاوے۔

وہ شمشیر کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولی۔

میں بھی مر گیا ہوں۔

وہ بھیگی پلکیں چھپکا کر بولا۔

نہیں.....

وہ اتنے زور سے چلائی کہ کائنات لرز گئی۔ پلٹ کر شمشیر نے جیراں

کو تھام لیا۔

تو زندہ رہے گا..... میرے لیے..... رامو کے لیے..... اور اپنی

سوہنی کے لیے۔

وہ بری طرح رو دی۔

شمشیر جیراں کو اپنے بازوؤں کے حصار میں جھونپڑی میں لے آیا۔

تو سو جا..... ترے دماغ کو سکون آوے گا۔

وہ جیراں کو لٹاتے ہوئے بولا۔

تو بھی سو جا..... رات ہو گئی ہے نا..... دیکھ اندھیرا چھا گیا ہے۔

جیراں لیٹتے ہوئے بولی۔

ہاں..... تو ٹھیک کہتی ہے..... اندھیرا چھا گیا ہے۔

وہ پلٹا۔ جب نصیب میں سیاہی بھری ہے تو ہر طرف اندھیرا ہی نظر

آئے گا۔

وہ سوچ کر باہر نکلا اور چولہے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ کہاں سے کہاں

پہنچ گیا تھا۔

سوہنی تو اتنی ظالم نکلی..... عیش و عشرت کی بھوکی..... تجھے ذرہ بھر

بھی ہمارا خیال نہ آیا۔

وہ سوچتا رہا..... سوچوں کے عمیق غار میں ڈوبتا رہا۔

سوہنی اسے لوٹ گئی۔

برباد کر گئی۔

نکلے نکلے کر دیا سوہنی نے اس کے دل کو۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔  
 جانے کب تک اس کی آنکھوں سے گرم گرم نمکین پانی چشمے کی  
 طرح ابلتا رہا..... پھر اسی حالت میں وہ بے سدھ سانیں یا بیہوشی کی آغوش  
 میں چلا گیا۔  
 رات دھیرے دھیرے سسکتی رہی۔ جاگتی رہی۔ گذرتی رہی۔

(14)

ایک صحرا ختم ہوتا ہے۔  
 اور۔

دوسرا صحرا شروع ہو جاتا ہے۔

آخر میں کب تک اس سنگلاخ سرزمین پر اپنی ناتمام آرزوؤں کا خون  
 کرتا رہوں۔ کیا میرے مقدر میں تشنگی ہی تشنگی کیوں ہے۔ کیا میری زندگی کا  
 ماحل پیاسا رہے گا۔ وہ جھگی کی بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا کیا  
 سوچے جا رہا تھا کہ کسی نے پردہ اٹھایا۔

آ جاؤ چاچا..... بیٹھو۔  
 شمشیر نے کہا۔

شرفو اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور پلٹ کر جھگی کے ایک کونے میں  
 دیکھا۔ جیراں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔  
 بہن جیراں اب کیسی ہے۔  
 شرفو نے کہا۔

ویسی ہی ہے۔ ڈاکٹر نے نیند کی گولی دی تھی تبھی سکون کے ساتھ  
 لیٹی ہے۔

شمشیر اداس جیراں کو دیکھ کر بولا۔

اوہو..... کیسا خوشحال گھرانہ ہوئے تھا رامو کا..... ہنسنے کی آوازیں  
 ی آویں تھیں ہر وقت۔

شرفو چپ ہو گیا۔

اب تو رونے کی آواز بھی نہیں آتی چاچا..... بس سنا ہی سنا ہے

جھگی میں۔

شمشیر نے کہا۔

سوہنی آئی تھی۔

شرفو نے کہا۔

ہاں چاچا سوہنی آئی تھی..... لیکن چلی گئی۔

وہ اپنے اندر کی آگ کو دبا کر بولا۔

چلی گئی..... تم نے روکا تو ہو گا۔

شرفو نے بغور شمشیر کو دیکھا جس کا چہرہ درد و کرب کی اذیت سے

دکھ کی تصویر بن گیا تھا۔

میں نے تو روکا تھا پر..... قبیلے والے کب چاہتے تھے اسے روکا

..... چاچی نے بھی اسے ٹکنے نہیں دیا..... دھکے دے دے کر نکالا سب نے۔

وہ بہت ہی اداس ہو کر بولا۔ اس کی آنکھوں کے سوتے پھون

پڑے اور وہ بری طرح رو دیا۔

شرفو دیکھتا رہا۔ اور شمشیر گھٹنوں میں سر دیے سسک سسک کر رونا

رہا۔

صبر سے کام لے بیٹا۔

شرفو شمشیر کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولا۔

صبر ہی تو کر رہا ہوں..... کسی کو کچھ نہیں کہا میں نے..... وہ میرے

سامنے چلی گئی۔

وہ پھر رو دیا۔

سوہنی اب تیری نہیں ہے شمشیر..... اس نے بیدار بخت سے شادا

کر لی ہے۔

شمشیر کی روح جیسے قفسِ غصہ سے پرواز کر گئی ہو۔

ہاں..... بیدار بخت نے اس سے شادی کر لی ہے..... وہ بڑے عیش  
میں زندگی گزار رہی ہے۔

شرفو بولا۔

میں نے کب اس کا برا چاہا..... وہ شروع ہی سے جھگی کو پسند ہی نہ

کرے، وہ دولت چاؤے تھی دولت..... میری آس توڑی اس نے۔

شمشیر نے سر جھکا لیا۔ آنسو اب بھی اس کے رخساروں کو بھگو رہے

تھے۔

ہاں بیٹا..... آس امید اور اعتماد کی اگر بیساکھی ٹوٹ جائے تو آدمی

کی حیثیت درخت سے ٹوٹے ہوئے اس پتے کی سی ہو جاتی ہے جس کا ٹھکانہ

ہی کوئی نہ ہو۔ ہوا کا تیز جھونکا اسے اڑا کر کہیں کا کہیں لے جاوے۔

شمشیر نے بڑے غور سے ڈبڈبائی نگاہوں سے شرفو کی طرف دیکھا۔

اب میں کیا کروں..... اس لاش کو اٹھا کر کہاں کہاں پھروں میں۔

شمشیر نے سوئی ہوئی جیراں کی طرف اشارہ کیا جو سوکھ کر کانٹا نظر

آنے لگی تھی۔ چند دنوں میں حالات کیا سے کیا ہو گئے تھے۔

میں آج اس لیے تمہارے پاس آیا تھا کہ اپنی زندگی کو برباد نہ کر۔

شرفو نے شمشیر کے توانا چہرے کو دیکھا جس پر نوجوانی کا انوکھا رنگ

لک رہا تھا۔

زندگی برباد ہو گئی..... رامو چاچا مر گیا..... چاچی پاگل ہو گئی جو مجھ

سے پیار کرتی تھی..... اور جس کے لیے میں جیتا تھا وہ بھی چھوڑ کر چلی گئی۔

کتنا دکھ تھا اس کے انداز میں..... وہ ریزہ ریزہ ہوا جا رہا تھا۔

اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ اپنی زندگی برباد نہ کر..... شادی کر

شرفو جلدی سے کہہ گیا۔

شادی..... جانے دے چاچا..... شادی سے خوف آوے ہے مجھ

لے

جیراں نے سرخ سرخ آنکھوں سے شمشیر کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا دیا۔  
 شمشیر نے بڑی محبت سے جیراں کے ہاتھ میں گلاس تھما دیا۔  
 شرفو نے پلٹ کر جیراں کو دیکھا۔ وہ اس وقت شکستہ کھنڈر کی طرح  
 ویران لگ رہی تھی۔  
 بہن جیراں کیسی ہو۔

شرفو نے پکارا۔

جیراں نے شمشیر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور گلاس پکڑا  
 دیا۔

چاچا شرفو ہے ..... تمہارا حال پوچھتا ہے۔  
 شمشیر نے کہا۔

شرفو کی طرف دیکھ کر جیراں معمولی متبسم ہوئی اور پھر لیٹ گئی۔  
 شرفو اٹھ کر پاس آ گیا۔  
 بہن جیراں اب طبیعت کیسی ہے۔

چاچی بولونا چاچا کے ساتھ ..... جواب دو وہ طبیعت پوچھتا ہے۔  
 شمشیر نے جیراں کے بکھرے بالوں کو سنوارا اور سر پر آئینل اوڑھا  
 دیا۔

شرفو سے جیراں کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس نے منہ پھیر کر  
 آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر باہر کی طرف آ گیا۔ شمشیر بھی اس کے ساتھ  
 باہر آ گیا۔

تم حوصلہ رکھو شمشیر ..... بڑی آزمائش ہے تمہارے لیے میرے  
 بچے۔

شرفو نے شمشیر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

اس زندہ لاش کو بڑی حفاظت کی ضرورت ہے بیٹا ..... اسی لیے کہہ  
 رہا ہوں شادی کر لے ..... شمو تیرے سارے دکھ بانٹ لے گی۔

شمشیر نے چونک کر دیکھا۔ اس کو شرفو کا اصرار اچھا نہیں لگا لیکن

وہ بولا۔

پاگل ہے کیا ..... قبیلے والے تجھے ہنس کے لڑکی دینے کو تیار ہیں۔  
 جس سے کہے گا اس سے شادی کر دیں گے۔  
 شرفو نے لاکھ کوشش کی اسے منانے کی لیکن وہ ایک ہی بات پر اڑا

رہا۔

دیکھ شمو بہت اچھی لڑکی ہے ..... پہلے بھائی کے بٹے پر اس کی ایک  
 بوڑھے سے شادی ہو رہی تھی ..... اب عمر دین مان گیا ہے۔

شرفو نے پھر سمجھایا۔

نہیں نہیں چاچا شرفو ..... میں اب شادی نہیں کروں گا۔

وہ مستحکم فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔

کیوں نہیں کرے گا ..... اتنی جوانی میں یوں ہی بیٹھا رہے گا۔

شرفو بولا۔

سب کچھ اسی کے نام ہے چاچا۔

وہ نیک لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ جو تیری نہ بن سکی ..... کیوں نامراد مرنا چاہتا ہے۔

شرفو کو غصہ آ گیا۔

میں تو اس کا ہوں ..... میں کیسے اسے چھوڑ دوں چاچا ..... مجھ؟

کوئی آس نہ رکھو ..... میں اسی کا ہوں ..... بس۔

رامو میرا بھائی تھا ..... اس کی روح کو میں تڑپتا نہیں چھوڑ سکتا۔

تجھے دیکھ کر مجھے رامو کا خیال آتا ہے ..... اس نامراد کا خیال آتا ہے؟

حالات کی گرد میں رل گئی ہے۔

شرفو نے جیراں کی طرف اشارہ کیا۔

جیراں اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

چاچی پانی پیو گی۔

وہ گلاس بھر کر پانی کا اس کے پاس چلا گیا۔

شرفو خاموش رہا۔ اس کے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا۔ وہ تو ان دونوں خاندانوں کا ملنے والا ہمدرد، نمکسار بزرگ تھا جو سب کا دکھ اپنا سمجھتا تھا۔

شرفو نے عمر دین کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کچھ سوچتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

میرا خیال ہے جیراں اس کے پاؤں کی زنجیر ہے۔  
شرفو نے کہا۔

ماسی جیراں کو کوئی دھکا تو نہ دیوے۔ آخر ہم لوگ کس لیے ہیں۔  
سنبھال لیں گے۔ وہ ہماری ماں کی طرح ہے۔

عمر دین پھر بولا۔

تم ٹھیک کہتے ہو بیٹا..... پھر ایک بار کوشش کر کے دیکھ لوں گا۔  
شرفو اٹھا۔

بیٹھو نا..... روٹی کھا کے جانا..... شمو آ لے تو۔

عمر دین نے بڑی چاہت سے روکنا چاہا۔

ارے نہیں بیٹا روٹی کی کوئی گنجائش نہیں ہے..... میں جاؤں۔ کسی نے چارپایاں بننے کے لیے کہا ہے، کوئی چار پیسے مل جائیں گے نا۔

وہ جاتے جاتے بولا۔

چاچا..... کئی بار کہہ چکا ہوں ادھر سے روٹی کھالیا کر..... تیرا کونسا جھنجھٹ ہے جو مزدوری کرے ہے۔

عمر دین نے بازو پکڑ کر روکنا چاہا۔

ارے بیٹا پہلے کہاں سے کھاتا ہوں..... تم لوگوں کے ہاں سے ہی کھاتا ہوں۔ قبیلہ میرا خیال رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو کوئی کام کروں۔ خواہ مخواہ کیوں توڑ کر بیٹھوں۔

شرفو بولا۔

اچھا..... تمہاری مرضی..... روٹی یہاں سے ہی کھانا جس وقت جی

وہ خاموش رہا۔

شرفو چلا گیا۔

سیدھا شمو کے ہاں پہنچا۔

آؤ آؤ چاچا..... سناؤ پھر کیا پیغام لائے۔

عمر دین نے کہا۔

کہنا کیا ہے..... وہ شادی کرنے کے حق میں ہی نہیں ہے۔

شرفو نے افسوس ظاہر کیا۔

اب بھی نہیں مانتا..... کیا کمی ہے میری بہن میں۔

عمر دین کو غصہ آ گیا۔

اوہو کی کا کب کہہ رہا ہے..... بس وہ کہتا ہے میں شادی کروں ہی

نہیں۔

شرفو نے کہا۔

کسی سے بھی نہیں۔

عمر دین حیرت سے بولا۔

ہاں..... کسی سے بھی نہیں..... بس جیراں اور سوہنی کے لیے زندہ

ہے۔

شرفو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

عمر دین خاموش ہو گیا..... شرفو بھی حسب عادت سر جھکا کر بیٹھ

گیا کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلا ہے یہ شمشیر علی۔

بہت دیر فضا ساکن رہی۔ عمر دین کی آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

نہ جانے وہ کیا سوچتا ہے۔

شرفو چونک کر بولا۔

سوچتا کیا ہے..... پہلے سوہنی سے عشق کرتا تھا اور اب اس کے ہجر

میں مر رہا ہے۔

عمر دین کے الفاظ میں غصہ اور خفگی تھی۔



تمہیں ..... تجھ جیسی ہزاروں لونڈیاں اس کے نور محل میں کام کرتی ہیں۔  
 شمشیر گھٹنوں پر سر رکھے بلک بلک کر رو دیا ..... جیسے کوئی معصوم  
 بچہ کسی کھلونا کے کھو جانے پر زار و قطار روتا ہے۔ وہ روتا رہا ..... اس کی  
 دلدوز آہوں نے بوسیدہ جھگی کے سکون کا پردہ چاک چاک کر دیا۔ وہ تڑپتا رہا  
 ..... مچلتا رہا۔ گئے دنوں کو کیسے روک لیتا ..... سوہنی کی کھلتی نہی جسے چاندی  
 کے تار بج اٹھے ہوں ..... جیراں کی جھڑکیاں جو وہ اس کی حمایت میں سوہنی کو  
 دیتی تھی ..... سوہنی کا بسورنا ..... جھگڑنا .....  
 شمشیر.....

وہ ایک دم سے چونکا۔  
 دو تین بزرگ داخل ہوئے جن میں شرفو بھی تھا۔  
 آؤ بچہ ..... اٹھو بھی ..... جانا نہیں ہے۔ سب لوگ تیار ہیں۔  
 بابا ..... میں کیا کروں گا جا کر ..... مجھے رہنے دو۔  
 وہ کھڑے ہو کر جیراں کی طرف دیکھ کر بولا جو دیوار کی طرف منہ  
 کئے لیٹی تھی۔

بہن جیراں ..... او بہن جیراں۔  
 ایک بزرگ نے آواز دی۔  
 شمشیر نے دیکھا۔

سو رہی ہے شاید .....  
 بہن جیراں۔

دو سرا بزرگ پاس چلا گیا۔  
 بہن جیراں .....  
 شرفو نے چہرے کو جھک کر دیکھا۔  
 وہ پرسکون سو رہی تھی۔  
 گہری نیند سو گئی شاید۔  
 شرفو نے کہا۔

کرے۔

عمر دین نے کہا۔

شرفو نے دیکھا اور اپنے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

سوہنی کے بھاگ جانے سے قبیلے میں ایک ہراس سا پیدا ہو چکا تھا۔  
 اوڈ اپنی بیٹیوں پر کڑی نگرانی لگا کر ان کو گھروں میں قید کرنا چاہتے تھے۔  
 خاص طور سے ان لڑکیوں کے لیے جو نئی نئی جوانی کی حدود میں داخل ہوئی  
 تھیں۔ یا وہ نوجوان لڑکیاں جنہوں نے سوہنی کی رسوائی کا منظر دیکھا ہے۔  
 قبیلے کا سب سے بڑا بزرگ بابا عالم پوش اس رسوائی سے بڑا دلگیر ہوا تھا۔  
 وہ اپنے قبیلے کی رسوائی ہرگز نہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے کوچ کا حکم دے  
 دیا تھا۔ اہل قبیلہ اپنے ساز و سامان کو باندھ کر گدھا گاڑیوں، اونٹوں یا بیلوں  
 پر رکھنے لگے تھے۔ بڑا کسمپرسی کا عالم تھا۔ فضا بھی گھمبیر سی ہو چکی تھی۔ وہ  
 لوگ نور محل سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔ جہاں کسی دولت مند کا سایہ نہ  
 پڑے۔ آج رامو کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی روز ہو چکے تھے۔  
 شمشیر اپنی جھگی کے دروازے میں بیٹھا بیرونی منظر دیکھ رہا تھا۔ لوگ  
 بھاگ بھاگ سامان باندھ رہے تھے۔ بکریاں بھیڑیں میا رہی تھیں۔

یہ زندگی دھوپ میں برف کی مانند ہے، سوہنی ..... تو نے کیا کیا  
 ..... کیا تمہاری آنکھوں پر غفلت کا پردہ پڑ گیا تھا ..... تو میرے دل کی  
 خوبصورت دلہن تھی۔ اپنے بد صورت عمل سے تو نے کیوں اسے بد صورت  
 بنا دیا بلکہ کریمہ چہرہ بنا دیا جس سے نفرت ہونے لگی ہے زمانے کو ..... کاش  
 تو ایسا نہ کرتی اور میں اپنی خجالت بھری آنکھوں کو دنیا کے سامنے مایوس نہ  
 جھکاتا ..... یہ بیدار بخت کی دولت پر مر گئی تو۔ مجھ سا پیار وہ کہاں کرے گا

شمشیر بھاگ کر پاس گیا۔

چاچی ..... چاچی۔

وہ چیخ اٹھا۔ چاچی ہمیشہ کے لیے سو گئی ہے۔

اس کی دلدوز چیخ کائنات کے درو بام لرزا گئی۔

سب نے اس کے ماتھے کو چھوا۔ اس کا برف جیسا جسم اس بات کا

غماز تھا کہ وہ بہت پہلے اپنے مالک حقیقی سے جا ملی ہے۔

چاچا ..... اب کیا کروں ..... چاچی بھی چھوڑ کر چلی گئی ..... کس کے

سارے زندہ رہوں۔

سب افسردہ کھڑے تھے۔

وہ شرفو کے کاندھے پر سر رکھے رو دیا۔ سب نے محبت اور شفقت

سے شمشیر کو دلاسا دیا۔

پھر جیروں کی آخری رسومات پوری کرنے کے لیے کچھ دنوں کے

لیے قافلہ ٹھہر گیا۔

(15)

اشکوں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے پھوٹ کر بہتا رہا۔ وہ دامن میں آنسو چن چن کر بڑھتی جاتی تھی۔ وہ کتنی جلدی شناسا چروں سے دور ہو گئی تھی۔ میں کسے پلٹ کر دیکھوں۔ شمشیر کے روکنے پر بھی کوئی اسے روکنے کو نہ بڑھا۔ وہ اتنی بد نصیب تھی کہ ماں نے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ اگر ایک لمحہ کو پلٹ کر دیکھتی بھی ہوں تو حد نگاہ تک نفرتوں کی پرچھائیاں لرزتی ہیں۔ اس کی رفتار دھیمی ہوتی جاتی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے۔ صرف قدم کھڈب راستے پر غیر یقینی انداز میں پڑتے جاتے تھے۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ چاروں جانب خوفزدہ نظروں سے دیکھتی آسیب زدہ سی بھاگی جا رہی تھی کہ اس کو ایک دم گیٹ پر چوکیدار بابا نے روک لیا۔

مجھے جانے دو بابا ..... خدا کے واسطے جانے دو۔

وہ ہاتھ باندھ کر بولی۔

او بچہ کیسے جانے دوں ..... صاحب نے منع کر دیا تھا ..... نہ تم گئی کس لیے تھی ..... اب کیوں آگئی ہو۔

خان بابا کو غصہ آگیا تھا۔

میرا باپ مر گیا ہے ..... وہ مجھے جانے نہیں دیتا تھا ..... پھر میں کیا کرتی۔

وہ بے بسی کے عالم میں پوچھنے لگی۔

جا آرام سے اندر سے کٹدی لگا کر بیٹھ جانا ..... وہاں سے بھی کہیں  
بھاگ نہ جانا۔  
خان بابا نے خدشات سے بھرے الفاظ دہرائے۔  
وہ سنی ان سنی کر کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی اور ادھر ادھر  
نگاہیں گھماتی خان بابا کے کواٹر تک پہنچ گئی۔

کیا کروں بیٹی ..... صاحب غصے کا بڑا ظالم ہے ..... میں تو حیران ہوں  
ترے پر اس کا دل کیسے آگیا ..... وہ تو چھوٹی موٹی چیزیں پسند ہی نہیں کرتا۔  
خان بابا کو سوہنی کی صورت پر رحم بھی آگیا۔  
وہ کھڑی سسکیاں لیتی رہی۔  
اوپر سے بڑی بیگم صاحبہ آنے والی ہیں ..... پیٹر بابو اور صاحب لینے  
گئے ہیں۔

خان بابا نے کہا۔

بتاؤ خان بابا ..... اتنی بڑی زمین ہے ..... میرا کہاں ٹھکانہ ہے۔

وہ سسکتی ہوئی بولی۔

بابا میں کہاں جاؤں۔

اچھا ..... رونا ..... میرا دل دکھتا ہے۔

یہ کہہ کر خان بابا نے شیشوں والی واسکٹ سے کچھ تلاش کرنے لگا۔

یہ لے ..... میرے کواٹر کی چابی ..... ادھر درختوں کے پیچھے سے  
چھپ کر چلی جا اور تالا کھول کر آرام کر۔

بابا میں تو صاحب جی کے پاس جاؤں۔

وہ ایک دم بولی۔

اب صاحب جی نہ رکھنے کا بی بی تمہیں ..... تو ان کی اجازت کے

بغیر بھاگی کیوں۔

خان بابا نے غصے سے کہا۔

اچھا ..... بھاگنے کی اتنی بڑی سزا ملے ..... ادھر قبیلے والوں نے نکال

دیا اور ادھر سے صاحب جی نے۔

وہ خود سے بولی۔

ہاں ..... پکڑ چابی ..... عزت کی روٹی کھانی ہے تو چھپ کر گزارہ کر

’دیے میں پیٹر بابو سے بات کروں گا۔

سوہنی نے چابی پکڑ لی۔

شام پانچ بجے کا عمل ہو گا ..... بڑی بیگم صاحبہ بیگم نورالدین  
عظمت و وقار کی تصویر پیٹر اور بیدار بخت کے ہمراہ نور محل میں داخل  
ہوئیں۔ ان کی آمد پر نور محل کو نئی شان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بیگم  
نورالدین شاہی مزاج کی خاتون تھیں۔ اپنی عزت شان اور جاہ و جلال کے  
منانی انہیں کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ اچھی اور اونچی نسل کی چیز پسند کرتی تھیں۔  
اپنے مرتبے اور رتبے کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں۔ پیٹر اور بیدار بخت کے  
ساتھ قیمتی ساڑھی میں ملبوس ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

..... Very Good

وہ چاروں جانب دیکھ کر بولیں۔

دیکھ لیجئے ماما ..... ہے نا بالکل آپ کے مزاج کے مطابق۔

بیدار بخت نے کہا۔

بالکل ..... ہمیں معلوم تھا ہمارے بیٹے کو ہماری پسند کا علم ہے۔

وہ بڑے تفاخر سے بولیں۔

پیٹر نے چونک کر بیدار بخت کی طرف دیکھا۔

بیدار بخت نے سب کچھ جان کر آنکھیں جھپکیں اور پیٹر کو خاموش  
رہنے کو کہا۔

غضب ہو گیا ہے سرکار۔  
 کیا ہو گیا ہے ..... کھل کے بات کرو۔  
 پیٹر نے نکلتائی کی گرہ ڈھیل کی۔  
 جناب ..... وہ سوہنی پھر آگئی ہے۔  
 پھر آگئی ..... سوہنی ..... شمشیر کے پاس گئی تھی وہ۔  
 پیٹر چونک گیا۔  
 ان لوگوں نے اسے نکال دیا ..... وہ روتی ہوئی واپس آگئی۔  
 بوڑھے خان کو ترس آنے لگا۔  
 اوہو ..... Very Sad ..... اب بیدار بخت اسے بالکل نہیں رکھیں  
 گے بلکہ وہ تو سوہنی کو اپنے احساسات سے نکال چکے ہیں۔  
 پیٹر نے افسوس ظاہر کیا۔  
 اتنی جلدی تو کوئی دشمن کو بھی نہیں بھولتا۔  
 خان بابا نے کہا۔  
 تمہاری بات بھی درست ہے خان بابا ..... لیکن اس نے بھی اچھا  
 نہیں کیا۔  
 پیٹر بولا۔  
 کیا اچھا نہیں کیا۔  
 یہی ..... جب وہ اپنے گھر سے بھاگ آئی تھی ..... اس کی ماں اس  
 کی وجہ سے پاگل ہوئی ..... باپ موت کی نیند سو گیا ..... سارا گھرانہ تباہ ہو  
 گیا ..... وہ کیوں واپس گئی۔  
 چیچ چیچ ..... یہ کیا ہو گیا بچاری کے ساتھ۔  
 خان بابا کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔  
 اب وہ کہیں کی نہیں رہی ..... نہ ادھر کی اور نہ ادھر کی .....  
 صاحب بیدار بخت کو بھی نفرت ہو گئی ہے ..... تمہیں معلوم ہے کتنے چاؤ سے  
 شادی کی تھی ..... ان کی بیوی تھی سوہنی ..... محبت کرتے تھے۔

اور شاؤ پیٹر یہاں سب کام مکمل ہے۔  
 وہ بولیں۔  
 مکمل ہے بیگم صاحبہ۔  
 پیٹر مودب بولا۔  
 ہوں ..... اپنے ہر کام کی رپورٹ نور الدین صاحب کو ارسال کر  
 دینا کیونکہ وہ بھی چند ماہ کے بعد پاکستان آنا چاہتے ہیں۔  
 بہتر ہے بیگم صاحبہ۔  
 پیٹر نے کہا۔  
 حاضر ہو سکتا ہوں سرکار۔  
 خاناماں دروازے پر ہی بولا۔  
 بیگم نور الدین نے ٹینک سے نگاہیں اٹھائیں۔  
 پیٹر نے سر ہلایا۔  
 چائے میز پر لگا دی ہے جناب۔  
 خاناماں مودب بولا۔  
 چلو ..... ہم آرہے ہیں۔  
 بیدار بخت مسکرائے اور پیٹر نے اجازت دی۔

شب کے نو بج چکے تھے جوں ہی پیٹر اپنے کمرے میں داخل ہوا  
 خان بابا اندر داخل ہوا۔  
 خان بابا نے داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔  
 کیا بات ہے خان بابا۔  
 پیٹر پلٹ کر تذبذب کے عالم میں بولا۔

بابا اتنی دیر سے ..... خوف کے مارے میرا تو برا حال تھا۔  
وہ بولی۔

خان بابا نے کنڈی لگائی۔

تو نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ میں تمہیں اکیلا کیسے رکھ سکتا ہوں۔

وہ اندر چلا گیا۔ اس کے ساتھ سوہنی بھی چلی گئی۔

اب کیا کروں ..... کہاں جاؤں ..... میرا کون ہے ..... اس عمر میں  
تم مجھے کون رکھے گا۔

وہ افسردہ ہو گئی۔

دیکھ سوچنے دے مجھے ..... میں پیٹر بابو سے مل کر آ رہا ہوں .....  
کوئی تو حل نکل آئے گا۔

خان بابا نے پگڑی اتار کر بستر کے تکیے پر رکھی۔

بابا ..... میں یہاں سے نہیں جاؤں گی ..... مجھے محل میں نوکرانی  
رکھو ادو مگر یہاں سے نہ نکالو ..... بابا۔

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

ارے میرا بچہ ..... تو کیسی بات کرتا ہے ..... میں تمہیں نکالتا نہیں  
ہوں۔ پیٹر بابو سے مل کر ترا کوئی پکا بندوبست کروں گا۔

ہاں بابا ..... پیٹر بابو اچھا آدمی ہے ضرور کوئی حل نکال لے گا۔

تو اب سو جا ..... شاباش ..... ارے تو نے کچھ کھایا۔

ایک دم خان بابا اچھلا۔

کہاں سے کھاتی ..... میں تو رات سے بھوکی ہوں۔

وہ سسک اٹھی۔

اچھا میں تیرے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔

خان بابا جو تا پنن کر سیدھا بھاگتا ہوا نور محل کے کچن میں جا داخل  
ہوا۔ باورچی سو رہے تھے۔ فریق کھول کر ڈبل روٹی اور مکھن انڈے نکالے

پیٹر نے کوٹ اتار کر ایک طرف رکھا اور پریشان سا بیٹھ گیا۔

مجھے بھی بہت افسوس ہے پیٹر بابو ..... اب وہ میرے کواٹر میں ہے۔  
میں کیا کروں ..... اکیلا انسان ..... اس کی حفاظت کیسے کر سکتا ہوں۔

خان بابا مجبور نظر آ رہا تھا۔

تم ابھی سوہنی کو اپنے پاس رکھو ..... کسی وقت موقعہ دیکھ کر بات  
یکروں گا صاحب سے۔

پیٹر اجیتا سے بولے۔

ایک تو بیگم صاحبہ کی آمد پر سارا کھیل چوٹ ہو گیا۔

خان بابا بولا۔

کھیل تو کب کا چوٹ ہو گیا بابا ..... البتہ ہم سب زبردست الجھنوں  
کا شکار ہو گئے ہیں ..... بیدار بخت کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے ہم لوگ  
اس بات کو اگل بھی نہیں سکتے اگر اگلے ہیں تو ہم پر قیامت ٹوٹتی ہے۔

پیٹر نے کہا۔

کلاک نے شب کے گیارہ بجاد دیے۔

خان بابا بری طرح چونک گیا۔

اب مجھے جانا چاہیے سرکار ..... وہ اکیلی میرے کواٹر میں ہے۔

خان بابا کھڑا ہو گیا۔

ہاں ہاں جاؤ تم۔

پیٹر نے زور سے خود کو پلنگ پر گرا دیا اور آنکھیں بند کر لیں .....  
وہ بیدار بخت کی وجہ سے ایسی الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا جس کو سلجھانے کی  
کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ انسانیت کے ناطے ایک جوان لڑکی بے یار و مدد  
گار اکیلی نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ اگر اسے نکال دیا گیا تو وہ درندوں کا شکار  
ہو جائے گی۔ پیٹر نے آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر خان بابا تیز رفتاری سے اپنے کواٹر کی طرف چل پڑا۔ اس نے  
زور زور سے کنڈی ہلائی۔ ایک دو مرتبہ کھٹکھٹانے سے دروازہ کھل گیا۔

اور دبے قدموں واپس چلا گیا اور کنڈی ہلائی۔  
لے انڈے بنا لے.....

وہ اندر داخل ہوا۔ سوہنی نے کنڈی لگالی۔  
بابا اتنے انڈے اور مکھن.....  
وہ حیران رہ گئی۔

رکھ دے رکھ دے..... وہ چولہا جلا لے..... دیکھ دو انڈے مجھے  
بھی مل دے۔ سامنے گھی ہے..... چولہا بھی وہاں ہے۔  
اچھا۔

خان بابا تو اندر چلا گیا اور سوہنی نے دو انڈوں کو تل کر خان بابا کو  
پلیٹ میں ڈال کر دے دیا اور خود حسب منشا کھا کر لیٹ گئی۔ باقی سامان صحن  
میں رکھی جالی میں نکا دیا۔

(16)

نااہل کی تربیت گنبد پر اخروٹ رکھنے کے برابر ہے..... میں نے  
اسے انسان بنانا چاہا..... ہر آسائش دے کر اس کی زندگی میں ستارے بھر دینا  
چاہتا تھا لیکن ذرا سی غفلت اور میری حکم عدولی نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا  
دیا۔

بیدار بخت نے پیٹر سے کہا۔  
آپ اسے معاف نہیں کر سکتے۔  
نہیں اب سوال پیدا نہیں ہوتا..... گھٹیا قسم کے لوہے سے اچھی  
گوار کیسے بن سکتی ہے۔  
بیدار بخت نے آنکھیں بند کر لیں۔  
وہ آپ کی بیوی ہے..... آپ نے نکاح کیا ہے اس سے۔  
پیٹر بولا۔

میں مانتا ہوں۔ اس سے مجھے انحراف نہیں ہے۔  
پیٹر خاموش ہو گیا۔ بیدار بخت کے انداز میں معمولی سی بھی لچک  
نہیں تھی۔ وہ زیادہ اصرار کرنا نہیں چاہتا تھا..... اس سے معاملہ اور بگڑنے کا  
اندیشہ تھا۔ اس لیے خاموش کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔  
وہ میرے جانے کے بعد واپس آئی تھی۔  
بیدار بخت پھر بولے۔

آئی تھی..... لیکن خان بابا نے بھی اندر جانے سے روک دیا۔

ہیں۔ نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا تھا..... سوہنی کے حسن نے ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کیا..... اس نے اپنی اوقات کو فراموش نہیں کیا۔

بیدار بخت بہت ہی اداسی اور افسردہ نظر آ رہے تھے۔  
پیٹر خاموش تھا۔

اسے بلاؤ..... خود اس سے بات کریں گے۔  
بہتر سر۔

پیٹر نے کہا اور سامنے جاتے ملازم کو آواز دی۔  
جی پیٹر بابو۔

دیکھو یہاں بابا کے کواٹر میں ایک ملازمہ نوکری کے لیے آئی ہے.....  
اسے بلاؤ۔

پیٹر نے کہا۔

بہتر جناب۔

ملازم تیز رفتاری سے بھاگ گیا اور دھڑام سے دروازہ کھول دیا۔  
خان بابا کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ گرتے گرتے بچا اور سوہنی سسم کردیوار کے ساتھ لگ گئی۔

خانہ خراب کے بچے تو ادھر کس واسطے آیا ہے..... تجھے معلوم نہیں ہے یہاں ایک خاتون ہے۔

خان بابا نے کہا۔

بابا..... صاحب جی بلا رہے ہیں..... سوہنی کو۔

ہیں..... سوہنی کو بلا رہے ہیں۔ ملازم جانتا تھا۔

سوہنی خاموش بیٹھی رہی۔

اور تو کسی کو علم نہیں ہوا۔

خان بابا نے حیرت سے کہا۔

سب کو پتہ ہے خان بابا..... لیکن زبان جلعے جو بات کریں..... تو بہ  
تو بہ..... اور جو کھال ادھیڑی جائے گی وہ علیحدہ۔

پیٹر بولا۔

پھر.....

بیدار بخت چونکے۔

خان بابا نے بہت روکا..... لیکن وہ نہ ٹلی..... جاتی بھی کہاں۔  
اوڈوں نے بھی اسے نکال دیا تھا۔ باپ اس کا فوت ہو چکا تھا۔ ماں پاگل.....  
خان بابا کو رحم آگیا..... اس نے اپنے کواٹر میں جگہ دے دی۔  
پیٹر نے مختصر سی کہانی بیان کر دی۔

اب وہ کہاں ہے۔

اگر آپ کی طبع پر گراں نہ گزرے تو میرے ہی اہلکار پر وہ خان بابا کے کواٹر میں ہے۔ پیٹر خوفزدہ ہو گیا۔

اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ہمارے نزدیک صرف ایک معمولی ملازمہ کی ہے..... بے شک وہ ہمارے نکاح میں آچکی ہے۔

بیدار بخت دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جوڑ کر کچھ سوچنے لگے۔

پیٹر نے غور سے بیدار بخت کی طرف دیکھا۔

ہم سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے پیٹر..... ہم تو گھوڑا اور کتا خریدتے وقت بھی نسل کا خیال کرتے تھے..... ایک بیوی کے لیے ہم نے کیا کیا۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

بیدار بخت کے انداز میں پچھتاوے کا زہر اگل رہا تھا۔

یہ تفریق دنیا میں ہے سر..... اب اس کو تحفظ کی ضرورت ہے۔

پیٹر نے کہا۔

ٹھیک ہے چند روز میں روپی آنے والی ہے..... وہ لاہور ٹھہر گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ ماما اس کے سامنے کوئی مسئلہ گڑبڑ ہو..... میرے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچنی چاہئے..... ہم پہلے ہی یہ قدم اٹھا کر بہت پچھتا رہے

خادم خوفزدہ سا کانوں کا ہاتھ لگا کر بولا۔  
شباباش میرا بچہ ..... بیگم صاحبہ اور وہ روٹی بی بی جو آنے والی ہے  
ان کو تو پتہ بھی نہیں چلنا چاہیے۔  
نہیں نہیں ..... خان بابا ..... تم اب سوہنی کو ہمارے ساتھ صاحب  
کے پاس بھیج دو۔

خادم نے کہا۔  
ٹھیک ہے ..... جا بیٹی ..... اور دیکھ صاحب کی کسی بات کا جواب  
سوچ سمجھ کر دینا ..... تمہیں معلوم تو ہو گیا ہو گا کہ صاحب جہاں سننے کا  
عادی نہیں ہے۔

خان بابا نے تاکید کی۔  
ٹھیک ہے خان بابا ..... ہم کچھ نہ کہیں گے۔  
وہ خادم کے ساتھ چل دی۔  
خادم زینے پر ہی چھوڑ کر واپس چلا گیا۔  
وہ بڑ آمدے کے زینے پر کھڑی ایک دم ٹھسکی۔  
بیدار بخت تنہا بیٹھے تھے۔  
سلام صاحب جی۔  
سوہنی نے کہا۔  
پیشانی پر لاتعداد سلوٹیس ڈال کر بیدار بخت نے اپنی مجرم سوہنی کو  
دیکھا۔

(ایسا ظالم روپ بھی ہے صاحب جی کا)۔  
وہ دل میں سوچنے لگی۔  
تمہیں یہاں ایک ملازمہ کی حیثیت سے رکھا جا رہا ہے ..... اور اس  
حد سے بڑھنے کی کوشش مت کرنا ..... ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔  
بیدار بخت انتہائی تلخ اور زہریلے انداز میں بولے۔  
صاحب جی ..... ہمارا اتنا بڑا قصور ہے - معاف۔

سوہنی نے ایک دم سے کہا۔  
بکواس بند کرو ..... بس کام سے مطلب رکھو۔  
وہ گرج کر بولے۔  
صاحب جی ..... ہمارا قصور معاف کر دیں ..... آپ کی ناراضگی  
میں دکھ دیتی ہے۔  
وہ گداز آواز میں بولی۔  
ہم نے تمہیں امان دے دی ..... صرف ایک بندھن کے لیے .....  
ورنہ تم جیسی خود سزا کھڑکیوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔  
وہ سک اٹھی۔  
یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا ..... اور اپنے آپ کو ملازمہ  
ذیل کرنا۔ ہم نے پہلے ہی تمہارے لیے بڑی نرمی اختیار کر رکھی ہے۔  
صاحب جی آپ کو ہم سے محبت تھی۔  
سوہنی نے کہا۔  
اب نفرت ہے ..... شدید نفرت۔  
بیدار نے چراموڑ لیا۔  
وہ خاموش سنتی رہی۔  
خان بابا شریف بھی ہے اور تنہا بھی۔ اس کے ساتھ رہنا چاہو تو بہتر  
ہے ورنہ کسی عورت ملازمہ کے ساتھ رہ لو۔  
وہ کچھ سوچ کر بولے۔  
نہیں صاحب جی ..... خان بابا ہی ٹھیک ہے۔  
سوہنی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔  
یہ تمہاری اپنی مرضی ہے۔  
وہ بولے۔  
وہ جانے لگی۔  
سنو۔



جی صاحب جی۔

اپنی موجودہ حیثیت میں رہنا..... کسی تعلق کو ظاہر کرنے کی کوشش مت کرنا۔ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔

مت کرنا۔ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔

بیدار بخت کا انداز ظالمانہ تھا۔

نہیں صاحب جی ..... ہم کسی سے کچھ نہ کہیں گے ..... بس ایک نوکرانی۔

وہ چل دی۔

اور انہوں نے منہ پھیر لیا۔

..... پھر وہ

نور محل میں بطور ملازمہ کام کرنے لگی..... کئی ملازم عورتیں نفرت کرتیں اور کئی اس سے ہمدردی کرتیں۔ سلسلہ جوں کا توں چلتا رہا۔ اس نے مستقل خان بابا کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سے خان بابا کو یہ سہولت ہو گئی تھی کہ وقت بے وقت چائے مل جاتی اور وقت ضرورت کھانا بھی مل جاتا لیکن سوہنی کو خان بابا کے روپ میں ایک مشفق، ہمدرد، غمگشا باپ مل گیا تھا۔ وہ اسے اپنی بیٹی ہی خیال کرتا اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا۔

بیگم نور الدین نے اس کو خانساں کے ساتھ کچن میں لگا دیا تھا۔

جگو بابا۔

بیگم نور الدین نے خانساں کو آواز دی۔

جی بیگم صاحبہ۔

خانماں لبے لبے ڈگ بھرتا ان کے پاس آ گیا۔ وہ اس وقت پھولوں کے کج کے پاس بیٹھیں اخبار سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ بیدار بننے اور پیٹر دونوں ہی موجود نہ تھے اور اس وقت صبح دس کا وقت تھا۔

چند دن ہوئے پیٹر نئی ملازمہ لایا ہے۔

جی ہاں جی ہاں ..... وہ خان کی رشتہ دار.....

خانساں ڈاڑھی کھجاتا ہوا بولا۔

جو بھی ہے ..... وہ کیسی ہے۔

لڑکی ہے جی۔

وہ ہنس دیا۔

او ہو ..... لڑکی تو ہے ..... میرا مطلب ہے کہ کھانا پکانا کچھ جانتی ہے  
بھی کہ نہیں۔

بیگم صاحبہ، کل صاحب کے لیے چائے بنا کر لے گئی تھی..... اچھی بنالی تھی۔

خانساماں بولا۔

اچھا، خیر..... تم کچن میں اکیلے ہو..... اسے اپنے ساتھ رکھو اور  
 طریقہ سکھاؤ..... وہ بطور ہیلپر کام کرے گی تمہارے ساتھ۔

طریقہ سکھاؤ ..... وہ بطور ہیپلر کام کرے گی تمہارے ساتھ۔

بیگم نور الدین نے اخبار کا دوسرا ورق الٹ لیا۔

بہتر سرکار..... وہ آ رہی ہے..... بیگم صاحبہ۔

جگو بابا نے دیکھتے ہی پکارا۔

اے لڑکی..... جلدی آؤ۔

سوہنی نے پلٹ کر دیکھا۔ پھولوں کے گل دستے پکڑے وہ بیگم نور الدین کے پاس چلی آئی۔

نور الدین کے پاس چلی آئی۔

سلام بیگم صاحبہ۔

وہ مودب بولی۔

.....ہوں

وہ اخبار کو پرے ہٹا کر سوہنی کے سرایا کو بڑے پرکھنے والے انداز سے دیکھنے لگیں۔ حیرت زدہ سی اس کے سرایا کو گھورا۔

سے دیکھنے لگیں۔ حیرت زدہ سی اس کے سرایا کو گھورا۔

کیا نام ہے تمہارا۔

بیگم نور الدین کے لہجے میں حد درجہ جلال پایا جاتا تھا۔

سوہنی ..... میرا نام سوہنی ہے جی۔

رہی کہ ایک دم سے کلاک نے ٹن سے بارہ بجائے۔  
اور وہ بری طرح تڑپ اٹھی ..... اور دھم سے بگو بابا لدھا پھندا  
داخل ہوا۔

تو یہاں بیٹھی ہے ..... لے پکڑ سبزی گوشت ، قیمہ اور انڈے۔  
وہ تھیلے اس کے سامنے رکھتے ہوا بولا۔  
بگو بابا یہ سارا کچھ کتنے دنوں کے لیے ہے۔  
وہ حیران حیران پھٹی پھٹی آنکھوں سے چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔  
اری پگلی یہ امیر لوگ ہیں ..... صرف ایک دن کے لیے ہے .....  
ایک دن میں کئی کئی ڈشیں بناتا ہوں میں۔  
بگو بابا قیمہ فریج میں رکھتے ہوئے بولا۔  
اگر سالن بچ جائے تو۔  
وہ سبزی نکال کر بولی۔  
ایک مولیٰ کو دیکھ کر اس کا دل للچایا۔  
کھالے کھالے ..... گھبرانا ..... اس کی کوئی ممانت نہیں۔  
وہ ہنسی اور چھوٹی سی مولیٰ چبا چبا کر کھانے لگی۔  
روٹی کی یہاں کوئی کمی نہیں ہے ، جو بچ جاتا ہے وہ نوکروں کے لیے  
..... دل کے سخی ہیں یہ لوگ۔  
اچھا ..... مجھے کھانا پکانا سب سکھا دے بابا ..... تو پھر بیٹھا کرنا اور میں  
پکایا کروں گی۔

وہ ایک نوکری میں سبزی رکھتے ہوئے بولی۔  
ٹھیک ہے ٹھیک ہے ..... تو پہلے سبزی بنا لے ، میں قیمہ بنا لوں۔  
بگو بابا مصالحہ تیار کرتے ہوئے بولا۔  
ٹھیک ہے بگو بابا ..... جو تو کسے گا وہی ہو گا۔

سوہنی ایک دم چونک کر لجا کر بولی۔  
سب سے پہلے اس لباس کو تبدیل کرو ..... یہاں یہ گھاگرے نہر  
چلیں گے۔

وہ نفرت زدہ سامنہ بنا کر بولیں۔  
جی ..... میرے پاس اور کپڑے نہیں ہیں جی۔  
وہ ندامت سے بولی۔  
ٹھیک ہے ، شام کو بگو بابا سے چند سوٹ شلوار قمیض لے لینا .....  
سمجھی۔

وہ بگو بابا کی طرف دیکھ کر بولیں۔  
جی ہاں بیگم صاحبہ ..... میں اس کو دے دوں گا۔  
بگو بابا نے کہا۔  
تم جاؤ۔  
بیگم نور الدین نے کہا۔  
اور بگو بابا تیز رفتاری سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔  
ہم تمہیں بگو بابا کے ساتھ کچن میں لگا رہے ہیں ..... اس کے  
ساتھ کام کرنا۔

بہتر جناب۔

وہ بولی۔

جاؤ کچن میں۔

وہ سیدھی کچن میں چل دی۔

اوتی اللہ ..... یہ کچن ہے .....

وہ کچن کی کشادگی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حالانکہ ایک دن صاحب جی  
کے لیے چائے لے گئی تھی اس وقت تو دیکھا نہیں تھا۔

وہ ادھر ادھر دیواروں کو بغور دیکھ کر بولی۔ وہ ایک سٹول پر بیٹھ  
گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔ جب کچھ نہ پتہ چلا تو بیٹھی

ہاں امی چھٹی ہے ..... بس ذرا ایک سیلی کے ہاں جانا ہے۔  
وہ اچانک ہی غیر شعوری طور پر کہہ گئی۔  
کون سی سیلی ..... نام کیا ہے ..... میں سب سیلیوں کو جانتی

ہوں۔

بیگم صبا زمان نے کہا۔  
امی جان نوشی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے خبر لینے جا رہی  
ہوں۔ کالج کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا۔

ٹھیک ہے۔ اکیلی مت جاؤ ..... شمشیر کو لے جاؤ۔  
بیگم زمان نے کہا۔

شمشیر کو کس لیے ..... میں گاڑی نہیں چلا سکتی۔ وہ جھنجھلا کر بولی۔  
کوئی بات نہیں میری جان ..... ویسے شمشیر اب گاڑی چلا سکتا ہے  
..... ذہن لڑکا ہے جلدی سیکھ گیا ہے۔

لیکن طاہرہ کسی صورت بھی شمشیر کو ساتھ لے جانے پر راضی نہ  
ہوئی۔

اندر آتے آتے وہ ایک دم ٹھٹھک گیا۔ پردے کی اوٹ میں اس  
نے انکار اور اصرار کی جنگ سن لی تھی۔

ضرور کوئی بات ہے ..... طاہرہ بی بی کا کوئی چکر ہے۔  
وہ اندر داخل ہوا۔

شمشیر۔

بیگم زمان نے کہا۔

جی بیگم صاحبہ۔

وہ مودب جھک کر بولا۔

طاہرہ بی بی کے ساتھ جاؤ اور ساتھ ہی لے کر آنا۔

بہت بہتر بیگم صاحبہ۔

وہ طاہرہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

(17)

وہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتا اور جڑتا رہا۔ اس کے آنسو شریر بچوں  
طرح اس کی آنکھوں سے کھیلنے رہے۔ محبت کا عذاب اسکی پوری جان پر  
سرایت ہو گیا تھا۔ اب اس عذاب کے سائبان کے تلے اس نے زندہ  
گزارنی تھی۔ وہ جتنا سوہنی کو فراموش کرنے کی کوشش کرتا اتنا ہی وہ اس  
کے دل کے شیشے میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ جیراں کے مرتے ہی آخر  
رسومات پوری کرنے کے بعد اس نے کراچی جیسے بڑے شہر کا رخ کیا۔ آ  
اتنی لمبی زمین ہے کہیں تو سہارا خداوند کریم نے پیدا کرنا ہی تھا۔ وہ نور  
کو چھوڑ آیا تھا۔ نور محل کی یاد دل میں بسائے اس نے ایک سیٹھ کے  
ملازمت اختیار کر لی۔ پیڑ کے ساتھ رہ کر وہ بڑے لوگوں کے طور طریقے  
سارے جان چکا تھا۔ نرم مزاج تو وہ پہلے بہت تھا۔ اب اس کی شائستگی اور  
مودب انداز کو دیکھ کر سیٹھ اور اس کی بیگم بہت خوش تھے۔ سیٹھ کی ایک  
بیٹی طاہرہ جو کالج میں پڑھتی تھی اور ایک بیٹا اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گیا  
تھا۔ سیٹھ زمان اور بیگم صبا بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ بیٹے کو ہر پختہ  
فون کرنا اور اس کی خیریت طلب کرنا ان کا معمول تھا اور بیٹی طاہرہ تو دونوں  
کی آنکھوں کا نور تھی۔

اس وقت صبح گیارہ کا وقت ہے۔ اتوار کا دن ہے اس لیے تعطیل  
ہے۔ طاہرہ تیار ہو کر سیڑھیاں جلدی جلدی اترتی ہال میں آ گئی۔  
آج کہاں ..... چھٹی ہے بیٹی۔

اچھا اچھا ..... ڈرائیور ہو ..... جاؤ پھر ..... میں خود طاہرہ کو کوٹھی پہنچا دوں گا۔

نوجوان نے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بال سیدھے کیے۔  
میں کھڑا ہوں جی ..... طاہرہ بی بی کو لے کر ہی جاؤں گا۔  
وہ اڑ گیا۔

ارے بھئی میں کل سے کراچی سے باہر گیا ہوا تھا ..... طاہرہ ہماری عزیز ہے۔ میں چھوڑ آؤں گا۔ تم کتنے وقت کھڑے رہو گے ..... لوگ کیا کہیں گے ..... پھر میری والدہ تمہیں علم ہے کتنی محبت کرتی ہیں طاہرہ سے ..... شام سے پہلے نہیں جانے دیں گی۔  
وہ جلدی جلدی بولتا رہا۔  
آپ طاہرہ بی بی سے بات کروادیں۔  
شمشیر نے کہا۔

ٹھیک ہے ..... نوجوان نے ایک دم گیٹ کے اندر قدم رکھا تو طاہرہ باہر آگئی۔

خالد ..... تم اب آئے ہو ..... نوشی کی طبیعت اس قدر خراب ہے ..... ڈاکٹر کو لے آؤ اور ہاں پہلے اماں کی بات سنو۔  
خالد طاہرہ کو معنی خیز انداز میں گھورتا ہوا اندر چلا گیا۔  
شمشیر .....  
جی بی بی جی .....  
دیکھو اس وقت تم جاؤ ..... شام کو مجھے لے جانا۔  
وہ طاہرہ کو گھورتا رہا۔  
میں کہہ رہی ہوں جاؤ .....  
وہ زور سے بولی۔  
ٹھیک ہے طاہرہ بی بی .....  
وہ گاڑی لے کر گھر واپس لوٹ آیا۔

چلو .....  
وہ خشمگین انداز میں پلٹی اور شمشیر کے آگے آگے بڑی تیز رفتاری سے چل دی۔  
نہیں۔

شمشیر نے سنیرنگ کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا۔  
تم گاڑی چلاؤ۔

وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔  
اور شمشیر نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔  
بیس منٹ تک گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی رہی پھر ایک دو بازار گھومنے کے بعد ایک دم چونک کر طاہرہ نے ہاتھ اٹھایا۔  
شمشیر روکو ..... روکو۔

اور شمشیر نے ایک دم بریک لگا دی۔  
طاہرہ ایک گھر کے سامنے اتر گئی۔  
طاہرہ بی بی دستک میں دے دوں۔  
وہ باہر نکل کر بولا۔

نہیں ..... شاید دروازہ کھلا ہے۔  
وہ بند گیٹ کی طرف چل دی اور شمشیر گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا رہا۔

طاہرہ اندر چلی گئی اور وہ وہیں کھڑا رہا۔  
اچانک اس نے پلٹ کر دیکھا۔  
تم کون ہو بھئی۔

ایک نوجوان بے ترتیب لباس میں رکشے سے اتر کر پاس آیا۔  
مگر .....  
سے اٹے ہوئے بال۔

میں طاہرہ بی بی کا ملازم ہوں۔  
شمشیر نے اس کا سراپا دیکھا۔

طاہرہ ہنس کر بولی۔  
 پھر بھی ..... جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بڑی مشکل سے بھیجا  
 تھا۔  
 اماں چائے نہیں ملے گی۔  
 خالد نے کہا۔  
 صدقے جاؤں ..... ابھی لائی۔  
 وہ اٹھی۔  
 بیٹھیں آئی ..... بیٹھیں نا ..... چائے بن جائے گی۔  
 وہ حمیدہ بیگم کو پکڑ کر بولی۔  
 ابھی آئی تم لوگ باتیں کرو۔  
 حمیدہ بیگم کچن کی طرف چل دیں۔  
 ادھر ادھر دیکھ کر خالد نے طاہرہ کی طرف دیکھا۔  
 طاہرہ نے پرس سے کچھ پیسے نکالے۔  
 یہ لو ..... میں جیب خرچ جمع کرتی رہی تمہارے لیے ..... کبھی ابو  
 سے لے لے اور کبھی ان سے۔  
 وہ ایک پیٹ خالد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔  
 کتنے ہیں۔  
 خالد نے پیٹ پکڑ لیا۔  
 میرا خیال ہے بیس ہزار تو ہوں گے۔  
 طاہرہ نے کہا۔  
 ٹھیک ہے۔  
 خالد نے اٹھ کر دیوار سے لٹکے ہوئے کوٹ میں پیٹ ڈال لیا۔  
 کل کہاں گئے تھے۔  
 طاہرہ نے کہا۔  
 جامداد کے سلسلے میں حیدر آباد گیا تھا ..... تمہیں معلوم تو ہے .....

اوہو ..... طاہرہ بی بی پھنسی ہوئی لگتی ہے۔ دولت مند دیکھ کر اس  
 کھٹو نے اپنے اڈے لگا لیا ہے۔ چرے بشرے سے تو ڈھنگ کا آدمی نہیں لگتا  
 ..... کوئی کام وام بھی شاید نہیں کرتا۔  
 وہ ایک دم پورچ میں گاڑی لے گیا۔

میں صدقے میں داری ..... میری بیٹی آئی ہے۔  
 خالد کی ماں حمیدہ بیگم برآمدے سے اٹھ کر طاہرہ کے پاس صحن میں  
 آگئی۔  
 آداب آئی۔  
 جیتی رہو ..... بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔  
 وہ واپس طاہرہ کو برآمدے میں لے گئیں جہاں آرام کرسیاں بچھی  
 ہوئی تھیں۔

اماں اب بہت سی پابندیاں لگ گئی ہیں طاہرہ پر۔  
 خالد رومال سے چہرہ صاف کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔  
 کیسی پابندی ..... دراصل کالج کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا۔  
 وہ ہنس کر بولی۔  
 سنو ..... یہ ڈرائیور نیا رکھا ہے سینٹھ صاحب نے۔  
 ہاں چند دن ہوئے ہیں۔ سارے کام ہی کر لیتا ہے۔  
 طاہرہ نے کہا۔  
 بوا چمڑیں ہے ..... ذرا بیچ کر رہنا ..... مجھے ایک آنکھ نہیں اچھا لگا۔  
 خالد نے نفرت کا اظہار کیا۔  
 ملازم آخر ملازم ہے۔ اچھا کیا برا کیا۔

کروڑوں کی جائداد ہے جو ہمارا سوتلا چچا سنبھال کر بیٹھا ہوا ہے۔  
وہ ماں کو دیکھ کر بولا۔

میں نے ہزار مرتبہ کہا ہے کہ مقدمے بازی سے باز آ جاؤ۔ جتنی  
جائداد تھی وہ بھی فروخت کر کے مقدمے میں لگا دی ..... ابھی تک کوئی فیصلہ  
نہیں ہو رہا ..... کئی باغات اور کوٹھیاں وہ سنبھال کر بیٹھا ہوا ہے۔  
حمیدہ بیگم نے ٹرے درمیانی میز پر رکھی۔ وہ شاطر عورت تھی۔

طاہرہ خاموش رہی۔  
دیکھو نا بیٹی کیا ضرورت ہے اتنا پیسہ ضائع کرنے کی ..... اپنا گھر بیچ کر  
لگا دیا۔ اب کرائے پر دھکے کھا رہے ہیں ..... کاش .....  
وہ آنکھیں صاف کرنے لگی۔  
آپ پریشان نہ ہوں آنٹی ..... آپ کا حصہ تو ملے گا ہی آپ کو  
..... کسی کا حق کوئی ہضم نہیں کر سکتا۔  
طاہرہ نے دلاسا دیا۔

بیٹی وہ بڑا اثر و رسوخ والا ہے ..... اتنا بڑا وکیل کیا ہے طاہرہ ہے  
اس کی فیس بھی بہت ہے۔  
وہ درد بھری آواز میں بولیں۔  
خالد نے طاہرہ کی طرف خالی معصوم نظروں سے دیکھا۔  
میں اور کوشش کروں گی ..... اس عید پر خاصی عیدی اکٹھی ہو  
جائے گی۔

وہ ہنس دی۔  
تینوں مل کر چائے پینے لگے۔  
شام ہوتے ہی گیٹ زور زور سے بجنے لگا۔  
وہ تمہارا ڈرائیور آ گیا ہے ..... وقت کا بڑا پابند نظر آتا ہے۔  
خالد نے کہا۔  
اب کب ملو گی جانم۔

خالد نے دیکھا حمیدہ بیگم برتن اٹھا کر لے گئی تھی۔  
کچھ دن لگ جائیں گے ..... انتظار کرنا۔

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔  
تمہارا انتظار تو میں تا قیامت کروں گا ..... تم میری پہلی اور آخری  
محبت ہو۔

خالد بڑی اپنائیت سے دیکھ کر بولا۔  
وہ مسکراتی ہوئی گیٹ کے باہر آ گئی۔  
بائے۔

وہ گاڑی کے قریب جا کر بولی۔  
چلو بی بی۔

شمشیر نے کہا اور خالد کو گھورا۔  
وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔  
اور شمشیر نے گاڑی اشارت کردی۔  
چلو۔

چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ وہ بیٹھتے ہی بولی۔  
گاڑی نے سپیڈ پکڑی اور خالد واپس گھر میں داخل ہو گیا۔  
طاہرہ بی بی۔

وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔  
کیا بات ہے۔

طاہرہ نے کہا۔

یہ کون لوگ ہیں ..... یعنی کہ یہ جو کھڑے تھے آپ کے پاس۔  
تمہیں اس سے مطلب ..... جو کوئی بھی ہو۔

میں مالک کا نمک خوار ہوں طاہرہ بی بی ..... برا نہیں چاہوں گا۔  
گاڑی پورچ میں کھڑی ہوئی۔

طاہرہ باہر نکلی۔

شمشیر داخل ہو کر بولا۔

اسے دیکھ کر طاہرہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

کہاں۔

بیگم زمان چونک گئیں۔

صاحب سیٹھ بختاور سے ملنے گئے ہیں۔ اس وقت آنے کا حکم دیا تھا

انہوں نے۔

شمشیر نے کہا۔

ٹھیک ہے جاؤ۔

بیگم زمان نے کہا۔

شمشیر گاڑی کی رفتار بڑھا رہا تھا۔ موسم اچانک خطرناک ہو چکا تھا۔

آندھی تیز ہو چکی تھی۔ رفتار کے ساتھ اس کی گاڑی خود بخود تارکول کی سیاہ سڑک پر پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تیز ہوا اسے کہیں سے کہیں لے جا رہی تھی۔

گیٹ سے گزر کر اس نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی۔ زینہ چڑھ کر وہ برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ گرینڈ پارٹی تھی۔ قہقہوں کی برسات ہو رہی تھی۔ کئی لوگ جا رہے تھے۔

وہ ایک دم ٹھٹھک گیا۔

بیدار بخت نوجوان لڑکی کے بازو میں بازو ڈال کر باہر آئے۔

یہ سوہنی تو نہیں ہے۔

وہ آنکھیں ملتا رہا ..... جیسے بینائی ساتھ چھوڑ گئی ہو ..... وہ دور تک

دیکھتا رہا ..... واقعی وہ سوہنی نہ تھی۔

کیا بیدار بخت نے اور شادی کر لی ہے۔

وہ کھڑا سوچتا رہا ..... نفرت کا لاوا ابل کر اس کی رگ و پے کو جلا

گیا۔ سوہنی کے ہوتے یہ دوسری عورت سے کیوں رابطہ رکھے ہے ..... وہ تو

کوہنی سے لازوال محبت کرتا تھا ..... اس کی تکلیف دیکھنا اس کے بس کی

شمشیر علی۔

طاہرہ باہر نکل کر بولی۔ شمشیر ابھی گاڑی کے اندر ہی بیٹھا تھا۔

جی بی بی۔

شمشیر نے سیرنگ پر بازو رکھے۔

امی سے بات نہ کرنا ..... میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔

جی .....

وہ چونک کر نگاہیں اٹھا کر بولا۔

طاہرہ بیٹی ..... بڑی دیر لگا دی۔

برآمدے کا زینہ اترتے بیگم زمان نے کہا۔

شمشیر گاڑی گیراج میں لے گیا۔

جی امی نوشی بہت بیمار تھی ..... اس نے روک لیا ..... وہ تو شمشیر

لینے آگیا ورنہ آئی تو آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔

طاہرہ نے بڑی صفائی سے جھوٹ کا سہارا لیا۔

اچھا کیا بیٹی ..... تمہارے ابو تمہارا زیادہ دیر باہر رہنا پسند نہیں

کرتے۔

بیگم زمان نے کہا۔

ابو ابھی تک دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں ..... کراچی میں رہ کر

بھی .....

طاہرہ بیگم زمان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔

تمہاری بات بھی درست ہے بیٹی ..... دراصل ہماری جڑیں سادگی

اور شرافت سے بندھی ہیں ..... ہم کتنے بھی اپنے آپ کو ایڈوانس خیال

کریں ..... لیکن ہمارے اندر کی سادگی کہیں نہیں جائے گی۔ ہم وہی رہیں

گے پینڈو .....

دونوں ماں بیٹی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔

بیگم صاحب مجھے اجازت ہے۔

گٹ میں داخل ہوئی۔  
پورچ میں روک کر شمشیر نے دروازہ کھولا۔  
سینھ باہر نکلے اور شمشیر گاڑی گیراج میں لے گیا۔

بات نہ تھی۔ اس نے نور محل ایسا چھوڑا کہ پلٹ کر خبر نہ لی..... کہ سوہنی  
واپس گئی تھی۔ ان لوگوں نے قبول کیا تھا کہ نہیں۔ کہیں وہ محبت کے  
ویرانوں میں بھٹکتی تو نہیں پھر رہی۔  
شمشیر علی۔

باہر آکر سینھ زمان نے آواز دی۔  
پھر دوسری مرتبہ پکارا۔  
شمشیر۔

جی صاحب۔

وہ بری طرح چونک گیا..... ہڑبوا کر گاڑی کی طرف بھاگا۔  
ارے بھی کیا سوچ رہے ہو۔

وہ قریب آ کر شفقت سے بولے۔

کچھ نہیں جناب..... بس پچھلی یاد آ جاتی ہیں کبھی کبھی۔  
جلدی سے شمشیر نے دروازہ کھولا۔

سینھ زمان بیٹھ گئے۔

کوئی فائدہ نہیں شمشیر علی..... ماضی بھول جاؤ..... ورنہ حال میں  
دکھ ہو گا۔

وہ پشت کی جانب سے شمشیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

کیسے بھول جاؤں سینھ صاحب..... ماضی ایک عذاب ہے جو جینے

نہیں دیتا۔

وہ گردن موڑ کر سینھ کی طرف دیکھ کر بولا جیسے رحم کی بھیک مانگ

رہا ہو۔

Relakes ریلیکس..... حوصلہ رکھو۔

سینھ بڑے شفیق انداز میں بولے۔

کچھ وقت یوں ہی خاموشی سے کٹ گیا۔

سینھ بھی حسب عادت خاموش رہے۔ تھوڑے وقت کے بعد گاڑی



بگو بابا بولا۔

وہ جو صاحب کی لاڈلی ..... وہ جینے نہیں دیتی۔

وہ روتے بلکتے بچے کی طرح بولی۔

اچھا روٹی بی بی ..... ان کا غصہ تو ناک پر دھرا رہتا ہے۔

بگو بابا بولا۔

وہ خاموش بیٹھی سکتی رہی۔

لے تو بھی چائے پی لے ..... دل ٹھیک ہو جائے گا میری بیٹی کا۔

وہ کپ بنا کر اسے دے کر بولا۔

تم کتنے اچھے ہو بابا۔

وہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔

اللہ کا نام اچھا ہے ..... آئندہ سے میں چائے لے کر جایا کروں گا۔

وہ مصالحہ بنا کر سبزی ڈالنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ چائے پیتی رہی ..... آخری گھونٹ تک وہ نہ جانے

کہاں پہنچ گئی تھی۔ شروع سے اب تک کے تمام واقعات ایک فلم کی

طرح اس کی آنکھوں میں گھومنے لگے تھے۔ وہ باپ کے پاس لاکھوں کی تھی۔

کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ قبیلے کے نوجوان اس سے

بات کرتے خوف کھاتے تھے اور اب وہ سوہنی جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی

فی اسے ہر کوئی راہ چلتے ٹھوکروں سے اڑا جاتا تھا۔ وہ بیدار بخت جسے

ہاری دنیا چھوڑ کر دل سے لگایا تھا ..... قبیلے والوں کی مخالفت مول لی .....

باپ اسی غم میں مر گیا۔ ماں پاگل ہو گئی ..... کیا کیا سبز باغ دکھائے اس کو

..... اب اس کی زندگی ایک تینکے کے برابر بھی نہیں رہی۔ بیدار بخت اس کا

ٹوہر تھا لیکن اپنی زبان سے وہ یہ اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اب ایک

تیر ملازمہ تھی ..... ایک دن۔

دوسرا دن۔

(18)

سناٹا ہوا تھپڑ سوہنی کے پھول سے گال پر پڑا۔

بری طرح تڑپ کر سوہنی نے ایک ہاتھ سے اپنا رخسار مسل ڈالا۔

روٹی چینتی ہوئی کھڑی ہو گئی ..... گرم گرم چائے اس کی قہقہ

ساڑھی پر گر گئی تھی جس کی ذمہ داری اس وقت سوہنی پر عائد ہوتی تھی۔

حالانکہ پیٹرا اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔

کتنے بد سلیقہ نوکر ہیں آپ کے ..... چائے بنانا تو کیا پکڑانے کا سلیقہ

نہیں ہے۔

وہ چینتی ہوئی اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

بیدار بخت نے صرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

تم جاؤ۔

پیٹرنے کھڑی سوہنی کو کہا۔

وہ ست روی سے کچن کی طرف بھاگ گئی اور سٹول پر بیٹھ کر

سک سک کر رونے لگی۔

کیا ہوا۔

بگو بابا سبزی دھو کر سیدھا ہوا۔

وہ ہی جو ہر روز ہوتا ہے۔

وہ روتے روتے بولی۔

پھر صاحب نے کچھ کہا۔

وہ د لگیر آواز میں بولی۔

تمہارا گناہ اتنا سنگین ہے، جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔  
وہ طیش میں بولے۔

کیا ہم اتنے برے ہیں صاحب جی کہ ہمارے گناہ معاف بھی نہیں  
کیے جاسکتے۔

وہ سک سک کر بولی۔

ہاں تمہارا گناہ قابل معافی نہیں ..... سوچو تم نے کیا کیا ہے۔  
وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

صاحب جی ..... ہمیں اپنے قدموں سے دور نہ کیجئے۔

وہ جھکی۔

چلی جاؤ یہاں سے ..... ہم نے تمہیں جھونپڑی سے اٹھا کر محل میں  
سجانا چاہا لیکن تم نے اپنی اصل کو نہیں چھوڑا ..... اپنی اوقات کو فراموش  
نہیں کیا تم نے۔

بیدار بخت نے منہ پھیر لیا۔

صاحب جی ..... ہم ساری عمر غلامی کر لیں گے لیکن یوں ہم سے  
منہ نہ پھیرے۔

وہ رودی .....

آپ کی بے رخی جینے نہیں دیتی ہمیں۔

اس وقت شب تنہائی ..... تمہارا وجود ہمیں کھٹک رہا ہے۔ اس  
لیے جتنی جلدی ہو سکتا ہے چلی جاؤ ..... ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔

وہ انگلی کے اشارے سے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولے۔  
وہ سسکتی رہی۔ گزشتہ تلخیاں دھونے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن  
بے سود۔

ہمارا احسان مانو ..... تمہیں رکھ لیا ہے ..... نہ جانے کیوں ہمیں  
تمہارا تحفظ عزیز ہے ..... اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں تنہا دیکھ کر ڈسٹرب

پھر تیسرا دن یونہی گزر گیا ..... بیدار بخت کی محبت کی ماری سوہنی  
نہ جانے آج کیوں بے چین ہو گئی۔ وہ آج ضرور بیدار بخت سے ملے گی۔  
چاہے گولی مار دے بیدار بخت مجھے۔

وہ کچن سے باہر نکلی ..... شب کے دس بج رہے تھے ..... وہ دبے  
قدموں چلتی جاتی تھی ..... ایک ایک قدم کئی کئی من کا تھا جیسے زمین اس کے  
قدموں سے لپٹتی چلی جائے ..... بیدار بخت کے کمرے کی جتی روشن تھی۔  
پردے لہرا رہے تھے۔ سوہنی نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔

وہ پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے انگلش دھن سن رہے تھے ..... ان  
کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا ..... جیسے عمد رفتہ کی کوئی یاد ان کے دامن  
میں نہ سکتی ہو۔ انہوں نے تو اپنے آپ کو روپی کے لیے مخصوص کر لیا تھا۔  
سوہنی ایک کھلونا تھی ..... کھیلا اور ٹوٹ گیا تو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا  
..... ایک مفلس اور جھکی والی کی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے۔

وہ دروازے کے بیچ میں کھڑی نہ جانے کیا کیا سوچے جا رہی تھی۔  
پہلے سوچا واپس لوٹ جائے ..... لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ داخل  
ہو گئی۔

محبت سے مغلوب ہو کر وہ جھکی اور بیدار بخت کے پیروں کو  
آنکھوں سے لگا لیا۔

تم ..... چلی جاؤ۔

بیدار بخت نے ایک دم قدم کھینچ لیے۔

صاحب جی .....

وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی صرف سک اٹھی۔

کس لیے آئی ہو ..... میری رسوائی کا کوئی شہہ باقی رہ گیا ہے۔ تنہ  
نوکروں کے روبرو ذلیل کر دیا ہے تم نے۔ یہ تمہاری اوقات ہے۔

وہ اونچی آواز میں لیکن زبان دبا کر بولے۔

صاحب جی ..... ہمارا گناہ کب معاف ہو گا۔

بیٹی، معافی تو ہر گناہ کی ہے۔ اللہ تو ایسا نہیں کرتا ..... اس کی توبہ  
کے دروازے تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔

خان بابا نے سوہنی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ اللہ نہیں بابا ..... وہ انسان ہے ..... اور انسان گناہ کیسے معاف

کرتے۔

وہ پھر رو دی۔

اچھا چھوڑ ..... تو دل نہ برا کر ..... جب اس کا دل صاف ہو جائے گا  
توہ تمہیں معاف کر دے گا ..... میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔

خان بابا اٹھنے لگا۔

بابا ..... اس وقت کھانا کہاں سے آئے گا۔ کچن بند ہے۔ جگو بابا سو

ہو گیا ہے۔

وہ چونکی۔

مجھے ہوک نہیں تھی اس لیے اپنا کھانا تمہارے لیے رکھ دیا تھا۔

وہ باہر بھاگ گیا۔ اس کی تیز رفتاری بھاگنے کے مترادف تھی۔

بابا تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔

خان بابا کو واپس آتے دیکھ کر بولی۔

بیٹی، تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی عادت سی ہو چکی ہے ..... اس

لے اکیلے نہیں کھا سکتا بلکہ اچھا نہیں لگتا مجھے۔

خان بابا پلیٹ میں سالن ڈالتا ہوا بولا۔

کھاؤ۔

کھاؤ نا بابا۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خان بابا کے لیے لقمہ بنا کر منہ میں ڈالتے

تھے۔

خان بابا کے ساتھ اس نے دو چار لقمے زہر مار کیے اور برتن سمیٹ

کر رکھ دیے۔ کھانے کے بعد دونوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ خان بابا

کرو ..... تمہاری صورت .....

آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

چلی جاؤ ..... رات گزر رہی ہے ..... ہم آرام کرنا چاہتے ہیں .....

جاؤ۔

غصہ ان کی آنکھوں سے برس رہا تھا، لہجے کی تلخی فضا میں زہر

گھول گئی۔ چہرے سے وحشت نپک رہی تھی۔ ان کا ادا کیا ہوا ایک ایک لفظ

زہریلا نشتر تھا جو اس کے جگر میں پیوست ہوتا جا رہا تھا وہ سسکتی ہوئی اپنے

کواٹر کی طرف بڑھ گئی۔

دروازہ کھلا تھا۔

وہ بری طرح بستر پر گری اور بلک بلک کر رو دی۔

بچہ، تمہیں کیا ہو گیا ہے ..... رو کس لیے رہی ہو ..... کس نے برا

بھلا کہا۔

خان بابا اٹھ کر پاس آ گیا۔

وہ روتی رہی ..... کھل کر ساون برسا ..... سب کچھ اتھل پتھل ہو

گیا۔

میں تو سمجھا تھا کہ محل میں کام ہو گا ..... اسی لیے دیر ہو گئی .....

روٹی بھی نہیں کھائی ہو گی تم نے ..... وہ روتی رہی۔ دل کے پھپھوے

پھوڑتی رہی۔ دیر سے آئی ہو کہیں صاحب کے .....

ہاں بابا آج صاحب جی کے پاس گناہ بخشوانے گئے تھے۔

وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔

پھر۔

خان بابا ہمہ تن گوش ہو گیا۔

پھر کیا بابا ..... ہمارا گناہ ہی بہت بڑا ہے ..... جس کو صاحب جی

معاف نہیں کر سکتے۔

وہ سسکتی رہی کہ اس کی بچکی بندھ گئی۔

سکرے کی طرف چل دی۔

دروازہ کھلا تھا۔ مہین پر دے لہرا رہے تھے ..... یوں احساس ہو رہا تھا کہ اندر کسی نفوس کا وجود نہیں ہے۔

کیوں سوہنی یہاں کیوں کھڑی ہو۔

محل کی پرانی ملازمہ نصین نے ناک چڑھا کر کہا۔

اماں ..... بیگم صاحبہ نے بلایا تھا۔

وہ دیکھو ..... سامنے پھولوں کے پاس ..... تمہیں نہیں پتہ اس وقت

بیگم صاحبہ صبح کی تازہ ہوا کھانے باغ میں جاتی ہیں۔

نصین کہتی ہوئی واپس لوٹ گئی۔

وہاں جاؤں۔

سوہنی نے خود سے سوال کیا۔

ہاں ہاں، وہاں چلی جاؤ، کچن کا کوئی کام ہو گا۔

نصین دوسری طرف مڑ گئی۔

سوہنی زینہ اتر کر باغ میں چلی گئی۔

آجاؤں بیگم صاحبہ۔

وہ پاس جا کر بولی۔

ایک دم اخبار کو چہرے سے ہٹا کر وہ سوہنی کو بغور دیکھنے لگیں۔

آپ نے بلایا تھا بیگم صاحبہ۔

وہ آہستہ سے سہم کر بولی۔

بیگم نور الدین کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ دیکھنے والے کو لرزا طاری ہو جاتا۔

ہوں ..... ہم نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ آج جگو نہیں ہے۔

جی ..... جگو بابا نہیں ہے۔

وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

نہیں ہے ..... اور کچن کا کام تم خود کر لینا۔ ناشتے میں سب کی پنہ

کا ذہن صاف اور شفاف تھا لیکن وہ حد درجہ افسردہ، پریشان اور ذہنی اذیت میں مبتلا تھی۔ ماضی ایک عذاب بن کر اس کی روح کو چرکے لگا رہا تھا۔ بیدار بخت ایسا کیوں ہو گیا ..... کتنی محبت کرتا تھا بیدار بخت ..... اب اس قدر ظالم ..... میری صورت سے بھی اس کو نفرت ہے ..... کہاں وہ ایک لمحہ بزم کے لیے میری صورت نگاہوں سے او جھل نہیں ہونے دیتا تھا اور اب وہ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

ایک ٹھنڈا اور لمبا سانس لے کر اس نے کروٹ لی۔

اوہو ..... شمشیر تم کہاں ہو ..... میرا دکھ درد بٹانے والے ..... میں نے تمہیں کتنے دکھ دیے ہیں ..... کیا کرتی ..... میں ہواؤں میں پرواز کر رہی تھی۔ جھگیوں سے نفرت تھی مجھے ..... محلوں میں آکر رسوا اور خوار ہو گئی ..... میں اب بھی بیدار بخت کو نہیں چھوڑ سکتی ..... اس کے ساتھ ایسے بندھن کی کڑیاں جڑی ہیں کہ اس کو چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بیدار بخت ہر ہر روپ میں اس کے سامنے آتا اور خیالات کی آندھی اس کو کہیں کا کہیں اڑا کر لے جاتی۔

تمام شب .....

شب بیداری میں گزار دی ..... موزن کی آواز پر اٹھی لیکن خان بابا پہلے ہی اٹھ کر وضو کرنے چل دیا تھا۔

ضروریات سے فارغ ہو کر خان بابا اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں داخل ہو گئی۔

کچن بند دیکھ کر اس کو دھچکا سا لگا۔ وہ باہر واپس آئی۔

سوہنی۔

اس کی پشت سے ایک ملازم نے آواز دی۔

وہ پلٹی۔

بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔

ملازم اپنے راستے پر ہوا اور وہ ست روی سے بیگم نور الدین کے

کا خیال رکھ لینا۔

وہ پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔

ہمیں کیا پتہ جی کہ کر کیا اندسے۔

ایک دم جیسے لاشعوری طور پر اس نے منہ سے نکلا۔

بکواس بند کرو ..... تمہیں جواب سوال کرنے کی اجازت کس نے

دی ہے۔

وہ اخبار پرے پھینک کر زور سے بولیں۔

کسی نے نہیں بیگم صاحبہ ..... کسی نے نہیں۔

وہ واپس پلٹی۔

عجلت اور تیز رفتاری میں باغ کے زینے پر بری طرح ٹکرائی۔

بیدار بخت نے اسے گھورا۔ کچھ کہہ نہ سکے۔

صاحب جی ..... معاف کیجئے ..... ہمارا قصور نہیں ہے ..... ہم جلدی

میں تھے اس لیے آپ سے ٹکرا گئے۔

لیکن بیدار بخت نے کوئی نوٹس نہ لیا، وہ لان میں اتر گئے۔

وہ ہانپتی ہوئی کچن میں پہنچی اور ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ بگو

بابا کی شاگردی اختیار کر رکھی تھی اور کافی دنوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

اپنی طرف سے تو اچھا ہی تیار کیا تھا۔

ارے واہ ..... یہ شیر خرما ..... آج تو مزا آ جائے گا۔

پیٹر نے چیخ بھر کر اپنی پلیٹ میں ڈالا اور بڑی رغبت سے کھانے لگا۔

روبی پہلے ہی کھا رہی تھی۔ پیٹر کے کہنے پر وہ بولی نہیں۔ بیدار بخت سبز

چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بیگم نور الدین نے بھی شیر خرما پلیٹ میں ڈالا اور تعریفانہ انداز میں

کھانے لگیں۔ روبی نے ایک ایک نظر سب پر ڈالی لیکن بیدار بخت کی

کھانے کے بارے میں رغبت اور دلچسپی دیکھ کر وہ تمللا اٹھی۔ وہ ایک سوہنی

تو کیا کسی کے لیے بھی بیدار بخت کی دلچسپی پسند نہ کر سکتی تھی۔

بگو بابا غضب کی چائے بناتا ہے۔

بیدار بخت بولے۔

روبی نے پلٹ کر بیدار بخت کو دیکھا۔

پیٹر ہنس دیا۔

سوہنی نے خالی نظروں سے بیدار بخت کو دیکھا۔

آج ناشتہ سوہنی نے تیار کیا ہے بیٹا۔

بیگم نور الدین نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔

ہوں ..... اچھی ہے۔

وہ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے۔

روبی کٹ کر رہ گئی۔

اچھا بھی تم لوگ آرام سے ناشتہ کرو ..... میں اپنے کمرے میں

باؤں گی، چند ایک جگہ پر فون کرنے ہیں۔

وہ چل دیں۔

تم بھی جاؤ ..... جب ضرورت ہو گی بلا لیں گے۔

روبی کا انداز حد درجہ گھٹیا اور رکیک تھا۔

سوہنی واپس پٹ گئی۔

اس کو ملازم رکھنے کی آخر ضرورت کیا تھی۔

ڈانگ ہال میں ناشتہ چن دیا گیا تھا۔ ہر چیز بڑے سلیقے اور نفاست

سے رکھی تھی۔ وہ اس وقت سفید سلوار قمیض میں ملبوس پاس کھڑی تھی

..... ساتھ ساتھ بیدار بخت اور روبی ..... سامنے پیٹر اور بیگم صاحبہ بیٹھی

تھیں۔

روبی بیدار بخت سے مخاطب ہوئی۔  
 بیدار بخت خود چھوٹنا چاہتے تھے۔  
 غریب لڑکی تھی، ملازمہ کوئی بری بھی نہیں۔  
 پیٹرنے کہا۔

بری نہیں ..... لیکن خود کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے ..... اپنے آپ کو  
 ہم کہتی ہے۔

روبی تک کر بولی۔

بیدار بخت خاموش رہے۔

یہ تو کوئی بات نہیں ..... اپنی ذات کو آدمی کسی طرح بھی پکار سکتا  
 ہے۔ ہم کہہ لے یا میں کہہ لے ..... اور پھر ویسے بھی ایسا انداز ان لوگوں  
 کی عادت میں شامل ہے۔ کیوں سر۔

پیٹرنے بیدار بخت کی رضامندی دیکھی تو کہہ دیا۔  
 ٹھیک ہے۔

روبی طیش میں ناشتہ کرتی رہی، نہ جانے کیوں سوہنی کا وجود اسے  
 اس گھر میں گوارہ نہ تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی  
 حسین لڑکی بیدار بخت کی توجہ کا مرکز بنے۔ وہ اپنے سے کتر کو دیکھنا چاہتی  
 تھی اپنے سے بڑھیا کو دیکھنا اسے پسند ہی نہ تھا۔

بیدار بخت خاموش لا جواب سے اٹھ گئے۔ وہ عجیب قسم کی پوزیشن  
 میں الجھ گئے تھے۔ سوہنی سے شادی ان کی زندگی کی بہت بڑی غلطی تھی .....  
 اب اس کی نگاہوں میں التجا، وہ مجبور ہو چکے تھے ..... اس کے لیے نرمی  
 اختیار کرنے پر۔

روبی نے انہیں جاتے دیکھا لیکن وہ کسی مصلحت کے پیش نظر اپنے  
 کمرے میں چل دی تھی۔

(19)

بیگم نور الدین بری طرح اچھلیں۔

نصین حیران سی وحشت زدہ ان کو دیکھنے لگی اور تھر تھرانے لگی۔  
 تم نے خود دیکھا۔

وہ اپنے کمرے میں گرج اٹھیں۔

ہاں جی بیگم صاحب ..... صاحب نے سوہنی سے شادی کر لی ہے بیگم

صاحبہ .....

نصین نے کہا۔

دیکھو جھوٹ ہرگز نہ بولنا ..... ورنہ کھال کھنچوا دوں گی۔

آپ پیٹر بابو سے پوچھ لیں۔

نصین نے کہا۔

ٹھیک ہے ..... اس وقت بیدار بخت دورے پر انگلینڈ جا چکے ہیں۔

شام کو پیٹر کو میرے پاس بھیجنا۔

بہت اچھا جی۔

نصین باہر نکل گئی۔

اور ..... بیگم نور الدین نے پوری طاقت سے مکہ میز پر مارا ..... یہ  
 کیسے ہو سکتا ہے۔ بیدار اس قدر پست نہیں ہو سکتا ..... ایک جھگی والی سے  
 شادی رچالی اور ہمیں علم بھی نہیں ہوا ..... ہمیں یقین نہیں آتا ..... ہم نے  
 کیا کیا خواب دیکھے، روپی اربوں کی مالک ہے ..... اس کو چھوڑ کر سوہنی سے

ہیں۔

وہ سنجیدگی سے بولیں۔

کیا مطلب کہ میں جھوٹ بولوں گا ..... بخدا ..... پیٹر جھوٹ نہیں بول سکتا آپ فرمائیں تو سہی ..... کوئی خطا ہو گئی ہے ہم سے۔  
پیٹر مودب بولا۔

ہم نے سنا ہے کہ بیدار بخت نے شادی کی ہوئی ہے اور وہ بھی ایک ادنیٰ ملازمہ سے۔ وہ حد درجہ رکیک انداز میں بولیں۔

پیٹر خاموش تکتا رہا ..... وہ ہاں اور ناں کے گرداب میں پھنس چکا تھا۔ بیگم نور الدین نے پیٹر کو گھورا ..... وہ اس کی خاموشی کا مطلب سمجھ چکی تھیں۔

پیٹر ..... ہم نے بیدار بخت کے قول و فعل کی نگرانی کے لیے تمہیں بھیجا تھا۔  
پیٹر اب بھی خاموش تھا۔

بولو پیٹر ..... تم نے ایسا کیوں ہونے دیا ..... کیوں تم نے ہماری عزت و ناموس کا جنازہ نکلتے دیکھا ..... تم نے بیدار بخت کو منع کیوں نہیں کیا۔

ان کے لہجے کی خفگی سے عیاں تھا کہ انہیں اس بات سے دھچکا لگا ہے۔

میں کیسے عرض کروں بیگم صاحب ..... میں نے کتنا روکا تھا انہیں ..... لیکن صاحب باز نہیں آئے ..... میں نے تمام حقائق سے انہیں آگاہ کیا بھی ..... آپ کا اور اس لڑکی کا موازنہ بھی کیا ..... لیکن سب بے سود۔  
پیٹر خاموش ہو گیا۔

ہمیں یقین نہیں آتا کہ بیدار بخت اتنے خود سر ہو جائیں گے۔  
بیگم نور الدین نے کہا۔  
پیٹر ساکن بیٹھا رہا۔

خفیہ شادی ..... یہ کیا کیا ..... بیدار اور سوہنی ..... ایک آسمان کا ستارہ ایک زمین کا ادنیٰ ذرہ ..... ہم نہیں مانتے ..... بیدار سینھ نور الدین کا اکلوتا بیٹا اور اتنی بڑی حماقت ..... یہ کر سکتا ہے ..... ہمیں یقین نہیں آتا۔

اطلاع ملتے ہیں ڈرائنگ روم میں بیگم نور الدین نے پیٹر کو بلوا بھیجا۔

خیریت۔

پیٹر اٹھ کر ایک دم سے ملازم کی طرف دیکھ کر بولا۔  
خیریت ہی ہو گی سرکار ..... ہمیں معلوم نہیں ..... آپ جلدی آ جائیں۔

الہی خیر۔

چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی۔ لباس درست کرتے پیٹر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

آؤ آؤ ..... پیٹر ہمیں تمہارا شدت سے انتظار تھا۔

بیگم نور الدین نے ساڑھی کے پلو کو درست کرتے ہوئے پہلو بدلا۔  
میں ہمہ وقت حکم کا منتظر رہتا ہوں ..... پھر انتظار کیا۔  
پیٹر ان کے سامنے اکیلے صوفے پر بیٹھ گیا۔

یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔

وہ زبردستی مسکرا دیں۔

آپ نے بلایا تھا مجھے۔

پیٹر بیگم نور الدین کو بغور دیکھ کر بولا۔

ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں ..... بالکل صحیح جواب چاہیے

وہ خاموش ہو گیا۔

اب اس کا یہی حل ہے کہ.....

وہ ایک دم چونک گئیں..... دروازہ کھلا اور بند ہوا تھا۔

باہر ہوا چل رہی ہے شاید۔

پیٹر لپک کر اٹھا۔ اس نے چھپاک سے کسی کو دوسری طرف جاتے

دیکھا۔ وہ واپس پلٹا۔

کوئی تھا۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

مجھے کچھ نظر نہیں آیا..... ہو سکتا ہے کوئی ملازم ہو۔

پیٹر بولا۔

ہاں..... ایسا بھی ہو سکتا ہے..... اور تمام ملازم اس قفسے سے

واقف ہیں۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

جی ہاں، پرانے ملازم تو سب ہی جانتے ہیں۔

پیٹر نے کہا۔

بالکل اسی طرح جیسے نصیین نے ہمیں بتایا ہے، اسی طرح من و عن  
دوسروں کو بھی سنا سکتی ہے۔

بیگم نور الدین کو نصیین پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

میرا تو دل چاہ رہا ہے نصیین بوا کو نوکری سے نکال دوں۔

پیٹر نے دانت کچکپائے۔

بیگم نور الدین ہنس دیں۔

تمہارا غصہ بجا ہے پیٹر..... نوکروں کو مالک کی بات دوسروں تک  
نہیں پہنچانی چاہئے۔

اب کیا کریں..... پرانی ملازمہ ہے۔

وہ نصیین کے لیے کمزور ہو گئیں۔

چند لمحے ماحول ساکت رہا..... کسی نے کچھ نہ کہا..... ماحول کی  
ویرانی سے غماز تھا کہ بیگم نور الدین کے اندر لاوا پک رہا ہے۔ وہ ہر مرتبہ  
دانت پیستی نظر آ رہی تھیں۔

بیدار نے اتنے تردد سے کام لیا۔

پیٹر نے نظریں اٹھائی..... اس نے دیکھا بیگم نور الدین کی آنکھوں  
میں بے رحمی، سفاکی جھلک رہی تھی..... ان کی پیشانی کی سلوٹیں کبھی  
ابھرتیں اور کبھی صاف ہو جاتیں۔ وہ زبردست طیش میں نظر آ رہی تھیں۔  
بار بار ان کی کن پٹیوں پر ایک سخت ابھار نمایاں ہوتا اور پھر ڈھل جاتا۔

اب میرے لیے کیا حکم ہے بیگم صاحبہ۔

پیٹر نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

ہم اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتے..... جتنی جلدی ہو سکے اس  
سے کنارہ کشی اختیار کرو۔

اب کیا کیا جائے بیگم صاحبہ۔

پیٹر نے کہا۔

طلاق اور..... صرف طلاق..... اور محل سے نکال دو۔

وہ سفاک انداز میں بولیں۔

ایک لمحے کے لیے پیٹر لرز گیا۔

طلاق بیگم صاحبہ..... وہ کہاں جائے گی..... اس کا تو بھری دنیا میں  
کوئی بھی نہیں۔

یہی ہمدردی تمہارے راستے کی دیوار رہی ہے..... تمہارے اندر  
رحم کا جذبہ نہ ہوتا تو یقیناً "بیدار بخت ایسا کام ہرگز نہ کرتے۔

بیگم نور الدین کو پیٹر پر بھی غصہ آ گیا۔

بیگم صاحبہ ایک انسان ہونے کے ناطے مجھ سے یہ فعل سرزد ہو گیا  
..... ورنہ آپ کا احترام میں ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں..... میں جانتا تھا کہ بیدار  
بخت بہت بڑا قدم اٹھانے لگے ہیں اور یہ عمل پائدار نہیں ہے۔



آج میرا خیر ہو گیا ہے بابا..... میں مرکیوں نہیں جاتی۔

وہ رو دی۔

کیا ہو گیا ہے..... میں تمہاری کسی بات کو سمجھ نہیں سکا۔

بوڑھا خان حیرت کے عالم میں بولا۔

میں نے آج ساری باتیں سن لی ہیں..... بیگم صاحبہ جو کچھ پیٹر بابو سے کہہ رہی تھیں۔

وہ د گلیہ آواز میں بولی۔

کیا کہہ رہی تھیں..... بتاؤ نا..... صاف صاف بتاؤ نا۔

خان بابا آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

بیگم صاحبہ، صاحب جی کے آنے پر مجھے طلاق دلوائیں گی..... میں مرجاؤں گی، جان پر کھیل جاؤں گی..... ایسا کبھی نہ ہونے دوں گی۔

وہ گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر زار و قطار رو دی..... اتنا رو دی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔

اوہو..... سوچنے دے..... اب کیا کرنا ہے..... معاملہ بڑا خراب

ہے۔

خان بابا نے ہاتھ کی ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی رکھی۔

وہ روتی رہی..... سسکتی رہی..... جلے نصیبوں کا ماتم کرتی رہی، ایسی شب سرخاب تھی جو ایک طویل مسافت کے بعد بھی ختم نہ ہو سکتی تھی..... وہ شب دیجور کی تو عادی تھی۔ وہ ہمیشہ سے شب زندہ دار بھی رہی تھی لیکن جدائی کی راتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ اسے بیدار بخت سے شدید محبت تھی..... وہ بیدار بخت کی لاپرواہی سے بے اعتنائی کو کس برتے پر برواشت کئے جا رہی تھی کہ وہ اس کی بیوی تھی۔ زبان پر حرف شکایت وہ اس لیے نہیں لا رہی تھی کہ کہیں مشتعل ہو کر اسے محل سے نکال نہ دیا جائے..... لیکن اب اس کا ٹکنا ضروری تھا..... وہ بیدار بخت سے یہ تعلق توڑنا نہیں چاہتی تھی..... وہ سدا ان کی رہنا چاہتی تھی۔

آپ ذرا ڈانٹ دیجئے گا۔

پیٹر بولا۔

ٹھیک ہے..... اچھا بھلا ڈانٹوں گی..... آئندہ جرات نہ کرے گی..... اگر یہ بات میرے کانوں تک نہ پہنچتی تو نہ جانے آئندہ کے لیے کس سنگینی کا شکار ہونا پڑتا۔ حالات کیا سے کیا ہو جاتے۔

پیٹر نے صرف سنا اور دیکھتا رہا۔

بیدار بخت کا نکاح نامہ تو ہو گا تمہارے پاس۔

وہ بولیں۔

جی ہاں..... وہ تمام کاغذات میرے پاس ہی ہیں۔

پیٹر نے کہا۔

تو پھر فوراً وہ کاغذات میرے حوالے کرو..... تاکہ میں کسی نتیجے پر

پہنچوں۔

ٹھیک ہے۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

شام ڈھلتی جا رہی تھی۔ رات کا کھانا وہ کوارٹر میں ہی لے آئی۔

خان بابا کا کھانا بھی وہ کوارٹر میں اپنے ساتھ لے آئی۔

ابھی خان بابا کوارٹر میں ڈیوٹی ختم کر کے نہیں آیا تھا۔ کھانا لپیٹ کر

وہ خود کمرے میں آگئی۔

ابھی بیٹھی ہی تھی کہ خان بابا اندر داخل ہوا۔

آج اتنی جلدی آگئی..... طبیعت تو ٹھیک ہے۔

وہ گیزی اتار کر چارپائی پر رکھتے بولا۔

تو جا ..... میں تیری خبر لیتا رہوں گا ..... گھبرانہ ..... اور ہاں یہ خط رکھ لے۔

خان بابا نے چھوٹا سا رقعہ لکھ کر اس کو دیا۔  
سوہنی نے رقعہ پکڑ کر دوپٹے کے آنچل میں باندھ لیا۔ چیزیں سمیٹ کر لیٹ گئی۔ خان بابا بھی لیٹ گیا۔ دونوں نے رات کچھ نہیں کھایا۔ افسردہ افسردہ لیٹے رہے۔ سوہنی چپکے چپکے روتی رہی۔ جب کوئی سسکی بے قابو ہو جاتی تو آواز خان بابا تک پہنچتی تو وہ بے چین ہو جاتا۔  
کروٹ لے کر اٹھ بیٹھا۔

تو پھر رو رہی ہے ..... میری بھانجی بہت اچھی ہے ..... اس کے گھر میں رہے گی تو خوش رہے گی۔ شریف گل بھی بہت اچھا ہے ..... گھبرانہ۔  
خان بابا اسے تسلی بخشی دیتا رہا۔  
تو تو نہیں ہو گا ..... کون مجھے اتنا پیار دے گا اور میرا خیال رکھے گا۔

سوہنی نے روتے ہوئے کہا۔  
پاگل تو نہیں ہو گئی ..... میں تیرے پاس آتا جاتا رہوں گا ..... بس تیری خبریں نور محل میں نہیں آنی چاہئے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔  
وہ سسک سسک کر خان بابا کی باتیں سنتی رہی۔  
اب سو جا ..... صبح جلد اٹھنا ہے۔  
وہ اسے پچکارتا ہوا بولا۔

وہ ویسے ہی گردن لڑھکا کر لیٹ گئی۔ نیند تو اس کی آنکھوں کی کوسوں دور تھی۔ خان بابا کے بتائے ہوئے راستے کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ کراچی میں رہ کر اسے تھوڑا بہت تو راستوں کا تعین کرنا تو آتا ہی تھا۔ پھر محنت مزدوری کرنے، نہ جانے وہ شمشیر کے ساتھ کہاں کہاں جاتی تھی۔ اس کا اس قدر خیال رکھنے والا شمشیر نہ جانے کہاں ہو گا۔  
وہ انہیں خیالات کے گرداب میں چکر لگاتی سونے کی کوشش کرنے

ہی۔

خان بابا نے سر اٹھایا۔

ہاں بابا ..... اب کیا کروں میں ..... کہاں جاؤں۔  
حوصلہ کرو ..... اور تسلی سے میری بات سنو ..... رات بھگتے ہی یہاں سے نکل جا۔

خان بابا بڑی سوچ بچار کے بعد بولا۔

اس رات کی تاریکی میں کہاں جاؤں گی بابا۔

وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

گھبرانہ ..... ادھر شہر سے دور ایک گاؤں علی پور ہے ..... وہاں میری بھتیجی رہتی ہے۔ میں ایک رقعہ لکھ دوں گا۔ تم وہاں چلی جانا ..... گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ..... سویرے پانچ بجے ڈیوٹی شروع ہوتی ہے میری ..... چوکیدار کے جاتے ہی نکل جانا تاکہ میرا بھی نام نہ آئے۔  
وہ خاموش سنتی رہی۔

اگر تو رہی تو یہ لوگ بڑے جابر اور ظالم ہیں ..... ایک تو طلاق ہو جائے گی اور دوسری بات تیری جو شامت آئے گی، اللہ پناہ۔

خان بابا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

بابا ظلم تو سہ لوں گی لیکن بیدار بخت کو نہیں چھوڑ سکتی۔

وہ ایک دم سے بولی۔

ٹھیک ہے ..... اپنا سامان سمیٹ ..... اور یہ رکھ لے اپنے پاس۔

یہ کیا ہے۔

سوہنی ایک تھیلی خان بابا کے ہاتھ میں دیکھ کر بولی۔

کچھ پیسے ہیں ..... تیرے کام آئیں گے۔

خان بابا افسردگی سے بولا۔

بابا ..... تیرا ساتھ چھوٹ گیا ..... جتنا وقت گذرا بہت اچھا گذرا۔

سوہنی نے چہرہ صاف کیا۔

گئی۔ لیکن بے نام اور رائیگاں ہوا سب کچھ ..... اسے سکون نصیب نہ ہوا۔  
 اس کا جگر کھٹتا رہا۔  
 سلگتا رہا۔  
 اور وہ ان بھائیڑوں میں جل جل کر راکھ ہوتی رہی۔

(20)

علی پور کراچی سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ چادر سے منہ ڈھانپے وہ  
 گاؤں میں داخل ہوئی۔  
 اے بھائی۔  
 ایک نوجوان کو جو سائیکل پر جا رہا تھا، آواز دے کر بولی۔  
 کیا بات ہے بی بی۔  
 نوجوان نے قریب کھڑے ہو کر ایک ٹانگ زمین پر لگائی۔  
 یہ دیکھو، اس پتہ پر جانا ہے ..... شریف گل نام ہے۔  
 کانڈ کا ٹکڑا پکڑ کر نوجوان نے دو چمکتی ہوئی تیرنیم کش آنکھیں  
 دیکھیں تو چند لمحے لڑکھڑا گیا۔  
 پتہ ہے .....  
 وہ گھبرا سی گئی۔  
 نہیں ..... نوجوان نے کانڈ کا ٹکڑا اسے واپس تھمایا اور تیز رفتاری  
 سے سائیکل آگے بڑھالے گیا۔

وہ چند لمحے دیکھتی رہ گئی پھر اللہ کا نام لے کر وہ سیدھی چلتی رہی۔  
 ادھر کے بارہ بنجے کو آئے تھے۔ شریف گل کا گھر نہ ملنا اس کے لیے ایک  
 نئی مصیبت لانے کے مترادف تھا۔ وہ چلتی رہی۔ اچانک اس کی نظر ایک

رکشہ ڈرائیور پر پڑی۔

اے بھائی!..... دیکھو اس پتے پر جانا ہے۔

خان بابا کی ہدایت کے مطابق اس نے اچھی طرح چہرہ ڈھانپا ہوا

تھا۔

شریف گل..... رکشہ چلاتا ہے..... بیٹھو بیٹھو۔

رکشہ ڈرائیور نے کہا۔

نہیں بھائی میں یونہی چلی جاؤں گی..... تم راستہ بتا دو۔

اس نے انکار کر دیا۔

تو کیسے چلی جائے گی..... بڑی دور ہے اس کا گھر..... بیٹھو بیٹھو.....

تم ہماری بہن ہے..... بیٹھو..... ہم تمہیں وہاں چھوڑ آئے گا۔

وہ بادل نخواستہ بیٹھ گئی۔ حالات کے آنے جانے میں اس طرح الجھ

گئی تھی کہ نکلنا محال نظر آ رہا تھا۔

گڑا ہٹ اور چنگاڑ کے ساتھ رکشہ ایک بوے سے لکڑی کے گیٹ

کے سامنے رکا۔ اتر کر رکشے والے نے دستک دی اور پہلی ہی دستک پر ایک

نوجوان بڑی بڑی مونچھیں، بھاری بھر کم وجود دراز قد باہر آیا۔

شریف گل۔

رکشے والے نے کہا۔

کیسے آگیا جانو..... خیریت تو ہے۔

شریف گل نے جانو سے ہاتھ ملایا۔

ترے مہمان لایا ہوں..... بی بی باہر آ جاؤ۔

جانو نے کہا۔

سوہنی باہر آ گئی۔

شریف گل نے پہچاننے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ

نہا۔

سوہنی نے خان بابا کا خط نکال کر اسے تھما دیا۔

بھتیجی مصروف جان اور بیٹا شریف گل۔

خوش رہو۔ یہ لڑکی تمہارے پاس بھیج رہا ہوں..... اس کا خیال

رکنا۔ بڑی دکھی ہے۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میری بیٹی سمجھ کر

اسے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہارا کام کر دیا کرے گی۔ باقی باتیں ملوں گا تو کروں

گا۔

فقط تمہارا چاچا۔

خان گل۔

شریف گل نے کاغذ تمہ کیا اور جیب میں ڈالا۔

آؤ۔

وہ سوہنی سے بولا۔

اچھا۔ اللہ راکھا.....

جانو نے کہا اور رکشے میں بیٹھ گیا۔

شریف گل نے ہاتھ کھڑا کیا اور سوہنی کو اندر لے گیا۔

یہ کون ہے۔

سوہنی کو دیکھتے ہی ایک عورت تڑاک سے بولی۔

خان چاچا نے بھیجی ہے..... اور یہ رقعہ بھی ہے۔

شریف گل نے رقعہ نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

سوہنی نے چادر چہرے سے ہٹا کر رخساروں اور بازوؤں کو صاف کیا۔

شریف گل پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

معروف جان نے ایک گہرا سانس لیا، چند لمحے سوچا اور ہاتھ کے

اشارے سے شریف گل کو سامنے کمرے میں بلایا۔  
کیا بات ہے۔

شریف گل بیوی کے پاس آکر بولا۔  
میں اسے نہیں رکھوں گی۔ صورت دیکھی ہے اس کی۔  
وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔  
کیوں۔

شریف نے کہا۔

اس لیے کہ اس کی صورت دیکھی ..... مسکین بلی کی طرح ..... یہ  
بھولی بھالی صورتیں اچھی نہیں ہوتیں ..... اور میں تمہیں بھی جانتی ہوں۔  
معروف جان نے تلخ انداز میں کہا۔  
کیا بکواس کرتی ہے ..... چار دن رہنے دے کیا پتہ کوئی فائدہ دے  
دے۔

شریف گل نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں تو چاچا کے آنے تک اس کو رکھوں گی  
پھر یہ کوئی ٹھکانہ کرے۔

اچھا، اچھا۔

شریف گل باہر آگیا۔

سوہنی آدم شناس لڑکی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی کے عجیب قسم  
کے انداز دیکھ کر کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ معروف جان نک چڑھی اور بد مزاج  
عورت تھی اور شریف گل چرے بشرے سے آوارہ خوفناک لگتا تھا۔ اے  
اللہ میں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی۔

اے ..... اٹھ منہ ہاتھ دھو لے اور روٹی کھا لے ..... صبح سے کچھ

نہیں کھایا ہو گا۔

معروف جان نے کہا۔ اس کے لمبے کی کاٹ سوہنی کو کاٹ گئی۔  
خاموش انھی اور ذرا فاصلے پر ہینڈ پمپ پر ہاتھ منہ اچھی طرح  
دھویا۔ کچھ جان میں جان آئی۔ چادر سے منہ پونچھتی واپس آگئی۔  
کپڑ کھا لے۔

چنگیر میں روٹیاں اور پیالی سالن معروف جان نے اس کے سامنے  
رکھا۔

اتنی روٹیاں۔

وہ چنگیر میں روٹیاں دیکھ کر بولی۔  
روٹی کھائے گی ..... سونگھے گی کیا۔  
وہ پھر تلخ انداز میں بولی۔  
شریف گل باہر جا چکا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ کھاتی رہی۔ سالن بھی زیادہ تھا۔ سالن بھی اس نے  
روٹی پر ڈال لیا۔ بمشکل ایک روٹی اس کے حلق سے اتری ہو گی۔  
پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا اور چنگیر اٹھا کر معروف جان کے پاس  
آئی۔

یہ سالن صاف ہے، جھوٹا نہیں ہے۔

معروف جان نے روٹیاں دیکھیں۔

ہیں ..... تو نے صرف ایک روٹی کھائی ہے ..... اتنی جوان ہے اور  
اتنی سی خوراک ہے۔

معروف جان نے روٹیاں اور سالن جالی میں رکھ دیا اور خود  
دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

سوہنی باہر صحن میں اپنی گھڑی لئے بیٹھی رہی۔

سوہنی کو رہتے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ معروف جان اس سے

ایک ہے تو..... شاباش اسے فارغ کر۔

شریف گل نے تھکی دی اور سامان لے کر اندر چلا گیا۔

سوہنی کپڑے جلدی دھو لے۔ دھوپ چڑھ رہی ہے۔

معروف جان صحن میں سے ہی ہانک لگا کر بولی۔

اتنا ڈھیر بڑا ہے۔ دیر تو لگے گی آپا۔

سوہنی وہیں سے بولی۔

دیر نہ کر..... تیرے کپڑے لایا ہے شریف گل..... دیکھ لے۔

معروف جان نے کمرے کی طرف دیکھا جہاں شریف گل سرخ جوڑا

بلا کر دیکھ رہا تھا۔ دل کے اندر دوسوے اندیشے زہریلے ناگ بن کر ڈس

ہے تھے۔ لیکن وہ خاموش صابن گھساتی رہی اور اپنے نصیبوں کے داغ

رہنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ کپڑے دھو کر اس نے رسی پر

بائے۔ اتنی دیر میں معروف جان نے باقی کپڑے سمیٹ لیے۔

رہنے دے آپا..... میں دھولوں گی۔

وہ آخری چادر رسی پر پھیلا کر پٹی۔

نہیں اندر جا کر کپڑے بدل لے..... شریف گل تیرے لیے لایا

میرے کپڑے اچھے تو ہیں..... کیا کروں گی میں کپڑے۔

سوہنی کو اچھا نہ لگا کہ شریف گل اس کے لیے کچھ لائے۔

شریف گل باہر آیا۔

کیا کرتی ہے..... اسے اس طرف لے کر آ..... سارا کام چوٹ کر

ہے۔

معروف جان پاس آئی۔

دیکھ چاچا کو کیا جواب دیں گے..... ہو سکتا ہے کبھی آجائے۔

تھوڑا بہت کام لے لیتی ورنہ اسے کچھ نہ کہتی..... ایک دن جو اس کے وہم  
تھے وہ پورے ہوتے نظر آ رہے تھے۔

شریف گل اندر آیا اس کے ہاتھ میں بڑا سا کپڑوں کا شاپنگ بیک  
تھا۔

یہ کیا ہے۔

معروف جان نے کہا۔

پچاس ہزار میں سودا ہوا ہے..... فروخت کر دی.....

وہ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔

وہ نکلے پر کپڑے دھو رہی تھی۔ ایک دم تڑپ اٹھی..... کچھ نہ

سمجھ آنے کے باوجود بھی اس کا کلیجہ حلق میں اٹک گیا۔ صابن کی نکیہ جس

ہاتھ سے پکڑی تھی اسی میں پکڑی رہ گئی۔ وہ بت کی طرح خاموش برف کے

تودے کی طرح منجمد بیٹھی رہی۔

معروف جان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

اسے فارغ کر..... کریم گل بہت جلدی میں ہے۔

ٹھہر بھی جا..... کام سے فارغ تو ہو لے..... اتنی جلدی پڑی ہے

تجھے۔

معروف جان کو غصہ آ گیا۔

تو پاگل ہو گئی ہے..... اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں ہیں..... بارڈر

پار سودا ہے..... لاکھوں کروڑوں کمائے ہیں..... جلدی کر جلدی۔

شریف گل نے کہا۔

ہنہ..... ہمیں تو پچاس ہی دے گا۔

وہ ناک چڑھا کر بولی۔

ناشکری..... اس سے پہلے کتنے کمائے ہیں تو نے..... لاکھوں کی

میں کہتی ہوں جو شریف گل کہہ رہا ہے وہ کر لے۔  
معروف جان ناک سکیڑ کر بولی۔  
اچھا۔

وہ اندر چلی گئی اور کنڈی لگا لی۔  
اندر نہ آنا ..... کپڑے پن کے آ رہی ہوں۔  
اچھا اچھا۔

کنڈی لگا کر اس نے چاروں جانب دیکھا، چھوٹی سی کھڑکی باہر کی  
طرف کھلتی تھی۔ اس نے جھانکا ..... دوسری چھت بہت نیچی تھی۔ اس نے  
پہلے سوچا اور شریف گل کے لائے ہوئے دوپٹے کو کھڑکی کی اوپر والی  
ملائخ کو اچھی طرح باندھا اور باہر اتر گئی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں پر مصروف  
تھے۔ چار پانچ چھتوں پر پھلانگتی ہوئی اچانک اسے ایک زینہ نظر آیا۔ پہلے  
اس نے جھانک کر دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت صحن میں سو رہی ہے۔ صحن  
دالا دروازہ کھلا ہے۔ وہ دبے پاؤں اتری۔ جوتی تو وہیں چھوڑ آئی تھی۔  
ٹافوشی سے اتر کر باہر گلی میں آ گئی۔ چھوٹی سڑک سے تیز چلتی ہوئی وہ بڑی  
سڑک پر آ گئی۔

دور اسے بس نظر آئی۔  
سوہنی نے دونوں ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کیا۔  
بس اس کے پاس رکی۔  
کہاں جانا ہے بی بی۔  
شہر جاؤں گی۔

وہ پیسے نکالتے ہوئے بولی۔  
کوئی نام تو ہو گا ترے شاپ کا۔  
کنڈیکٹر بولا۔

معروف جان نے کہا۔  
چاچا کو چھوڑ ..... کہہ دیں گے بھاگ گئی۔  
بھاگ گئی۔

سوہنی جیسی ہوشیار چالاک لڑکی کے لیے یہ سب کچھ سمجھ لینا مشکل  
نہ تھا۔ وہ سب سمجھ چکی تھی کہ اب وہ غلط ہاتھوں میں آ چکی ہے۔ اپنے دل  
میں کسی گہری سوچ کے ساتھ اس نے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے دل ہی  
دل میں ایک مکمل پلان بنا لیا۔

آ بھی جاؤ ..... کیوں کھڑی ہے دھوپ میں۔  
معروف جان نے کہا۔  
آ رہی ہوں۔

اپنی پیسوں والی تھیلی کو اس نے کمر کے ساتھ مضبوطی سے باندھا  
اور بڑا شب اٹھائے معروف جان کے پاس آ گئی۔

یہ جو اتنے کپڑے پڑے ہیں ان کو کس وقت دھونا ہے۔  
وہ شریف گل کو دیکھ کر بولی۔  
شریف گل باہر آ گیا۔

اندر جا کر وہ کپڑے پن لے ..... اور جلدی کر۔  
شریف گل بولا۔

یہی کپڑے ٹھیک ہیں ..... کیوں پہنوں یہ کپڑے ..... دلہنوں والے

ہیں۔

وہ پرسکون لہجے میں بولی۔  
کوئی بات نہیں ہے ..... پن لے۔  
معروف جان نے کہا۔  
اور شریف گل اسے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔

شریف گل نے ہاتھ بڑھا کر دوپٹہ کھینچا۔

ہوں۔

معروف جان سکتے ہیں آگئی۔

اب چپ کر جا ..... محلے میں پہلے ہی بدنامی ہے ..... لوگ نہ سن

کریم گل اور اس کے آدمی بھی صحن میں آ گئے۔

معاملہ چوپٹ ہو گیا ..... لڑکی بڑی ہوشیار تھی ..... بھانپ گئی سب

کریم گل بولا۔

شریف گل اور معروف جان خاموش کھڑے تھے۔

اب اس کی تلاش بے سود ہے ..... بس خاموش رہو۔

کریم گل نے کہا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر کی طرف چل دیا۔

شریف گل اور معروف جان پریشان زمین پر بیٹھ گئے۔ پچاس ہزار

تھان انہیں ڈسنے لگا تھا۔

بس تو شر اتار دینا میرا بھائی۔

وہ بولی ..... جیسے اس سے رحم کی طالب ہو۔

اچھا۔

ٹکٹ لے کر وہ سکون سے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ادھر معروف جان دروازہ کھٹکھٹا کر ہلکان ہو گئی لیکن وہ اندر ہوئی۔

جو جواب دیتی۔

بھاگ کر بیٹھک میں گئی۔

شریف گل ..... شریف گل ..... باہر آؤ ..... کیا ہو گیا ہمارے

ساتھ۔

اس کی گھبراہٹ اور اضطراب سے بھری ہوئی آواز سن کر شریف

گل باہر آیا۔

کیا ہو گیا ..... تو گھبرا کیوں رہی ہے ..... سیلاب آ گیا گھر میں۔

وہ چلا کر بولا۔

دروازہ نہیں کھولتی وہ چھو کری۔

معروف جان پھر تیز سانس کو روکتے ہوئے بولی۔

کیا ..... کیا

شریف گل جلدی سے کمرے کی طرف بھاگا۔ ایک دو مرتبہ کنڈی

ہلائی۔

بھاگ گئی ..... میں کہتا ہوں اندر ہے ہی نہیں۔

شریف گل نے ایک دو پھر جب تیسری ٹھوکر ماری تو دروازہ ٹوٹ

کر باہر کی طوفان لڑھک گیا۔

دونوں میاں بیوی اندر داخل ہوئے۔

یہاں سے بھاگی ہے ..... یہ دیکھ۔



روبی قریب آئی۔

ہوں۔

وہ سوچتی ہوئی ایک دم چونک گئیں۔

سوہنی کو بھاگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ..... ویسے اچھا ہوا۔

روبی کو بال کی کھال اتارنے کی عادت تھی۔

میں کیا جانوں۔

وہ اتنا ہی کہہ سکیں اور چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

ضرور کوئی وجہ ہو گی ..... ویسے مشکوک تو وہ تھی ہی ..... میں اسے

بیدار کے ساتھ باتیں کرتی دیکھتی تھی ..... بے شک بیدار سنجیدہ ہوتے تھے۔

روبی سامنے ہی بیٹھ گئی۔

بیگم نور الدین کے پاس روبی کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ

صرف سنتی رہیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔

آئی۔

روبی نے پھر پکارا۔

بیگم نور الدین نے صرف گردن گھما کر روبی کو دیکھا۔

بیدار کب آئیں گے ..... میں تو بوریت محسوس کر رہی ہوں۔

روبی نے خفا خفا سالجہ اختیار کر لیا۔

نور تو چند دنوں کا ہی تھا ..... نہ جانے اتنے دن کیوں لگا دیے۔

وہ حیران کن انداز میں بولیں۔

روبی ایک ٹانگ ہلا ہلا کر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کچھ سوچتی ہوئی

لگ رہی تھی۔

تم بھی چند دنوں کے لیے چلی جاتی تو اچھا تھا۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

(21)

روبی اور بیگم نور الدین لان میں اپنی اپنی طبیعت اور پسند کے مطابق

چل قدمی کر رہی تھیں کہ ملازمہ بڑی تیز رفتاری سے پاس آئی۔

بیگم صاحبہ ..... بیگم صاحبہ ..... سوہنی بھاگ گئی۔

وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

کیا بکتی ہے ..... کیسے بھاگ گئی ..... گیٹ سے باہر کیسے نکل گئی۔

وہ چونک کر کھڑی ہو گئیں اور روبی ان کے پاس آگئی۔

یہ لڑکی مجھے ہمیشہ سے ہی مشکوک نظر آتی تھی۔

روبی کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔

جاؤ کسی کمرے میں دیکھو ..... وہ بھاگ نہیں سکتی ..... گیٹ پر جن

کا کاکی ڈیوٹی تھی۔

وہ گرج دار آواز میں بولیں۔

ملازمہ خاموش ہو گئی۔ اور روبی جو گنگ کے لیے دوسری طرف

چل دی۔

جاؤ کھڑی کیوں ہو۔

بیگم نور الدین کچھ سوچنے لگیں۔

آئی!

سیٹ پیش کی ..... وہ بیٹھ گیا اور ہم چلا گیا ..... ہم نے کسی سوہنی کو نہیں دیکھا جی ..... گیٹ سے وہ نہیں گئی۔

جمنبو کا کا نے اس طرح یقین دلایا کہ بیگم نورالدین خاموش ہو گئیں۔

مجھے اجازت ہے جی۔

جمنبو کا کا نے کہا۔

جاؤ۔

بیگم نورالدین نے کہا۔

جمنبو کا کا واپس پلٹ کر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ گیا۔

روبی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور وہ ابھی تک سوچوں کے عمیق غار میں اترتی جا رہی تھی۔

بیدار بخت سے وہ محبت کرتی تھی ..... لیکن بیدار بخت کی کیفیت

مجھے مشکوک کیوں لگتی ہے ..... سوہنی ان سے محو گفتگو کیوں ہوتی تھی۔ وہ

ان کو ایک رات کیا کہہ رہی تھی ..... میرے جانے پر وہ باہر نکل گئی۔

وہ کچھ سمجھ نہ آنے پر لیٹ گئی۔

نہیں ..... میں پاکستان دیکھ کر جاؤں گی ..... خوبصورت مناظر کا گھر ہے پاکستان ..... بیدار آئیں تو پھر سیر کے لیے نکلیں گے۔

وہ جھوم کر بولی۔

بہت دیر کر دی ہے بیدار نے ..... ہم خود اس کے منتظر ہیں۔

بیگم نورالدین نے کہا۔

آداب بیگم صاحبہ۔

جمنبو کا کا مودب قریب آیا۔

جمنبو کا کا .....

بیگم نورالدین نے سادگی سے کہا۔

جی بیگم صاحبہ ..... بندہ حاضر ہے جی۔

جمنبو کا کا حسب عادت بولا۔

سوہنی گیٹ سے کیسے نکل گئی ..... حیرت ہے اس بات کی۔

ہم کچھ نہیں جانتا بیگم صاحب جی ..... ہمارے ہوتے ہوئے چڑیا پر

نہیں مار سکتی ..... سوہنی تو بہت بڑا جانور ہے بیگم صاحب جی۔

روبی کھل کھلا کر ہنس دی۔

جمنبو کا کا کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔

او بیگم صاحب جی ..... انسان جانور ہی تو ہے۔

وہ ہنس دیا۔

خان بابا کہہ رہا ہے میں اسے گھر چھوڑ کر آیا ہوں ..... تم کہہ رہے

ہو ہم نے نہیں دیکھا ..... نور محل کی فلک بوس دیواروں کو پھلانگ کر وہ

نہیں جاسکتی ..... کہاں گئی پھر وہ۔

آخر میں وہ غصیلہ انداز اپنا گئیں۔

دیکھیں بیگم صاحب جی ..... صبح پانچ بجے خان آیا اور ہم نے اپنی

صدیوں کا کرب سینے میں چھپائے وہ ساحل سمندر سے لپٹ کر

خوب روئی۔ وہ اتنا روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ ادھر سورج کی ٹکیہ تاریکی

میں ڈوب چکی تھی۔ ساحل کی روشنیاں جل اٹھیں تھیں۔ ساحل اپنی روایتی

انداز میں روشن ہو چکا تھا۔

بی بی۔  
پندہ سولہ سن کے نوجوان لڑکے نے ساحل پر آکر پکارا۔  
وہ ایک دم سے چونک گئی..... جلدی سے چہرہ صاف کیا۔  
جی..... آ رہی ہوں۔  
وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

بی بی تم یہاں ہو..... میڈم بلا رہی ہیں۔ ساحل بھر گیا لوگوں سے۔  
جی نے روشنی میں اس کے آتشیں رخساروں کو غور سے دیکھا  
لیکن ابھی جوانی نو خیز تھی سمجھ نہ سکا۔ صرف حیران رہ گیا۔  
آؤ چلیں۔

اے جی..... ادھر آ۔  
آیا میڈم جی۔  
جی اندر برتن رکھ کر باہر آگیا۔  
بی بی چلی گئی کواٹر میں۔  
نہیں جی..... میں جاؤں گا تو جائے گی..... باہر بیٹھی ہے..... بلاؤں

دونوں چلتے چلتے ہٹ کے پاس پہنچ گئے۔  
جلدی کرو..... جلدی کرو..... لوگ آئس کریم مانگ رہا ہے..... چلو  
جی..... غفار ٹرے بی بی کو دو..... لوگ بے چین ہیں۔  
بمتر ہے میڈم۔

جی ہنس دیا۔  
ڈرتی ہے۔  
میڈم ہنس دی۔  
بی بی..... ادھر آ..... میڈم بلا رہی ہیں۔  
جی نے وہیں سے آواز دی۔  
بی بی میڈم کے پاس چل دی۔  
تو نے اتنے دن ہو گئے ہیں..... اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔  
میڈم نے کہا۔

کیا بتاؤں میڈم جی..... ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے..... ہم  
لیکے ہیں۔ جو درندوں سے بچ کر آپ کے پاس آ گئے ہیں۔  
بی بی کے انداز میں اتنا کرب اور دکھ شامل تھا کہ میڈم کی آنکھوں  
میں آنسو آ گئے۔

غفار چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں دونوں کو دیتا رہا اور جی بی بی دونوں  
مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو آئس کریم پیش کرتے رہے۔ میڈم  
میری ایک باوقار غیر ملکی عورت تھی۔ تعلق جرمن سے تھا لیکن والدین اور  
عزیز رشتہ دار یکے بعد دیگرے ختم ہو گئے۔ وہ مستقل ساحل پر ہی مقیم ہو کر  
رہ گئی۔ شروع سے ہی آئس کریم کا کام کرتی تھی اور ساحل پر کام بھی بہت  
چل رہا تھا۔ سارے دن کے تھکے ہارے پریشان لوگ جب کاروباری  
مصروفیات سے تنگ آ جاتے تو وہ میڈم میری کی آئس کریم کھانے چلے  
آتے۔ اب تو کام اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جی اور بی بی کے علاوہ اور بھی  
ملازم رکھ لئے تھے۔ ملازموں کی تنخواہیں دینے کے بعد بھی اسے خاصی آمدنی  
ہو جاتی تھی۔ اس آمدنی سے اچھا خاصہ خوبصورت ہوٹل بنا لیا تھا اور ساحل

یہ کون ہے ..... اتنے خوبصورت ہاتھ۔  
بیدار کے منہ سے لاشعوری طور پر نکلا۔  
روبی نے پلٹ کر جاتی بی بی کو دیکھا۔

وہی چال ..... وہی رفتار ..... تیز رفتاری لیکن سنبھل کر ایڑی  
اٹھاتا۔ وہ سوچنے لگے۔

اب آپ کا دل اس ملازمہ کے ہاتھوں پر آگیا۔ خوبصورت چیز سے  
محبت تو آپ کی باہی ہے۔  
روبی ہنس دی۔

لیکن اندر چھپی ہوئی چوٹ تھی۔

پھول کو پھول ہی کہا جائے گا اور خار کو خار۔

بیدار بخت چوٹے اور رخ روبی کی طرف کر لیا۔

روبی بیچ سے آئس کریم منہ میں ڈال رہی تھی۔

میڈم میری کی آئس کریم تو مزے دار ہے ہی ..... لیکن برتن  
دیکھئے۔ ایسے خوبصورت آئس کریم سیٹ میں نے امریکہ میں نہیں دیکھا۔

روبی آئس کریم سے محظوظ ہو رہی تھی۔

سب کچھ موجود ہے ہر جگہ ..... صرف دیکھنے والی آنکھ چاہئے۔

بیدار بخت سادگی سے بولے۔

ٹھیک ہے ..... حسن پرست تو آپ ہیں ہی ..... اس لئے ہر جگہ  
خوبصورت چیز نظر آ جاتی ہے جناب کو۔

روبی مسکرا کر بولی اور بیدار بخت بھی ہنس دیئے۔

بیدار۔

روبی نے کپ کو واپس میز پر رکھا۔

فرمائیے۔

بس ..... ہم سب جانتا ہے۔ تم ہمارے پاس اکیلا نہیں ہے۔  
ہم سب بہن بھائی ہیں ..... جی ..... بی بی تمہاری بہن ہے ..... ہے  
ناجی۔

ہاں جی ..... بی بی تو ہے ہی میری بہن ..... میری اپنی۔

رات گذرتے دیر نہیں لگی ..... ساحل پر گہما گہمی شروع ہو چکی  
تھی۔ ساحل پر آئس کریم کا کام صبح پانچ بجے ہی شروع ہوتا تھا۔ سارا دن  
میڈم نوکروں کی نگرانی میں ہوٹل اور ساحل کو اچھی طرح درست کردانی  
تاکہ کسی گاہک کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ برتن اور وہ جگہیں جہاں لوگ  
بیٹھتے۔ صفائی دید کے قابل تھی۔ یہی بات تھی کہ دور دراز سے لوگ آکر  
کریم کھانے آتے تھے۔ سارے کراچی میں میڈم کی آئس کریم مشہور تھی۔  
سورج کا سنہری دکھتا ہوا گولہ مغرب کی وادیوں میں روپوش ہو رہا  
تھا۔ ساحل کا موسم بڑا ہی خوبصورت ہو رہا تھا ..... لوگ بیٹھے تھے۔ غفا  
طشتریوں میں ڈال کر جی اور بی بی کو پکڑا رہا تھا۔

میز پر طشتری رکھتے ہی وہ بری طرح چوکی ..... اس کے سامنے  
خوبصورت کرسیوں پر بیدار بخت اور روبی بیٹھے تھے۔

اس نے اچھی طرح چہرے کو ڈھانپا صرف دو آنکھیں رہ گئیں۔  
جادو جگا رہی تھیں۔

لاؤ ..... ان کو میں دوں گی۔ اسی بہانے بیدار کی زیارت ہو جائے  
گی۔

اس نے جی کے ہاتھ سے آئس کریم پکڑ لی۔

دو خوبصورت چاندی کی طرح چمکتے ہوئے منعش کپ بی بی نے  
روبی اور بیدار بخت کے درمیان میز پر رکھ دیئے۔

روبی اور بیدار بخت نے ایک بارگی سفید سندی ہاتھوں کو دیکھا۔

توبہ توبہ بیگم صاحب جی..... ہمیں معاف کیجئے گا..... آپ ایسا نہیں  
 نہیں گئے۔ پہلے ہی ہم سے غلطی ہو گئی جی۔  
 وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑ گڑانے لگی۔  
 یہ مت بھولو کہ اگر ہم ملازموں کے لئے شفیق گوشے رکھتے ہیں  
 لیکن ہمارے اندر زبردست قہر بھی بھرا ہے۔  
 وہ غصے اور طیش میں مٹھیاں بھینچ کر بولیں۔  
 چلو..... جاؤ بوا نصین اپنے کام پر..... منہ دھولو جا کر۔  
 پیٹر نے نرمی سے کہا۔  
 بیگم نور الدین دوسری طرف صوفے پر بیٹھ گئیں۔  
 نصین آہستہ سے باہر نکل گئیں۔  
 پیٹر نے درمیان میں رکھی چائے دانی میں سے دو کپ تیار کئے۔  
 ایک کپ بیگم نور الدین کے سامنے رکھا اور دوسرا خود لے لیا۔  
 پیٹر..... ہمیں بیدار کے اس اقدام سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔  
 اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر رہے ہیں..... ہم نہیں چاہتے کہ کوئی معمولی  
 کی بھٹک روٹی کے کان میں پڑے۔  
 آپ معاف کر دیجئے جوانی کی بھول سمجھ کر۔  
 پیٹر نے چسکی لی۔  
 کیسے معاف کر دوں..... وہ بھاگ گئی ہے..... کل کو سنگین مسئلہ  
 کھڑا ہو گیا تو۔  
 بیگم نور الدین انتہائی مضطرب نظر آ رہی تھیں۔  
 ہوں..... یہ بات تو ہے..... (بھاگنا تو سوہنی کے لئے معمولی بات  
 ہے)۔  
 پیٹر نے سوچا۔

وہ بھی پرسکون انداز میں ٹیک لگا کر بولے۔  
 آپ خوبصورت چیزوں کو پسند کرتے ہیں نا۔  
 روٹی نے جیسے پرکھنا پاپا۔  
 ہاں..... میں خوبصورت چیزوں کو پسند کرتا ہوں۔  
 وہ ہنس دیئے۔

روٹی نے دیکھا..... بیدار بخت بذات خود ایک خوبصورت وجہ  
 انکل نوجوان تھا..... اس کا تناور صحت مند جسم جس پر سفید شلوار قمیض بلا  
 کی دلکش لگتی تھی۔ مستقل امریکہ میں رہنے یا انکل نور الدین کا بیٹا ہونے کی  
 وجہ سے سنہری بال سلیقے سے سجائے کتے دل فریب لگتے تھے۔ ان کی گہری  
 جھیل کی طرح سرخ آنکھیں..... سفید رنگت آنٹی کے مشابہ تھی..... بیدار  
 بخت مکمل خوش شکل نوجوان تھا۔  
 آپ کیا سوچنے لگیں۔  
 بیدار بخت نے کہا۔  
 روٹی مسکرا دی۔

شام میلی ہوتے ہی وہ نور محل کی طرف چل دیئے۔ آج کل بیگم  
 نور الدین کا موڈ بھی بہت اپ سیٹ تھا۔ وہ بیدار سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی  
 تھی لیکن روٹی کی موجودگی ان کے رستے میں حائل تھی۔ دوسرے ملازم تو  
 زبان نہیں کھول سکتے تھے لیکن ان کو خدشہ تھا تو صرف نصین سے۔ اس  
 لئے آج اپنے کمرے میں بلا کر انہوں نے پیٹر کے سامنے سخت الفاظ میں  
 ڈانٹ دیا۔

سن لو نصین..... اگر بیدار بخت اور سوہنی کی کوئی بات تمہاری  
 زبان سے نکلی تو زبان گدھی سے کھینچوا دوں گی..... سمجھی۔  
 وہ بڑے جلال میں تھیں۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

ٹھیک ہے ..... بیٹھو گے نہیں۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

Thank you اب اجازت دیجئے ..... صاحب کو وقت دینا ہے۔

پیٹر نے دو قدم اٹھائے۔

اور مودب باہر نکل گیا۔

جیسے بھی ممکن ہو اس کم بخت کو تلاش کرنا چاہئے۔

وہ جھنجھلا کر بولیں۔

پھر کیا ہو گا۔

پیٹر نے خالی کپ رکھا۔

بیدار طلاق دے گا۔ وہ ایک دم بولیں۔

آپ نے صاحب سے بات کی۔

نہیں ..... ویسے وہ میرے رویے سے جان تو چکا ہو گا یا تم نے اسے

سب کچھ گوش گزار کر دیا تھا ..... میں نے براہ راست اس سے کوئی بات

نہیں کی۔ نہ ہی کوئی موقع ملا ہے۔

میں نے ان سے بات کی تھی۔

پیٹر نے کہا۔

پھر ..... کیا کہا اس نے۔

وہ اس اقدام سے خود بہت شرمندہ ہیں لیکن پریشان بہت ہیں ..... سوہنی کا فرار ان کو بھی اچھا نہیں لگا۔

یہی ایک راستہ ہے کہ پولیس کو اطلاع دی جائے۔

بیگم نور الدین دانت چکاچا کر بولیں۔

نہیں نہیں بیگم صاحبہ ..... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح نور فیلی

کی زبردست توہین ہے اور ہم لوگ یہ توہین برداشت نہیں کر سکتے۔

پیٹر نے ایک دم پہلو بدلا۔

اب کیا ہونا چاہئے۔

وہ آہستہ سے گویا ہوئیں۔

بس چپکے چپکے تلاش جاری رکھیں گے ..... جوں ہی سوہنی مل گئی

آپ کے سامنے حاضر کر دیں گے۔

موسم سرمئی سا ہو رہا تھا۔ اودھے اودھے بادلوں نے آسمان کے

پنے کو قدرے ڈھانپ لیا تھا۔ ٹھنڈی سرد ہوا چل رہی تھی۔ کراچی کا موسم

نڈرے اور حسین ہو چکا تھا۔ ساحل پر آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ شام ہوتے

ی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ ساحل پر بیٹھے لوگ اس بوندا باندی

سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ساحل پر کوئی بھی سنگ مرمر کی خوبصورت

پھتریوں کے نیچے نہیں جا رہا تھا۔ چنانچہ موسم اور دھندلا ہو گیا۔ بادلوں نے

چاروں طرف سے ساحل کو گھیر لیا۔ لوگوں کے لئے اس سے لطف لینے والی

اور کیا جگہ ہو گی۔ کہ بوندا باندی رک گئی اور موسم کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا

تھا۔ باغات میں سرمئی سا ماحول تھا۔ پیٹر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

بیدار بخت نے زینہ اترتے گھڑی دیکھی اور تیز رفتاری سے گاڑی

کے پاس آئے۔ انہیں دیکھ کر پیٹر نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئے

اور خود پیٹر سنیرنگ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کہاں چلے گا۔

پیٹر نے چابی گھمائی۔

ساحل پر چلو۔

بیدار بخت نے گیٹ سے نکلتے پلٹ کر نور محل کی طرف دیکھا۔

کس بات کا خدشہ ہے جناب کو ..... یہ اچانک ساحل کیوں یاد

آگیا۔

زندگی خدشات سے گھر گئی ہے ..... آج میں تمہیں روپی کی عدم

موجودگی میں ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔

دو حسین ہاتھ ان کی نگاہوں کے سامنے لہراٹھے۔

وہ کیا ہے؟

پیٹر چوڑی کشادہ سیاہ سڑک پر گاڑی دوڑاتے ہوئے بولا۔

یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا ..... تم دیکھو گے تو شاید جان جاؤ۔

بیدار بخت نے بالوں کو درست کیا جو تیز ہوا کے جھونکوں سے

پیشانی پر الجھ آئے تھے۔

پیٹر اس امتحان کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

اور گاڑی ساحل کے ایک طرف پارک کی جہاں دوسری گاڑیاں

پارک تھیں ..... دونوں آہستہ آہستہ مست ہوا کا لطف اٹھاتے ایک سیٹ پر

بیٹھ گئے۔

چند لمحوں میں وہ سیاہ چادر میں لپی ہوئی آئی خوبصورت کپ میز پر

رکھے اور پلیٹی۔

رکھے پلیز۔

پیٹر نے ایک دم کہا۔

وہ رک گئی اور ہاتھوں کو چادر میں چھپا لیا۔

اس کی نگاہوں میں وحشت اس بات کی غماز تھی کہ پیٹر اس کو

پہچان چکا ہے۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

آپ سوہنی ہیں۔

پیٹر بڑے وثوق سے بولا۔

جی۔

وہ کہتی ہوئی تیز رفتاری سے ہوٹل کے دوسری طرف بھاگ گئی۔

میں یقین سے کہتا ہوں کہ سوہنی ہے۔

پیٹر نے کہا۔

سو فیصد یہ سوہنی ہے ..... مجھے صرف تمہاری شہادت درکار تھی۔

بیدار بخت نے کہا۔

کیسے بھول سکتے ہیں ہم لوگ ..... اتنا عرصہ اس کے ساتھ گزارا

ہے۔ اس سے باتیں کی ہیں ..... پھر آپ ..... آپ اس کو بہتر جانتے ہیں۔

پیٹر دوبارہ بیٹھ گیا۔

بیدار کے لئے سب سے مشکل مرحلہ آن پہنچا تھا۔

میں پہلے روز ہی جان چکا تھا۔ یہ سوہنی ہے ..... روپی کے سامنے

بات نہ کر سکا ..... اتنا وقت یوں ہی گذر گیا۔

وہ آپ سے چھٹی پھرتی ہے۔ خوفزدہ ہے آپ سے۔

پیٹر نے کہا۔

کیسا خوف ..... ہم نے اسے نہیں کہا کہ بھاگ جائے ..... بھاگنے کی

اسے عادت ہے۔

آپ سے طلاق کے خوف سے۔

پیٹر یک لخت کہہ گیا۔

کون اس کو طلاق دے رہا ہے ..... اگر ہم اس کو طلاق دینا چاہتے تو

یہاں بی بی کے نام پہچانی جاتی ہے۔  
پیٹر نے کہا۔

اسی دن دے دیتے ..... لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا ..... صرف اس کو خاموش  
رہنے کو کہا ..... پھر نہ جانے وہ کیوں نور محل چھوڑ کر بھاگ گئی۔  
بیدار بخت بہت افسردہ نظر آ رہے تھے۔

وہ طلاق کے خوف سے بھاگی ہے ..... بیگم صاحبہ کی باتیں اس نے  
سن لیں تھیں۔  
پیٹر نے کہا۔

..... ہوں ..... شاید یہی وجہ ہے ..... لیکن ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے  
..... اس نے اپنے قصور کی کڑی سزا پالی ہے۔ وہ بھاگ رہی ہے ..... اس کا  
مطلب ہے کہ وہ ہم سے ناتا توڑنا نہیں چاہتی ..... وہ ہمیں جدا کرنا نہیں  
چاہتی۔

بیدار بخت کو اس وقت سوہنی بری طرح یاد آ رہی تھی۔ وہ چاروں  
جانب سوہنی کو بے کس و مجبور دیکھ رہے تھے۔ دل کا کوئی نرم گوشہ ان کے  
لئے بے چین تھا۔  
اب کیا کرنا چاہئے۔

پیٹر ہوٹل کے بیرون دیکھ کر بولا۔ جہاں سوہنی غائب ہو چکی تھی۔  
یہی بہتر ہو گا کہ سوہنی کو واپس لے آؤ ..... ہم اس کے لئے علیحدہ  
رہائش کا بندوبست کریں گے۔  
بیدار بولے۔

ٹھیک ہے ..... میں کل اس سے ملوں گا۔  
پیٹر نے کہا۔

اس وقت کیوں نہیں۔

بیدار بخت جلدی میں تھے۔

اس وقت بہتر نہیں ہے۔ کل کسی وقت میں اس سے ملوں گا .....  
جی پھر رونے لگا۔

ٹھیک ہے ..... کل اسی وقت آنا ..... میں اس کا منتظر رہوں گا۔  
لیکن شوخی تقدیر جس کے مقدر میں قرار نہیں وہ ہمیشہ خزاں  
رہدہ پتے کی طرح سرگرداں رہتا ہے۔ آوارہ بخ بستہ آندھیاں نہ جانے  
اپنے فحش کو کہاں کہاں اڑا کر لے جاتی ہیں۔ وہ شاخ سے ایسی گری کہ  
گانہ ملا۔

دوسرے دن پیٹر ہوٹل میں آیا۔  
میڈم کھڑی تھی اس کے پاس ہی جی رونی صورت بنائے بال  
نمائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ ابھی کام شروع نہیں ہوا تھا۔ میڈم نے ایک  
مٹکاں اٹھائیں۔

کیا بات ہے ..... کس سے ملنا ہے آپ کو۔  
میڈم میری چونک کر بولی ..... کاؤنٹر کے پاس کھڑے پیٹر نے دیکھا۔  
لھے آپ کی ملازمہ بی بی سے ملنا ہے۔  
یہ سنتے ہی جی سسک سسک کر رو دیا۔

وہ اس کا ہن تھا ..... جی رو رہا ہے ..... کل شام ہی سے وہ نظر  
میں آتی ..... سمجھ میں نہیں آتا ..... اسے کوئی لے گیا یا خود چلا گیا ہے وہ۔  
میڈم میری نے جی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔  
وہ چلی گئی۔

پیٹر سکتے میں آگیا۔  
ہاں ..... وہ چلی گئی ..... شام کے بعد میں نے بی بی کو نہیں دیکھا۔  
لہذا اس کے کواڑ میں دیکھا ..... وہ کچھ بھی تو نہیں لے کر گئی۔  
جی پھر رونے لگا۔



جی کھڑا ہو گیا۔  
تیار ہو جاؤ ..... لوگ شروع ہو گئے ہیں ..... بی بی کی جگہ اس  
ہانڈ پر کسی اور کو لگاؤ۔  
میڈم میری نے اسے محبت سے کہا اور باہر نکل گئی۔

پھر وہ ضرور آئے گی ..... جی صبر کرو ..... مائے سن - My Son  
میڈم میری نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دی۔  
پیٹر چند لمحے کھڑا رہا اور پھر اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا۔  
جب بھی واپس آئے اس کو میرا کارڈ دے دیجئے گا ..... یا اس پتے پر مجھے  
اطلاع کیجئے اور ہاں اس کا نام سوہنی۔

پیٹر نے میڈم میری کو کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ میڈم میری نے کارڈ  
جی کو دیا۔ جی نے کارڈ دیکھا اور جیب میں ڈال لیا۔  
پیٹر واپس چلا گیا۔

جی نے چرا جھکایا اور سسکتا رہا۔  
کاش بی بی مل جائے ..... میں پوچھوں کہ ہم نے اسے کیا کہا .....  
وہ کیوں یہاں سے گئی ہے۔ ہم تو اس کے اپنے تھے۔  
میڈم میری افسردہ نظر آنے لگی۔ اس کا نام سوہنی ہے ..... بی بی  
نہیں۔

جی نے نگاہیں اٹھائیں۔ ہمیں کیا ہم تو بی بی کیس گے اور میڈم جی  
بی بی کا تو اس دنیا میں تھا ہی کوئی نہیں ..... پھر وہ کس کے پاس گئی ہوگی۔  
جی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

یہی بات پریشان کئے ہوئے ہے ..... جب اس کا ہے ہی کوئی نہیں تو  
پھر وہ کس کے پاس گئی ہے۔  
میڈم میری نے کہا۔

لوگ آنے شروع ہو چکے تھے ..... میڈم نے کاؤنٹر پر چاروں جانب  
نظریں گھمائیں۔  
جی۔

وہ مسکرایا۔

کیا مطلب ہے تمہارا۔

وہ قریب آگئی۔

اگر پانی سر سے گذر گیا تو صاحب کی عزت بچانے کے لئے بتانا

پڑے گا۔

شمشیر نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

خدا نخواستہ ..... عزت کو کیا ہوا ہے۔

طاہرہ ایک دم چونک گئی۔

اللہ نہ کرے کہ عزت کو کچھ ہو ..... میں سیٹھ زمان کی عزت

بچانے کے لئے جان کی بازی لگا دوں گا طاہرہ بی بی۔

وہ جوش سے بولا۔

تمہیں خالد سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

طاہرہ نے پلنگ پر بیٹھ کر کہا۔

بیر نہیں ہے طاہرہ بی بی ..... تو میری بہن کی جگہ ہے ..... اس لئے

تمہیں بتا رہا ہوں کہ خالد اور اس کی ماں اچھے انسان نہیں ہیں۔

تمہیں کوئی انسان اچھا بھی لگتا ہے ..... ہر آدمی تمہیں مشکوک ہی

نظر آتا ہے۔

طاہرہ نے لاپرواہی سے کہا۔

وہ ہے ہی مشکوک ..... کوئی فراڈیہ ہے وہ۔

باہر برآمدے میں فون کی آواز سنتے ہی باہر لپکا۔

طاہرہ خالد کے بارے میں سوچتی ہوئی لیٹ گئی۔

خیالات کا ایک ہجوم اس کے ذہن کو گھیرے ہوئے تھا۔ وہ سوچنے

پر مجبور ہو گئی۔

(22)

طاہرہ بی بی یہ آدمی اچھا نہیں ہے بلکہ اس کی ماں بھی چکر باز لگتی

ہے۔

شمشیر نے اندر داخل ہو کر کہا۔

طاہرہ نے اپنے پرس کو پلنگ پر رکھا۔

شمشیر علی ..... دیکھو اگر امی تمہیں میرے ساتھ بھیجتی ہیں تو اس کا

مطلب ہرگز نہیں کہ تم میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرو۔

وہ پلٹ کر غصیلے انداز میں بولی۔

میں نے بہت ماہ آپ کا نمک کھایا ہے ..... حرام نہیں کروں گا

..... مالک کی عزت مجھے جان سے بھی عزیز ہے۔ طاہرہ بی بی۔

شمشیر نے کہا اور واپس چل دیا۔

سنو ..... طاہرہ نے پکارا۔

جی ..... حکم۔

وہ پلٹا۔

امی پیپا کو تو نہیں بتا دیا تم نے۔

وہ پریشان ہو گئی۔

ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا ..... خدا نہ کرے معاملہ سنگین ہو جائے۔

چند منٹوں میں کالج آگیا۔  
کتنے بجے آؤں۔

وہ بولا۔

تم مت آنا..... میں خود آ جاؤں گی..... پارٹی ہے نا۔  
طاہرہ نے کہتے ہوئے جلدی سے قدم آگے بڑھائے۔  
وہ دیکھتا رہ گیا۔

ضرور دال میں کالا ہے۔

گاڑی شارٹ کی اور کوشی واپس چلا گیا۔  
شام کے دھندلے چھانے لگے تھے۔ بیگم زمان زینہ اتر کر نیچے

آئیں۔

شمشیر علی۔

وہ اونچی آواز میں بولیں۔

جی بیگم صاحبہ۔

شمشیر نے آتے ہی کہا۔

طاہرہ کو لینے نہیں گئے..... شام ہو گئی ہے..... ابھی تک آئی کیوں

نیں۔

کالج میں پارٹی تھی بیگم صاحبہ۔

اچھا..... جاؤ اسے لے کے آؤ..... تمہیں معلوم ہے..... زمان

ماحب طاہرہ کے لئے کتنے حساس ہیں..... جلدی سے لے آؤ اسے۔

بہتر جناب۔

وہ گاڑی شارٹ کئے خالد کے گھر کی طرف چل دیا۔

ٹھک سے گاڑی روکی اور بیل دے دی۔

چند لمحوں گزرے تھے کہ خالد کی ماں نے دروازہ کھولا۔

ہر گام پر..... ہر موڑ پر..... ہر وقت..... ہر لمحہ..... شمشیر علی غلط نظر آیا..... خالد کس قدر صاف اور محبت کرنے والا محسوس ہوا۔

شمشیر جھوٹ بولتا ہے کہ خالد دھوکے باز ہے..... یہ غلط ہے.....  
خالد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔ کیا ہوا جو میں کبھی کبھار اپنے جیب خرچ سے اس کی ضرورت پوری کر دیتی ہوں۔ وہ مانگتا تو نہیں۔  
اس طرح بہت دن گزر گئے۔

ٹرن ٹرن ٹرن۔

بار بار فون کی گھنٹی بجنے لگی..... وہ کالج جانے کے لئے تیار ہونے لگی۔ لپک کر باہر آئی..... ادھر ادھر دیکھا..... پاس کوئی نہ تھا۔

ہیلو۔

طاہرہ نے کہا۔

میں خالد بول رہا ہوں..... میں تم سے بہت جلد ملنا چاہتا ہوں۔

اس کی آواز میں بے چینی اور اضطرابیت کا عنصر شامل تھا۔

خیریت تو ہے..... تم گھبرائے ہوئے لگتے ہو۔

بس سب ٹھیک ہے..... تم جلدی پہنچو..... اب تمہارے بغیر رہنا

مشکل نظر آتا ہے۔

وہ مدہوش آواز میں بولا۔

اچھا..... آرہی ہوں۔

اس نے فون رکھا اور چند کتابیں لئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

صرف دو کتابیں..... پورے دن کے لئے..... بس اتنی کتابیں

پڑھائی۔

شمشیر نے دو کتابوں کو دیکھ کر گاڑی شارٹ کر دی۔

طاہرہ نے دیکھا اور پھر چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

کیا بات ہے بھائی۔  
 وہ باہر تاریکی کی وجہ سے شمشیر کو جان نہ سکی۔  
 ڈرائیور آیا ہے بی بی جی ..... طاہرہ بی بی کو بھیجے۔  
 شمشیر نے باہر نکل کر گاڑی سے ٹیک لگائی۔  
 حمیدہ بیگم اندر گئی۔  
 طاہرہ تم نے اپنے ڈرائیور کو آنے کا وقت دیا تھا۔  
 نہیں آنی ..... میں تو کالج سے آئی ہوں۔  
 طاہرہ حیرت سے بولی۔  
 بس وہ خبیث ہو گا۔  
 خالد رویوں کی گڈیاں الماری میں رکھ کر بولا جو طاہرہ اپنے ساتھ  
 لائی تھی۔  
 کسی دن جا کر میں بیٹی کو مانگ ہی لوں گی ..... یہ اللہ مارا کھو بی یا  
 ہوا ہے میرے بچوں کا۔  
 وہ محبت سے طاہرہ کو پکارتے ہوئے بولی۔  
 طاہرہ نے ایک ہاتھ حمیدہ کے ہاتھ پر رکھا اور کھڑی ہو گئی۔  
 خالد طاہرہ کے ساتھ گیٹ تک آیا۔  
 اب تمہارے بنا رہا نہیں جاتا ..... کیا کروں ..... کچھ بن جاؤں تو  
 اماں جائے۔  
 مجھے صرف تمہاری محبت چاہئے ..... تمہارے پاس یہ خزانہ بہت  
 زیادہ ہے اور مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔  
 طاہرہ نے ایک جگہ کھڑے ہو کر خالد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔  
 دیکھو طاہرہ مجھے بھولنا نہیں ..... میں نے جو تمہیں کہا ہے ..... اس  
 پر عمل کرنا اچھا۔

خالد نے طاہرہ کے بال درست کئے۔  
 تم فکر نہ کرو۔ ہم ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔  
 نہیں طاہرہ ڈارلنگ ..... دنیا ہمیں ایک نہیں ہونے دے گی .....  
 تم سے دوری میری موت ہے۔ میں تم سے جدا نہیں رہ سکتا۔  
 دروازے پر دستک ہوئی۔  
 اچھا خدا حافظ۔  
 طاہرہ جلدی سے باہر نکل گئی۔  
 تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہاں ہوں۔  
 طاہرہ سیٹ پر زور سے بیٹھتے ہوئے بولی۔  
 حالات بتا رہے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔  
 شمشیر نے پلٹ کر کہا۔  
 چلو ..... سقراط بننے کی کوشش نہ کرو۔  
 وہ غصے سے بولی۔  
 اور شمشیر نے گاڑی شارٹ کر دی۔  
 امی کو کیا کہا تم نے۔  
 طاہرہ بولی۔  
 یہی کہ کالج میں پارٹی ہے ..... بی بی لیٹ آئیں گی۔  
 شمشیر نے موڑ کاٹا۔  
 میں تو حیران ہوں کہ تم امی کو بتاتے کیوں نہیں ہو ..... آخر بات  
 کیا ہے۔  
 طاہرہ نے تذبذب کے عالم میں شمشیر کی پشت کو دیکھا۔  
 میں چاہتا ہوں کہ یہ جھٹکا ان کو نہ ہی لگے تو بہتر ہے۔  
 کیسا جھٹکا۔

بھی سیف سے نکال لیں ..... اس کے کانوں نے مخصوص دسل کی آواز سن لی تھی۔

وہ ایک دم سے چوکی۔  
یہی آپ جس راستے پر جا رہی ہیں ..... یہ تباہی کا راستہ ہے۔  
شمشیر نے کہا۔  
تمہیں اس سے کیا ..... تم ملازم ہو ..... تمہارا کام صرف تنخواہ لینا ہے۔

وہ بیگ پکڑے دے قدموں زینہ اترتی اور بڑے ہال میں سے ہوتی ہوئی لان میں اتر گئی۔  
اچانک طاہرہ لڑا اٹھی ..... کسی مضبوط ہاتھ نے اس کو دبوچ لیا تھا۔  
رک جاؤ طاہرہ بی بی ..... میں تمہیں ایک قدم آگے نہیں جانے دوں گا۔

چھوڑ دو ..... ذلیل ..... تم آج میرے راستے کی دیوار نہیں بن سکتے۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔  
وہ دانت پیس کر غصے میں آہستہ بولی۔ مبادا کہ کوئی سن نہ لے۔  
ایک دم لان کی بتی روشن ہو گئی۔  
بیگم زمان اور سیٹھ زمان خون آلود نگاہیں لئے کھڑے تھے۔  
دوسری طرف سے چوکیدار اور دو ملازم خالد اور ایک نوجوان لڑکی برقعہ میں ملبوس تھی، پکڑ کر لے آئے۔  
خالد۔

وہ منہ میں بڑبڑاتی۔

برقعہ پوش لڑکی نے بغور اس سارے رد عمل کو دیکھا اور معاملے کی تک پہنچ گئی۔

طاہرہ برجستہ بولی۔  
یہ بھول ہے آپ کی ..... میں ان نوکروں میں سے نوکر نہیں ہوں ..... میں مالک کی عزت چاہتا ہوں رسوائی نہیں۔  
ہنہ۔  
طاہرہ نے منہ پھیرا اور کار کو بھٹی کے سامنے رکی۔  
وہ خاموش اتر کر اپنے کمرے میں چل دی۔  
طاہرہ۔  
بیگم زمان کی آواز پر وہ ٹھٹھکی۔  
جی امی جان۔  
یہ روز روز کی پارٹیاں ..... کالج سے لیٹ آنا ..... مجھے یا تیرے ابو کو بالکل پسند نہیں ..... اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کرو۔  
ٹھیک ہے امی جان۔  
وہ جلدی سے زینہ پار کر گئی۔

رات کا کھانا بھی معمولی زہر مار کیا ..... عشق کا بھوت اس قدر سر چڑھ چکا تھا کہ عزت رسوائی کا خوف تک نہ رہا ..... رات دو بجے کا وقت دیا ہوا تھا۔ میرے محبوب میں آ رہی ہوں ..... ایک دم اٹھی ..... دروازہ کھولا ..... آہستہ آہستہ دے قدموں بیگم زمان کے تنکے سے چابیاں نکالیں اور اپنے اور بیگم زمان کے تمام زیورات بیگ میں رکھے ..... کچھ روپیوں کی گڈیاں

ہلئے سیٹھ صاحب اور بیگم صاحبہ سے معافی مانگئے۔

وہ طاہرہ کو ان کے پاس لے گیا۔

ابو جان ..... مجھے معاف کر دیجئے ..... میں اندھی ہو گئی تھی .....  
ہر بار شمشیر میری آنکھیں کھولتا تھا لیکن نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔

لیکن سیٹھ زمان کے رویے میں رتی بھر فرق نہ آیا۔

سیٹھ صاحب ..... خدا نے آپ کی عزت بچالی ہے۔ معاف کر  
دیجئے۔ ہاں ہاں ..... کر دیجئے ..... اولاد سے ایسی بھول ہو جاتی ہے۔

سیٹھ زمان نے شمشیر کی طرف دیکھا۔

سیٹھ زمان نے پوری محبت اور جوش سے شمشیر کو پلٹا لیا۔

میرے بیٹے ..... خدا نے تمہیں میرے لئے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔  
آج اگر تم نہ ہوتے تو میری عزت و ناموس کا جنازہ نکل گیا ہوتا۔

سیٹھ زمان نے شمشیر کو شانوں سے پکڑ کر رقت آمیز انداز میں کہا۔  
ایسی بات نہیں سیٹھ صاحب ..... ہم غریب لوگ مالک کے وفادار

ہوتے ہیں۔

شمشیر نے طاہرہ کی طرف دیکھا جو ملول و پریشان کھڑی تھی۔

لیکن جو بات میں نے تم میں دیکھی ہے وہ کہیں نہیں دیکھی۔

سیٹھ نے کہتے ہوئے طاہرہ کی طرف دیکھا۔

سیٹھ صاحب ..... طاہرہ بی بی کو معاف کر دیجئے ..... بچپن کی بھول  
تھی۔

شمشیر نے کہا۔

سیٹھ اور بیگم نے یک بارگی بیٹی کی طرف دیکھا۔

ابو جی ..... مجھے معاف کر دیجئے ..... مجھے درغلا یا گیا تھا ..... شمشیر

علی نے میری آنکھیں کئی بار کھولیں ..... لیکن مجھے ہی سمجھ نہیں آئی۔

سیٹھ زمان پر سکتے کا عالم طاری تھا ..... قوت گویائی جیسے سلب ہو چکی

ہو۔

یہ مشکوک آدمی ہے سرکار ..... کوٹھی کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا اور

سیٹھاں مار رہا ہے جناب۔

چوکیدار نے کہا۔

خالد اب بھی خاموش تھا۔

یہ لڑکی کون ہے۔

سیٹھ زمان نے کہا۔

خالد خاموش رہا لیکن برقعہ پوش لڑکی سیٹھ زمان کے قدموں میں گر

گئی۔

مجھے میرے گھر پہنچا دیجئے انکل ..... اس نے محبت کے جال میں پھنسا

کر مجھے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ..... نہ جانے میری ماں کس حال میں ہوگی۔

سیٹھ زمان نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

ادھر چند قدم آگے بڑھ کر طاہرہ نے خالد کے چہرے پر ایک دو اور

پھر تین زنائے دار تھپڑ رسید کر دیئے۔

فراڑی ..... ذلیل کینے ..... عشق و محبت کا ڈھونگ رچا کر میری

دولت بٹورنا چاہتا تھا ..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

وہ بھوکی شیرینی کی طرح خالد پر جھپٹی۔

طاہرہ بی بی۔

شمشیر نے لپک کر طاہرہ کو شانوں سے پکڑ لیا۔

اس سے پنپنے کے لئے ہم زندہ ہیں نا ..... ایسے کتوں کا میں صفایا ہی

کر دیتا ہوں۔

چوکیدار نے خالد کو پکڑ رکھا تھا۔

وہ فون کرنے کے لئے دوسری طرف بڑھ گئے ..... جاتے جاتے وہ پھر پلٹے ..... دیکھنا بھاگ نہ جائے ..... سب مل کر اس کو باندھو ..... جب تک پولیس نہیں آتی۔

وہ جلدی سے رسیور اٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔  
شمشیر نے بڑی عزت اور احترام سے بمعہ سامان لڑکی کو گاڑی میں بٹھایا اور سیدھا آدھے گھنٹے میں گاڑی اس کے مکان کے باہر تھی۔  
ٹھک ٹھک۔

شمشیر نے دروازے پر دستک دی ..... لڑکی پاس ہی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

کون ہے؟

بھاری دگبیری اندر سے آواز آئی۔

دروازہ کھولنے ..... ماں جی ..... باہر ہی سے شمشیر نے کہا۔

ماں جی ..... کون ہو سکتا ہے ..... لڑکی کی والدہ حیران رہ گئی۔

پھر دستک کی آواز آئی۔

اچھا کھولتی ہوں۔

وہ انھی اور ایک لمحے میں کنڈی گرا دی۔

سامنے اپنی بیٹی اور شمشیر کو دیکھ کر سکتے میں آگئی۔

تم کون ہو ..... اور یہ ..... یہ تو اس کے ساتھ مجھے برباد کر کے چلی گئی تھی۔

ماں بری طرح رو دی۔

اماں ..... مجھے معاف کر دو ..... تم برباد نہیں ہوئی۔

شمشیر نے لڑکی کی بات پر سامان صحن میں رکھا۔

اپنی بیٹی کو معاف کر دیجئے ماں جی ..... اللہ نے آپ کی عزت بچالی

سیٹھ زمان اور بیگم نے محبت سے طاہرہ کو ساتھ لگا لیا۔

جاؤ اپنے کمرے میں۔

شمشیر ..... اس بچی کو اپنی نگرانی میں اس کے گھر چھوڑ آؤ۔

سیٹھ صاحب ..... میں گھر نہیں جاؤں گی ..... میری ماں مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

وہ رونے لگی۔

تمہارا باپ۔

سیٹھ زمان اور بیگم زمان کے منہ سے نکلا۔

ان کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

اوہو۔

بیگم زمان کو بہت دکھ ہوا۔

تم پریشان نہ ہو بیٹی ..... شمشیر اچھا لڑکا ہے ..... وہ تمہاری ماں کو سمجھا دے گا۔

سیٹھ نے دلاسا دیا۔

شمشیر نے برقعہ پوش لڑکی کا سامان جو وہ گھر سے زیورات روپیہ

چوری لے کر آئی تھی سمیٹا اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

پوہ پھننے سے پہلے بیٹی کو چھوڑ آؤ۔

سیٹھ زمان نے کہا۔

بہتر سرکار۔

شمشیر نے مودب کہا۔

اور اس چکر باز فراڈی کو میں پولیس کے حوالے کرتا ہوں ..... اس

کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ دوسروں کی عزت سے نہیں کھیلے گا۔ خبیث

بھولی بھالی لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر ان سے رقم ہورتا ہے۔

ہے۔

شمشیر نے دلاسا دیا اور اسے تھام کر صحن میں لے آیا۔

میری عزت بچ گئی ہے ..... ہاں ..... ابھی دن نہیں چڑھا ..... سورج بام پر نہیں آیا ..... وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔

ہاں اماں جی ..... ابھی سورج بام پر نہیں آیا ..... جیسے آپ کی بیٹی گئی تھی ویسی ہی باعزت لوٹ آئی ..... یہ لیجئے اپنا سامان۔

شمشیر نے سوٹ کیس بوڑھی عورت کے پاس رکھا۔

میرے بچے ..... کاش میرا کوئی تیرے جیسا بیٹا ہوتا ..... وہ والدین کتنے خوش نصیب ہیں جن کی کوکھ سے تو نے جنم لیا ہے ..... تیری ماں تو تیرے سے بڑی خوش ہوگی۔

عورت نے کہا اور شمشیر اداس ہو گیا۔

میرا تو اس بھری دنیا میں کوئی نہیں ہے ..... میں آپ کو ہی مان سمجھتا ہوں۔

شمشیر کے لہجے میں کریناک کیفیت کا اندازہ لڑکی کی ماں نے بخوبی لگا

لیا۔

تمہاری ماں میں ہوں ..... مجھے اپنی ماں سمجھو ..... میرے بچے ..... تم نے مجھ پر جو احسان کہا اس کی تلافی میں زندگی بھر نہیں کر سکتی۔

بوڑھی عورت نے آنکھیں صاف کیں۔

بیٹا اپنی ماں پر احسان نہیں کرتا۔

وہ پلٹا۔

بیٹھو بیٹے ..... تم نے بتایا ہی نہیں کہ نازیہ تمہیں کہاں سے ملی۔

وہ واپس آیا۔

وہ شخص کاروباری تھا ..... نوجوان لڑکیوں کو محبت کے جال میں

پھا کر ان کی عزت اور دولت سے کھیلنا اس کا کام تھا۔

وہ سنتی رہی۔

شمشیر نے مختصر سی ساری داستان سنائی اور اجازت طلب کی۔

بیٹھو بیٹا ..... اب ناشتہ کر کے جانا۔

نہیں ماں جی اب اجازت دیجئے تو اچھا ہے۔

وہ دروازے تک پہنچ گیا۔

بیٹا اپنی ماں کو مت بھولنا۔

عورت نے کہا۔

نہیں، ماں جی ..... بیٹا اپنی ماں اور بہن کو کبھی نہیں بھولے گا .....

بب کبھی میری ضرورت پڑے آواز دیجئے گا۔

شمشیر نے نازیہ کی طرف دیکھا۔

جیتے رہو بیٹا۔

ماں نے آنکھیں صاف کیں۔



ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔  
میں جانے کو تیار ہوں ..... میں آپ کا کام کروں گی ..... صرف  
عزت چاہتی ہوں۔

وہ گڑگڑا کر بولی۔  
چلو بیٹھو ..... پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔  
ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔

وہ خاموش گاڑی میں بیٹھ گئی۔  
تھوڑی دیر کے بعد گاڑی ایک مکان کے سامنے رکی۔  
اوپر کھڑکی سے کسی بچے نے جھانکا۔

امی، امی ..... ابا آ گئے۔  
اس کے ساتھ دو تین اور بچے بھی شامل ہو گئے۔  
یہ ابا کے ساتھ کون ہے۔

بڑی لڑکی نے جھک کر دیکھا اور ایک دم لپک کر نیچے آ گئی۔  
ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی صحن میں بیٹھی دروازے کی جانب ہی دیکھ  
رہی تھی۔

یہ کون ہے۔

وہ ایک دم اچھلی۔

آرام سے میری بات سنو ..... تم چلو بیٹھک میں بیٹھو۔ رابعہ  
دروازہ کھولو ..... باجی کو بٹھا دو۔

ٹیکسی ڈرائیور بیوی کو خوفزدہ کرنے کے بعد بڑی بیٹی کو کہنے لگا۔  
آ جاؤ باجی۔

رابعہ نے بیٹھک کا دروازہ کھول۔ بتی جلائی اور سوہنی کو وہاں بٹھا

دیا۔

ہاں ..... کون ہے یہ۔  
بیوی نے تنک کر کہا۔

(23)

زمانے کو ثابت نہیں ہے۔

قدرت کے کارخانے میں سکون نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ موسم  
صدیوں کے سوئے ہوئے دکھ دلوں میں جگا جاتا ہے۔ گزرے دنوں کو آواز  
دے جاتا ہے۔ ایسی آواز جس کی گونج ہمیشہ لاشعور میں رہتی ہے۔ ہر موسم  
یادوں کے دریچوں پر دستک دے جاتا ہے اور دور کی منزلوں کا پتہ دے جاتا  
ہے۔

وہ پت جھڑ میں ٹوٹے پتے کی طرح بے سرو ساماں ہوٹل سے بھاگی  
اور لپٹی لپٹائی سڑکوں کی خاک چھانتی رہی۔ اسے کہیں بھی پناہ نہ ملی۔ شام  
گہری ہو چکی تھی۔ سامنے کار کی تیز روشنی سے سوہنی نے آنکھیں بند کر  
لیں۔

گاڑی والے نے ایک دم بریک لگائی۔

کون ہو تم۔

ٹیکسی ڈرائیور قریب آیا۔

جی میں ..... بے سارا ہوں ..... میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ کسی  
کے ہاں کام کرتی تھی انہوں نے نکال دیا ہے۔

وہ بلک بلک کر رو دی۔

دیکھو ..... اگر جانا چاہو تو میرے ساتھ چلو ..... میرا گھر ہے، بچے

ہیں اور بیوی ہے۔

لڑکی جائے گی۔

مشتاق منت بھرے انداز میں بولا۔

کوئی تمہارے جیسا لے جائے گا اسے ..... یا جہاں سے بھاگ کر آئی

ہے وہاں چلی جائے۔

شاہدہ بڑی سفاک نظر آ رہی تھی۔

مشتاق اور سوہنی نے یک بارگی اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں

مروت نام کی کوئی شے نہیں تھی۔

وہ خاموش کھڑی رہی ، اسے کراچی کی طویل اور تاریکی میں ڈوبی

سڑکیں نظر آ رہی تھیں ..... وہ کہاں جائے۔

مجھے رات بسر کر لینے دو باجی ..... صبح ہوتے ہی میں نکل جاؤں گی۔

سوہنی نے کہا۔

ہاں ٹھیک ہے ..... شاہدہ بیگم رات رہنے کی مہلت دے دو ، صبح

میں اسے کسی دارالامان میں چھوڑ آؤں گا۔

چلو ٹھیک ہے۔

شاہدہ نے بڑی مشکل سے ہار مانی۔

چلو باہر۔

وہ مشتاق کو لے کر باہر آ گئی۔

کچھ کھانے کو ہے تو دے دو ..... نہ جانے کب کی بھوکی ہو گی

بیچاری۔

مشتاق صحن میں بچھی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

ہاں امی ..... سالن اور روٹی میں دے آؤں۔

رابعہ نے کہا۔

دے آ۔

شاہدہ نے کہا۔

رابعہ نے پلیٹ میں سالن اور ایک ٹرے میں روٹیاں رکھیں اور

ایک لاوارث لڑکی ہے ..... اس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہیں

ہے۔

وہ آرام سے بولا۔

سب جھوٹ ہے ..... آج تم کہہ رہے ہو کل کلاں کو تمہاری بیوی

نکل آئے گی۔

وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

خدا کے خوف سے ڈرو ..... ایسی کوئی بات نہیں ہے ..... سڑک

کے کنارے بے یارو مددگار دیکھ کر میں اس کو لے آیا ہوں ..... دیکھو تمہارا

کام کرے گی ..... آرام ہو جائے گا تمہیں۔

بس بس زیادہ باتیں نہ کرو ..... میں اس گھر میں دوسری عورت کبھی

برداشت نہیں کر سکتی ..... میرے چہ بچے ہیں ..... میرا گھرا جڑ گیا تو بچے تباہ

ہو جائیں گے۔

وہ کولہوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

امی جی ..... اتنی پیاری باجی ..... اللہ میری توبہ ..... یہ بڑی بڑی

آنکھیں۔

لے سن لے ..... اب تو میں ایک منٹ رکھنے کو تیار نہیں ہوں۔

وہ تیز رفتاری سے بیٹھک کی طرف بڑھی۔

اے لڑکی .....

وہ اندر داخل ہو گئی۔

اور سوہنی لرز کر کھڑی ہو گئی۔

چند لمحے وہ دیکھتی رہی۔ اتنا حسن ، دلکشی اور تازگی اس نے آج

تک کسی لڑکی کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

اپنا سامان اٹھا اور راستہ ناپ۔

وہ انگلی کے اشارے سے رکیک سا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

شاہدہ بیگم ..... اسے مت نکالو ..... اس دنیا کی بھیڑ میں کہاں اکیلی

بیٹھک میں سوہنی کے لیے لے گئی۔  
مشتاق۔

شاہدہ نے مشتاق کو بلایا۔  
کیا ہے۔

وہ سگریٹ کے کش پہ کش لگا رہا تھا۔

یہ لڑکی جس کو تم لائے ہو ..... اچھی بھلی اور کسی اچھے گھرانے کی  
لگتی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔

شاہدہ نے قیاس آرائی کی۔

ارے نہیں ..... تمہارا وہم ہے ..... شکل و صورت سے بڑی  
شریف لگتی ہے۔

مشتاق کی نگاہوں میں سوہنی کا روپ رقص کناں تھا۔

جانے دے ..... یہ مسکین صورتوں والے بڑے ظالم ہوتے ہیں  
..... اونٹ کی طرح سر چھپانے کو جگہ مانگتے ہیں ..... پھر سب کچھ قبضے میں  
کرتے ہیں۔

وہ مشتاق کو گہری نظر سے دیکھ کر بولی۔

تیرا تو دماغ چل گیا ہے ..... ان باتوں کے سوا اور تجھے کوئی کام  
نہیں ہے۔

مشتاق غصے سے بولا۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اور میں تجھے بھی جانتی ہوں ..... حسن  
تیری کمزوری ہے ..... لڑکی دیکھ کر تو تیری رال ٹپکنے لگتی ہے۔

شاہدہ نے شوہر کی فطرت بیان کر دی۔

دیکھ دیکھ ..... اپنی زبان کو قابو میں رکھ ..... اب تک برداشت  
کرتا آ رہا ہوں میں ..... اب نہیں کروں گا۔

وہ کھڑا ہو کر دانت کچکچا کر بولا۔

کیا کر لے گا ..... گھر سے نکال دے گا ..... کیا کر لے گا تو میرا۔

شاہدہ چھوٹے دودھ پیتے بچے کو پرے کر کے کھڑی ہو گئی۔

بچہ اونچی آواز میں رونے لگا۔

بچے کو دودھ دے ..... ایسے ہی جھگڑا مت کر ..... صبح میں اسے  
چھوڑ آؤں گا ..... لوگ سن رہے ہیں۔

شاہدہ بیٹے کو گود میں لٹا کر دودھ پلانے لگی۔

رابعہ بیٹی روٹی لادے ..... میں گاڑی کھڑی کر آؤں۔

لائی ابا۔

رابعہ کچن میں جا کر باپ کے لیے روٹی لے آئی۔

وہ گاڑی کھڑی کر کے واپس آیا ..... روٹی ٹرے میں رکھی تھی۔ دو  
چار لقمے زہر مار کئے اور لیٹ گیا۔

قوا بنا دوں۔

شاہدہ نے کہا۔

نہیں۔

وہ کروٹ لیتا ہوا بولا۔

سامان اٹھا لے بیٹا ..... ترا باپ کہتا ہے قوا نہیں پیوں گا۔

شاہدہ صحن میں ہی سے بولی۔

رابعہ سامان سمیٹ کر باہر سے چیزیں بھی لے گئی۔

شاہدہ بچے کو دودھ پلا کر اپنے کمرے میں چل دی۔

کافی رات بیت چکی تھی۔ چاروں جانب خاموشی ہی خاموشی پھیل  
چکی تھی۔ طویل و عریض کراچی میں یہ بستی زیادہ سناٹا رکھتی تھی۔ شہر سے  
دور تھی اس لیے۔ لیکن دن کے اجالے میں اس کی رونق میں کبھی فرق نہیں

چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔  
نہیں ..... میں خود چلی جاؤں گی ..... سارا دن پڑا ہے کہیں تو ٹھکانہ  
ملے گا۔

وہ چادر کو اچھی طرح اوڑھنے لگی۔  
نہیں نہیں ..... تم اس کو جہاں سے لائے تھے وہیں چھوڑ آؤ۔  
شاہدہ نے کہا۔

مشتاق نے سوہنی کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑی تھی۔  
چلو۔

وہ باہر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔  
چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد جب کوئی پرسکون ٹھکانہ نہ ملا تو  
وہ مشتاق سے بولی۔

آپ مجھے ساحل لے چلیں۔  
وہاں کون ہے ..... سوائے چند ہوٹلوں کے ..... وہاں کام کرو گی۔  
مشتاق نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔  
میرے وہاں کچھ ملنے والے رہتے ہیں۔  
ٹھیک ہے۔

مشتاق نے پچھلا دروازہ کھولا کیونکہ وہ بیوی کے خوف سے اگلی  
بیٹ کا دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔

وہ کسی سوچ کے تحت خاموش پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔  
شاہدہ مطمئن ہو کر اندر چلی گئی۔

اور مشتاق نے رفتار تیز کر دی ..... ایک چوڑی شاہدہ سڑک پر آ  
کر مشتاق نے گاڑی روک دی اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی  
آنکھوں میں اترتا چلا گیا۔

لیکن وہ باہر کی جانب دیکھ رہی تھی۔  
تمہارا نام کیا ہے۔

آیا تھا۔ مشتاق نے ایک دم کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دور کسی مہر  
کے گھڑیاں نے شب کے دو بجانے کا الارم دیا کیونکہ گھنٹہ بارہ کے بعد دو  
مرتبہ سنائی دیا تھا۔ مشتاق بستر سے اٹھا۔ ادھر ادھر دیکھا ..... آہستہ سے  
چارپائی سے اٹھا ..... بغیر آواز کئے اس نے برآمدے کی سیڑھیاں ایک ایک  
کر کے اتریں اور بیٹھک کی طرف قدم بڑھائے۔

آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور شیطانی جذبے میں اور توانائی عود  
آئی۔ ڈیوڑھی میں اتر کر اس نے بیٹھک کی طرف قدم بڑھا دیے ..... لیکن  
یہاں آکر سارے جذبے دم توڑ گئے ..... بڑی بے دلی سے اس نے تالے کو  
چھوا۔ غصے سے دانت پیسے اور جھنجھلایا ہوا پلٹ آیا۔ دل میں نہ جانے کتنے  
کوٹنے دے ڈالے شاہدہ کو۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ ایک دفعہ نظروں سے  
اوجھل ہو گئی تو دوبارہ نہیں مل سکے گی۔

صبح کاذب طلوع ہوئی۔ حالات کی دھند میں سب کچھ چھٹ گیا۔  
شاہدہ نے اٹھتے ہی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔  
تو بیٹھی ہے ..... سوئی نہیں۔  
شاہدہ حیران رہ گئی۔

نیند مقدر والوں کو آتی ہے ..... میرے نصیب میں ایسی نیند نہیں  
ہے۔

وہ نظریں اٹھا کر آہستہ سے بولی۔  
میں تری باتوں سے پیچھے والی نہیں ہوں ..... تو اٹھ منہ ہاتھ دھو  
لے۔ مشتاق تمہیں چھوڑ آئے گا۔  
شاہدہ نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔  
آؤ باجی۔

رابعہ سوہنی کا بازو پکڑ کر باہر لے آئی۔  
مشتاق تیار ہو چکا تھا۔ کنگھی کر کے اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور  
صحنہ میں کڑا چائے گھمانے لگا۔

لوگ دیکھ رہے ہیں ..... آگے آ جاؤ۔  
 سوہنی کو طیش آ گیا ..... وہ معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے آہستہ  
 سے اتری اور دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔  
 مشتاق نے فاتحانہ انداز میں گاڑی کی رفتار تیز کی اور ساحل کی  
 طرف جانے کی بجائے گاڑی کا رخ دوسری سمت موڑ لیا۔  
 یہ تو راستہ ساحل کو نہیں جاتا۔  
 سوہنی نے باہر کی طرف دیکھا۔  
 تمہیں کیا علم۔  
 مشتاق حیرت سے بولا۔  
 میں سب جانتی ہوں ..... بہت دیر ہو گئی ہے مجھے کراچی میں رہتے  
 ہوئے۔  
 وہ بولی۔

اور ..... گاڑی بہت بڑی عمارت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔  
 وہ چونک گئی ..... ایک مرتبہ بیدار بخت کے ساتھ اسی جگہ آئی  
 لی۔ پھر ..... بیدار بخت پیٹر کے کمنے پر نور محل لے گئے۔ ماضی تصویر کی  
 طرح اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔  
 کیا سوچنے لگی ہو۔  
 کچھ نہیں ..... آپ یہاں کیوں رکے ہیں ..... مجھے ساحل جانا ہے۔  
 سنو غور سے میری بات سنو۔  
 مشتاق کچھ جھجک کر بول رہا تھا۔  
 کیا .....  
 سوہنی کی چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی ..... اسے مشتاق کی صورت  
 مایہ ناز مکررہ صورت نظر آنے لگا۔  
 تم ایک بے سارا ..... خوبصورت لڑکی ہو ..... اس طرح در در پھر  
 اؤ کوئی آوارہ تمہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنا لے گا۔

مشتاق نے کہا۔  
 ہوں .....  
 مجھ سے کچھ کہا۔  
 سوہنی نے ایک دم مشتاق کی طرف دیکھا۔  
 تمہارا نام کیا ہے۔  
 وہ پھر بولا۔  
 کوئی نام ہو ..... آپ مجھے ساحل پر پہنچا دیں۔  
 سوہنی نے نام بتانے سے گریز کیا۔  
 پھر بھی بتانے میں کیا حرج ہے ..... کچھ تو ہو گا نام تمہارا۔  
 میرا نام رابی ہے۔  
 وہ ایک دم سے بولی۔ اسے اپنی کسی سہیلی کا نام یاد آ گیا۔  
 رابی .....  
 وہ مسکرایا ..... بڑا اچھا نام ہے۔  
 لیکن سوہنی نے کوئی تاثر نہ لیا۔  
 گاڑی کے سٹیرنگ پر مشتاق نے ہاتھ رکھے۔  
 آگے آ جاؤ۔  
 وہ پھر بولا۔  
 کیا ضرورت ہے ..... میں اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہوں۔  
 وہ کرخت لہجے میں بولی اور پلٹ کر مشتاق کی طرف دیکھا۔  
 مشتاق کے چہرے پر الجھنیں تیرتی نظر آنے لگیں۔  
 آ جاؤ آگے ..... میں تمہیں کہہ رہا ہوں۔  
 وہ زچ ہو کر بولا۔  
 سوہنی کو حسب عادت غصہ آ گیا۔  
 آخر آگے آنے میں اتنا پریشان کیوں ہیں آپ .....  
 سادہ دل سوہنی مشتاق کے دل کا چور نہ سمجھ سکی۔

آپ کہیں تو سہی۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

میں تمہیں یہاں اس لیے لایا ہوں کہ ہم شادی کر لیں ..... اس طرح تمہیں ..... چٹاخ .....

دوسری طرف سوہنی کا نازک ہاتھ اٹھا اور مشتاق کے موٹے گال پر باغ انگلیوں کے نشان چھوڑ گیا۔

خبیث کتے ..... تیرے چھ بچے اور اچھی بھلی شریف بیوی ہے، زلی جرات کیسے ہوئی .....

وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور جیوم میں گم ہو گئی۔

مشتاق رخسار ملتا ہوا دیکھتا رہ گیا۔

اے بھائی، کورنگی چلو گے۔

کھڑکی میں ایک بوڑھے نے ہاتھ رکھا۔

ہاں جی چلیں۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا اور پچھلا دروازہ کھول دیا۔

بوڑھا بیگ لے کر بیٹھ گیا۔

میٹر ٹھیک ہے۔

بوڑھے نے کہا۔

بالکل ٹھیک ہے جی۔

مشتاق نے گاڑی بیک کی اور گیٹ سے نکال دی۔

بوڑھے نے ایک نظر عینک سے بغور میٹر کو دیکھا اور پھر مطمئن لڑیں بیٹھ گیا۔

مشتاق نے نظریں گھماتے ہوئے گاڑی کورنگی کی طرف موڑ دی۔

اسے کہیں بھی سوہنی نظر نہ آئی ..... وہ ایسی جیوم میں کھو گئی تھی۔

نفل کو شدید افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اس کے ہاتھ سے

مشتاق تاریک پبلو کی طرف لے گیا۔

میں شیرنی ہوں شیرنی ..... کوئی غلط ہاتھ میری طرف بڑھ کے تو دیکھے یوں پھاڑ کے نہ رکھ دوں تو سوہنی نام نہیں۔

ایک دم جوش جذبات میں اصلیت عیاں ہو گئی۔

اچھا تمہارا نام سوہنی ہے رابی نہیں۔

مشتاق نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

ہاں میرا نام سوہنی ہے ..... رابی کبھی کبھی میری اماں پکارا کرتی

تھیں۔

وہ اپنے آپ کو جھوٹا نہیں کہلوانا چاہتی تھی۔

خیر ..... کوئی بھی نام ہو تمہارا مجھے اس سے کیا کام۔

مشتاق نے کہا۔

اب کیا ہے ..... یہاں رکنے کا فائدہ۔

وہ جل کر بولی۔ اے کوفت بھی ہو رہی تھی۔

تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

سوال کب کیا ہے جو جواب دیتی۔

حالات نے اسے بہت چالاک بنا دیا تھا ..... ویسے بھی وہ اپنے آپ

کو مکمل تیار پا رہی تھی۔ وہ شاہدہ کی بھی احسان مند تھی۔ جس نے تمام

رات باہر والے دروازے کو تالا لگائے رکھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو محلے میں

کتنی رسوائی اور بدنامی ہوتی۔ شاہدہ کرخت اور اخلاقی طور پر پست عورت

تھی لیکن تھی وہ بالاصلول۔ ایسے شوہر کے ساتھ وہ ایسے ہی سلوک کی حق دار

تھی۔

جلدی کریں مشتاق بھائی ..... آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

وہ بولی۔

یہ بھائی کا اتنا کہنا سے آگیا ..... میں جو کہنا چاہتا ہوں مجھے اتنا

کہنا ہے۔

نکل گئی۔ دو آنکھیں اس کی روح کو تڑپانے کے لیے کافی تھیں۔  
ایک دم نیکیسی بری طرح ڈول گئی ..... نیکیسی دوسری گاڑی سے  
نکراتے نکراتے بچی ..... ایک دم تڑپ کر مشتاق نے سٹیرنگ کو مضبوطی سے  
تھاما۔

گاڑی ہوش سے چلاؤ میاں ..... کچھ پیا تو نہیں ہوا۔

بوڑھا ایک دم بولا۔

مشتاق کھسیانہ سا ہو کر گاڑی کی رفتار بڑھانے لگا۔

رفتار آہستہ کر دو ..... میں نے قبرستان نہیں جانا ..... ابھی جائداد

کے بہت سے کام بنانے ہیں۔

بوڑھے نے طنز کیا۔

اور ..... مشتاق نے رفتار آہستہ کر دی۔

(24)

برسات کی دوسری بارش تھی۔

پہلے پہل تو جھم جھم برسا لیکن پھر اپنے جوبن پر اتر آیا۔ چیختی چلاتی  
ہوائیں بارش کو دھکیلتی کہاں سے کہاں لے گئیں تھیں۔ جب کہیں بھی پناہ  
نہ ملی تو وہ ساحل کی طرف بڑھ گئی۔ رکشے سے اتر کر وہ سیدھی ہوٹل میں  
داخل ہوئی۔ اس وقت بارہ کا ٹل تھا۔ بارش برس رہی تھی۔ سرمئی ماحول  
غلا۔ میڈم میری ہوٹل میں نہیں تھی۔ جی کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ لڈو  
کھیل رہا تھا۔ جی کی پشت تھپی سوہنی کی طرف۔  
جی۔

سوہنی نے آہستہ سے پکارا۔

ہیں ..... بی بی۔

وہ ایک دم پلٹا۔

بی بی .....  
وہ زور سے چلایا اور بھاگ کر سوہنی کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

میری بہن ..... بی بی ..... بی بی تم کہاں چلی گئی تھی۔ ہم نے کہاں  
الٹا تمہیں تلاش نہیں کیا ..... بیٹھ جا۔

جی نے بڑی محبت چاہت سے سوہنی کو ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

میں اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہوں جی۔

وہ دنگیر آواز میں بولی۔

میڈم میری ..... زندہ باد ..... میڈم میری زندہ باد۔  
جی نے نعرہ لگایا اور دوسرے لڑکوں نے زندہ باد کہا۔  
میڈم میری اور سوہنی کھلکھلا کر ہنس دیں۔  
جی اور غفار ہنستے ہوئے واپس چلے گئے۔

بی بی ..... اتنا اچھا کام ..... پیار کرنے والے لوگ اور خالص شفاف  
جگہ چھوڑ کر تم کیوں چلا گیا ..... ہمیں بتاؤ تمہارے ساتھ کیا پر اہلم ہے۔  
ہمارے اختیار میں ہوا تو ہم اس پر اہلم کو حل کرے گا ..... تم ہماری بیٹی کی  
جگہ ہے بے شک ہم نے شادی نہیں کیا ..... لیکن تمہیں اور جی کو اولاد  
بجھا ہے۔

میڈم میری بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔  
میڈم ..... میں بھول گئی تھی ..... میں اتنے پیارے لوگ چھوڑ کر  
ہلی گئی لیکن کوئی جگہ نہ ملی ..... ہر طرف بھیانک غاریں منہ کھولے مجھے  
رپ کرنے کے لیے کھڑی تھیں ..... ہر انسان بھیڑیا بن کر مجھے لوٹنے کے  
لیے تیار تھا۔

سوہنی نے میڈم کے سفید دودھ جیسے ہاتھوں کو تھاما اور آنکھوں کو  
لگایا۔

کوئی غم نہ کرو ..... ہمیں پوری بات بتاؤ۔

میڈم نے اصرار کیا۔

میڈم ادھر شہر سے باہر بہت بڑی کونٹھی ہے نانور محل .....  
سوہنی نے کہا۔

نور محل ..... ہاں ہم جانتا ہے ..... تم بات کرو۔

پھر سوہنی نے مختصر ساری داستان شروع سے آخر تک بعینہ بیان کر  
دی۔

میڈم نے پوری توجہ سے داستان سنی۔

ہوں .....  
سوہنی نے پوری توجہ سے داستان سنی۔

سوہنی ..... اعتماد کی اگر بیساکھی ٹوٹ جائے تو اس آدمی کی حیثیت  
ٹوٹے ہوئے اس پتے کی سی ہو جاتی ہے جس کی منزل کوئی نہ ہو ..... ہوا کا  
کوئی تیز جھونکا اسے اڑا کر چاہے جدھر لے جائے ..... تمہیں ہم پر اعتماد  
نہیں ہے۔

دروازے پر کھڑی میڈم میری نے اداس انداز میں کہا۔  
میڈم ..... مجھے معاف کر دیں ..... مجھے یہ بھول تھی کہ یہاں سے  
بھاگ کر سکون تلاش کر لوں گی۔  
میڈم نے سوہنی کو لپٹا لیا۔

محبت کی تپش محسوس ہوئی تو سوہنی میڈم کے گلے لگ کر پھوٹ  
پھوٹ کر رو دی۔ اس کے جسم کے خفیف جھٹکوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ  
بہت بری طرح رو رہی ہے۔

ضبط سے کام لو ..... My Doughter (میری بیٹی)۔

لیکن وہ گلے لگی سکتی رہی۔

دیکھو ..... ضبط پارسائی اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے جب کہ  
عدم ضبط انسان کو دہشت اور درندگی کی طرف لے جاتا ہے ..... اس طرح  
انسان بھٹکتا رہتا ہے اندھیروں میں۔

جی ..... بی بی کے لیے کولڈ ڈرنک لاؤ، دل دھڑک رہا ہے۔

میڈم میری نے محبت سے سوہنی کو اپنے ساتھ کرسی پر بٹھایا۔

جی اندر بھاگ گیا۔

چند لمحوں میں اٹھٹی بوتل لے آیا اور بولا۔

لو پیو ..... تمہارا دل سکون پائے گا۔

وہ محبت سے بوتل سوہنی کو پکڑاتے ہوئے بولی۔

سوہنی نے بوتل پکڑ لی۔

جی غفار کے ساتھ فیکٹری میں چکر لگا آؤ ..... کام ہو رہا ہے۔ آج  
جرمن نسخہ تیار کیا ہے ..... کھاؤ گے تو کیا یاد کرو گے۔



تو ٹھیک ہے ..... اگر آئے تو ملاقات کرو گی۔  
میڈم نے بغور سوہنی کی اڑی رنگت کی طرف دیکھا۔  
نہیں .....  
سوہنی نے انکار کر دیا۔

What .....

میڈم نے کہا۔  
وہ ہمدردی جتا کر لے جائے گا اور بیدار بخت مجھے طلاق دے دے  
گا جو میں نہیں چاہتی ..... میں بیدار سے جدا ہونا نہیں چاہتی۔  
اچھا .....

سوہنی کے ارادے کی پختگی میڈم کے ذہن کو جھنجلا گئی۔ پاکستانی  
ورت طلاق سے کس قدر خوفزدہ ہے ..... اس خوف سے ہی تمام زندگی  
الٹیوں میں گزار دیتی ہے اور شوہر کا ظلم برداشت کرتی ہے۔

سوہنی نے دیکھا میڈم کچھ سوچ رہی تھی۔

میڈم جی۔

گم سم بیٹھی میڈم کو سوہنی نے آواز دی۔  
بولو۔

میڈم ہمہ تن گوش ہو گئی۔

اب میں کیا کروں ..... آپ کی مجھے بہت ضرورت ہے۔  
سوہنی نے کہا۔

میں تو حیران ہوں کہ بیدار بخت تمہیں رکھ نہیں سکتا ..... اس نے  
نہارے خوبصورت چہرے سے متاثر ہو کر تم سے شادی تو کر لی ..... اب نبھا  
نہیں سکتا۔

میڈم اصلیت کی طرف آرہی تھی۔

میں نبھا کروں گی اس کے ساتھ ..... بیدار کو چھوڑنا میرے بس کی  
بات نہیں۔

میڈم نے کہا۔

اب میں کیا کروں۔

سوہنی خدشات میں گھری ہوئی تھی۔

بیٹاب انداز میں بولی۔

وہ بہت بڑے لوگ ہیں ..... ان کو کون نہیں جانتا ..... مارے  
کراچی میں اس جیسا گھر نہیں کسی کا ..... تمہاری تقدیر نے ایسا کیا ہے۔  
میڈم سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

سوہنی نے بڑی گہری نظروں سے میڈم میری کے ملائم چہرے کی  
طرف دیکھا۔ پھر ایک دم میڈم میری چونک گئی اور فراک کی جیب سے ایک  
کارڈ نکالا۔

یہ پیڑ نامی ایک شخص میرے پاس آیا تھا ..... وہ تمہیں تلاش کر رہا  
تھا۔

میڈم میری نے کارڈ سوہنی کی طرف بڑھایا۔

سوہنی نے کارڈ کو پکڑ کر الٹ پلٹ کیا۔

آپ رکھ لیں ..... میں کونسا پڑھی ہوئی ہوں۔

وہ کارڈ بڑھا کر بولی۔

بڑھ سکتی ہو ..... ہم تمہارے لیے اور جی کے لیے ٹیوٹر رکھیں گے  
جو تمہیں تعلیم دے گا ..... تعلیم آج کل بہت ضروری ہے ..... تعلیم کے بغیر  
انسان Dowly ہے۔

میڈم میری نے کارڈ پکڑ کر جیب میں رکھ لیا۔

سوہنی تشکر آمیز نظر میڈم کے پر خلوص چہرے پر ڈال کر رہ گئی۔

پیڑ کو تم جانتا ہے۔

میڈم نے کہا۔

پیڑ بہت اچھا آدمی ہے۔

سوہنی نے کہا۔

ہٹ میں ..... سر پر کیپ ..... ہاتھوں میں سفید باریک خوبصورت پلاسٹک کے  
دھانے ..... پیروں میں سیاہ بوٹ اور سیاہ ہی جرائیں۔ سوہنی کو بھی یہی لباس  
زیب تن کرایا گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اسے کہا گیا تھا کہ ذرا لنگڑا کر چلے  
اگے اس کی رفتار پہچانی نہ جائے۔ اس طرح اس کی رفتار میں بھی فرق پڑ  
جائے گا۔

جی کھلکھلا کر ہنس دیا۔

کیوں ہنس رہے ہو۔

سوہنی نے لنگڑانے کی پریکٹس کرتے ہوئے کہا۔

دیکھ رہا ہوں ..... یہ مونچھیں تو لگا لو ..... اس طرح بی بی تم واقعی  
لگڑا لگا لگ رہی ہو ..... قسم سے بالکل لڑکا۔

جی نے ہنستے ہوئے سوئچیں سوہنی کے حوالے کیں۔

سوہنی نے قد آدم آٹنے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ پوری  
طرح تیار کیا۔  
جی۔

-Yes madam

جی میڈم کی آواز پر پلٹا۔

بی بی آج سے نمی ہے ..... کام کے دوران میں نے سب کو ہدایت  
دے دی ہے کہ بی بی کو نمی کہہ کر آواز دیں Ok۔

Ok میڈم۔

جی نے کہا اور ہنس دیا۔

سوہنی اضطرابیت بھرے لہجے میں بولی۔

کس طرح نبھاؤ گی بی بی ..... اتنی زندگی اس کے بغیر ہی۔

میڈم نے حیرت و استعجاب کے عالم میں کہا۔

اس کی بیوی بن کر نبھاؤں گی ..... وہ میرا ہے ..... وہ میرا شوہر ہے  
اور میں یہ تعلق توڑنا نہیں چاہتی۔

ہوں ..... میں تمہارے جذبے کی داد دیتی ہوں ..... ٹھیک ہے اگر

پیٹر آگیا تو بات کروں گی۔

نہیں نہیں ..... میرا پتہ ہرگز نہ دیجئے گا ..... وہ پتہ ملتے ہی مجھے

طلاق دے دے گا ..... اگر آپ نے ایسا کیا تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی،  
سمندر میں چھلانگ لگا دوں گی ..... لیکن طلاق نہیں لوں گی۔

وہ گہرا کر رو دی۔

اچھا بابا ..... نہیں بات کرتے ..... تم اپنے کام سے کام رکھو پہلے کی

طرح ..... اگر بیدار یا پیٹر دیکھو تو جی کو بھیجو ..... خود نہیں جاؤ۔

میڈم نے کہا۔

یہ نہیں ہو سکتا میڈم جی ..... بیدار میری آواز اور رفتار بھی پہچان

جاتے ہیں۔

-I See

میڈم ایک دم تالی بجا کر اچھلی۔

سوہنی نے آنکھیں پھاڑیں۔

ہم تمہیں ایسا لباس پہنا دیں گے کہ بیدار تو کیا کوئی کھوجی بھی

تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔

سوہنی نے چمکدار نگاہیں میڈم پر ڈالیں۔

چنانچہ کچھ دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے ..... میڈم میری سوہنی کو

مکمل تحفظ دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ تمام ملازمین کا ایک ہی یونیفارم بنا دیا گیا۔

سفید پتلون، سفید کھلی قمیض اور اس پر سیاہ کوٹ اور سیاہ ہی بو۔ خوبصورت

شام ہونے کو آئی تھی ..... لوگ آنے شروع ہو چکے تھے، بڑے

میڈم خفگی بھرے لہجے میں بولی۔  
ہم اسے تلاش کرنا چاہتے ہیں ..... اسے عزت و احترام سے اپنے  
ہاں رکھنا چاہتے ہیں۔  
پیٹر نے کہا۔  
کس رشتے سے ..... اس Poor Girl کا آپ جیسے رئیسوں سے کیا  
رابطہ ہے۔

میڈم سب کچھ جانتے ہوئے بھی پیٹر سے اگلوانا چاہتی تھی۔  
اس کا ہمارے ساتھ بڑا مضبوط رشتہ ہے ..... بڑا مضبوط بندھن ہے  
نہی گا۔

پیٹر سامنے بغور دیکھ کر بولا۔  
ٹھیک ہے آپ بھی تلاش کریں ..... ہم بھی کوشش کرتے ہیں اگر  
میں خبر ملی تو آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔  
Thank you  
پیٹر واپس چلا گیا۔

بیدار بخت کے لیے یہ مرحلے بڑے کٹھن تھے۔ سوہنی پوری آب  
و ہوا کے ساتھ اس کے قلب و جگر میں گھر کر چکی تھی۔  
کوئی خبر ملی۔

پیٹر کو اندر آتے دیکھ کر وہ ایک دم سے بولے۔  
پیٹر نے ادھر ادھر دیکھا۔

یہ آفس ہے ..... یہاں جو بھی بات ہوگی سیکرٹ ہوگی ..... ارد گرد  
افعال کیجئے۔

پیٹر نے مسکرا کر ہاتھ سے بیٹھنے کو کہا۔

او ساری پیٹر ..... دراصل میں اپنے دل میں اس کے لیے کوئی نرم  
اثر پا رہا ہوں ..... اس کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں ..... مجھے واقعی  
عایوں پریشان نہیں کرنا چاہیے تھا ..... اب میرا ضمیر تنگ کر رہا ہے۔

سکون سے کام ہوا۔ سوہنی نے مٹی بن کر سب کو آفس کریم پیش کی۔ کسی  
نے اس پر لڑکی ہونے کا شک نہیں کیا۔  
سوہنی پٹی اور ہاتھ کے اشارے سے بولا۔  
کتنے کپ۔  
پانچ۔

ایک آدمی اپنے بیوی بچوں سمیت بولا۔  
سوہنی نے سر کو جنبش دی۔  
بولتا نہیں ہے شائد۔  
بیوی نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے جی ٹرے میں پانچ کپ لے آیا۔  
سنو لڑکے ..... وہ لڑکا جو لنگڑا کر چل رہا ہے بولتا نہیں۔  
آدمی نے کہا۔

نہیں سر ..... بیماری سے ایک ٹانگ اور زبان پر اثر ہوا ہے۔  
اور جی دوسری طرف چل دیا۔  
چچ چچ .....  
بیوی نے کہا۔

سلسلہ یونہی چلتا رہا ..... رات گئے تک لوگ آتے رہے ، لطف  
اندوز ہوتے رہے۔

میڈم میری کی سکیم بڑی کامیاب رہی تھی۔  
ایک دن .....  
دوسرا دن .....

پھر کئی دن تک سوہنی مٹی کے نام پر کام کرتی رہی۔ حالات بڑے  
پر سکون رہے۔ پیٹر نے حسب معمول ہوٹل کے کئی چکر لگا لیے ، میڈم نے  
یہی کہا کہ ہمیں اس کا علم نہیں ہے ..... کیا وجہ ہے ..... آپ کیوں اس  
یگنہ کا تعاقب کر رہے ہیں۔

تھا کہ ایک آواز پر چونک گیا۔

پیٹر بابو ..... پیٹر بابو۔

شمشیر بھاگا آ رہا تھا۔

آداب پیٹر بابو۔

شمشیر نے سانسوں کے درمیان پیٹر کا ہاتھ تھام لیا۔

سناؤ یا رکیسے ہو ..... کبھی ملے ہی نہیں ..... کہاں ہوتے ہو۔

پیٹر دروازہ کھول کر باہر ہی آ گیا۔

میں ادھر سینٹھ زمان کے ہاں ملازم ہوں ..... گاڑی بھی چلا لیتا

ہوں۔ اللہ کا شکر ہے روٹی مل جاتی ہے۔

اچھا اچھا سینٹھ زمان ..... اچھے انسان ہیں ..... اور سناؤ کیا حال ہے

..... یہاں کیا کر رہے ہو مارکیٹ میں۔

پیٹر اس کا بازو پکڑ کر ایک سایہ دار جگہ پر لے گیا۔

بیگم صاحبہ اور طاہرہ بی بی سودا سلف خریدنے آئی ہیں۔ شادی ہے

ناہی کی۔

شمشیر نے کہا۔

تم نے شادی کی۔

پیٹر بولا۔

میری شادی ..... کس سے کرتا ..... کوئی اپنا ہے ہی نہیں۔

اس کے چرے پر اداسیاں چاروں طرف سے چھانے لگیں۔

پیٹر خاموش ہو گیا۔

پیٹر بابو ..... ایک بات پوچھنا تھی۔

شمشیر نے کہا۔

پوچھو ..... یار ..... ہزار باتیں پوچھو۔

دونوں ایک پنج پر بیٹھ گئے۔

سوہنی کیسی ہے ..... ٹھیک تو ہے نا اپنے گھر میں ..... میں نے کئی

بیدار بخت نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

کاش ہم پہلے کسی فیصلے پر پہنچ جاتے تو آج اتنا خرابہ پیدا نہ ہوتا۔

پیٹر کو افسوس ہوا تھا۔

بیدار بخت خاموش باہر درپتے سے دیکھے جا رہے تھے۔

سر ..... کیا سوچ رہے ہیں۔

پیٹر نے کہا۔

میں سوچ رہا ہوں مہاروپی کے لیے زبردست اصرار کر رہی ہیں۔

میں انکار بھی نہیں کر سکتا اور ادھر سوہنی کے لیے میرا ضمیر کچوکے مار رہا

ہے۔ میں اس کو بھی نہیں چھوڑ سکتا۔

اسی وجہ سے اس کی تلاش جاری ہے ..... بیگم صاحبہ طلاق دلو اگر

رہیں گی۔

پیٹر نے حقائق پر مبنی بات کی۔

میں ایسا نہیں کر سکتا ..... اسے نہیں چھوڑ سکتا ..... سوہنی میری وجہ

سے اتنی مشکلات میں گھر چکی ہے ..... نہ جانے اب کہاں ہو گی۔

بیدار بخت بہت ہی پریشان اور بے قرار لگ رہے تھے۔

آج شام ساحل پر چلیں گے۔

پیٹر نے کہا۔

اب کیا فائدہ ..... پہلے تو اس کی وجہ سے شام اچھی گزر جاتی تھی

گو وہ نہیں تھی لیکن شک و شبہ میں وقت گزرتا رہا۔

بیدار بخت مایوسانہ انداز اپنا گئے۔

آپ چلے تو سہی ..... دل بہل جائے گا۔

پیٹر کھڑا ہو گیا۔

ٹھیک ہے ..... انہوں نے کرسی سے ٹیک لگالی۔

اور پیٹر گاڑی کی چابی گھماتا ہوا باہر آ گیا۔ ابھی گاڑی میں بیٹھا ہی

مرتبہ نور محل جانا چاہا مگر عزت کے ہاتھوں مجبور رہا۔  
شمشیر بیتاب ہو گیا۔  
سوہنی.....

ایک مشکوک انداز میں پیڑنے دیکھا۔  
سوہنی کا پوچھ رہا ہوں..... وہ کیسی ہے..... آپ کو پتہ ہو گا جس دن سے وہ گئی ہے میں نے تو اس کو دیکھا تک نہیں۔  
شمشیر نے ہاتھ ملے۔  
شمشیر..... دراصل سوہنی کی ہم حفاظت ہی نہیں کر سکے..... چند دن سوہنی نور محل میں رہی ہے پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی..... اور آج تک ہمیں نہیں مل سکی۔  
پیڑ کے لہجے میں تاسف اور افسوس شامل تھا۔  
پیڑ بابو.....

جوش جذبات میں شمشیر نے پیڑ کے شانے تھام لیے۔  
تم بڑے لوگ ہیرے کی قدر بھی نہیں کرتے..... وہ بھی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیتے ہو..... بیدار بڑے چاؤ سے بیاہ کر لے گیا تھا..... پھر وہ رئیس کبیر ایک دن رکھ بھی نہ سکا..... کیوں ٹھوکروں میں اڑایا اس کو۔  
شمشیر نے پیڑ کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔  
شمشیر..... یار ہوش میں آؤ..... یہ مارکیٹ ہے، لوگ کیا کہیں گے۔

پیڑ نے شمشیر کے ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھڑایا۔  
ستون کی طرح تادور اور مضبوط شمشیر سوہنی کا سنتے ہی سسک سسک کر رو دیا۔ محبت کی چنگاری جو ایک عرصے سے دل کے مرقد میں دفن تھی ایک دم بھڑک اٹھی..... وہ بے چین و مضطرب تڑپ اٹھا۔  
حوصلہ کرو شمشیر..... ہم خود تلاش کر رہے ہیں۔  
پیڑ نے کہا۔

کہاں ملے گی..... وہ دل برداشتہ ہو کر کہیں مرکھپ گئی ہو گئی۔ وہ ضد کی پکی تھی..... اپنی مرضی کی مالک..... میں تو دل کے فریم میں جڑ لیتا..... لیکن.....  
شمشیر بہت ہی اضطرابی کیفیت میں بالوں کو درست کرنے لگا۔  
اچھا بھئی..... ملتے رہنا۔  
پیڑ نے جانے کے لیے مصافحہ کیا اور گاڑی کی طرف چل دیا۔  
ادھر دکان سے باہر بیگم زمان اور طاہرہ سامان سے لدھی پھندی کھڑی تھیں۔  
کہاں چلے گئے تھے۔  
بیگم زمان نے کہا۔  
جی وہ ایک ملنے والا مل گیا تھا..... وہاں رک گیا تھا میں۔  
وہ جھکا اور بیگم زمان کے ہاتھ سے سامان لے لیا۔  
شمشیر یہ بھی نو۔  
طاہرہ تھیلے پکڑا کر بولی۔  
لائے جی.....  
شمشیر نے سامان سمیٹا اور گاڑی کی طرف چل دیا لیکن اداس اور پریشان سا.....

کہاں جانا چاہتی ہو۔  
 بیدار بے دلی سے بولے۔  
 ساحل پر ..... وہ ہی حسین جگہ ہے اور پھر آج تو موسم بھی غضب کا ہے۔

روبی نے کہا۔  
 چلو.....

چنانچہ دونوں گاڑی میں سوار ساحل کی طرف بڑھ گئے۔  
 ابھی ساحل پر لوگوں کی آمدورفت کم تھی۔ وہ حسب معمول ایک خوبصورت جگہ دیکھ کر کنارے کے قریب ہی بیٹھ گئے۔  
 ٹمی!

جی نے آواز دی۔

سوہنی جو کہ ٹمی کے لباس میں تھی ہوٹل کے اندر چلی گئی۔  
 بیدار بخت نے ایک دم دیکھا اور پھر بولے۔  
 یہ ٹمی لڑکا اچھا بھلا تو ہے۔ آج تو لنگڑا بھی نہیں رہا..... اور اس کی چال.....

یوں ہی لگتا ہے..... کوئی نقص ہو گا ٹانگ میں۔  
 روبی نے کہا۔

اتنی دیر میں جی ان کے پاس آیا۔  
 فرمائے سرکار..... کتنے کپ لاؤں۔  
 کپ بعد میں لانا..... پہلے ٹمی کو بلاؤ۔  
 بیدار بخت نے کہا۔

کیوں جی..... ٹمی نے کوئی گستاخی کی ہے۔  
 جی نے چونک کر کہا۔  
 نہیں..... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔  
 کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ۔

(25)

بیدار!

روبی نے دروازے پر دستک دی۔

Come in

بیدار نے میوزک بند کر دیا۔

آج کل بند رہنے لگے ہیں آپ..... کیا وجہ ہے۔  
 روبی ہنستی ہوئی ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔  
 بس یوں ہی۔

وہ سگریٹ کو الیش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولے۔

نہیں ضرور کوئی بات ہے..... یونہی گوشہ تنہائی اختیار نہیں کی

ہوئی۔

وہ نہیں۔

نہیں روبی تمہیں وہم ہے..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

وہ اپنے الفاظ میں سچائی کا رنگ بھر کر روبی کو یقین دلانا چاہتے

تھے۔

ٹھیک ہے..... لیکن میں تو دیکھ رہی ہوں کہ پاکستان آتے ہی آپ کے خیالات پیچھے ہو چکے تھے..... کہاں امریکہ میں ہر روز نئی نئی جگہوں پر جانا، انجوائے کرنا اور یہاں ہزاروں جگہوں کے ہوتے ہوئے آپ جانے کا نام ہی نہیں لیتے کہیں۔

میڈم حیران ہو گئی۔  
وہ جی سے بولا کہ نمی کو بلاؤ۔  
سوہنی نے کہا۔  
اسے شک تو نہیں ہوا۔  
میڈم نے کہا۔  
لیکن میں تو بغیر لباس تبدیل کیے باہر جاتی ہی نہیں۔  
کوئی بات نہیں ..... جاؤ اور ملو ..... اس طرح ان کا وہم دور ہو جائے گا۔

میڈم نے کہا۔  
کیس وہ پہچان نہ جائیں۔  
وہ سہمی ہوئی تھی۔  
اب نہ ملنا بھی درست نہیں ہے ..... تم جاؤ۔  
میڈم نے کہا۔  
میرا جی نہیں کرتا میڈم ..... میں نہیں جاؤں گی۔  
سوہنی نہ جانے کے لیے تیار تھی۔  
میڈم جی ..... وہ اصرار کر رہا ہے ..... کہہ رہا ہے نمی کو فوراً بھیجو۔

ہائے اللہ ..... اب کیا کروں۔  
سوہنی نے کہا۔  
میں نے کہا ہے نا جاؤ ..... جو بات شک میں پڑ جائے اس میں برائی ہے۔

میڈم نے کہا۔  
جاؤ نا بی بی ..... وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔  
جی باہر نکلتے ہوئے بولا۔  
نمی (سوہنی) مکمل تیاری کے بعد آئس کریم کی طشتری ایک میز پر

جی جیسے بھند ہو گیا۔  
تمہیں اس سے کیا ..... پہلے نمی کو بلاؤ ..... چلو۔  
روبی نے کہا۔  
اچھا جی۔  
جی واپس چلا گیا۔  
بی بی .....  
کیا ہے۔  
وہ دیکھو ..... جوڑا بیٹھا ہے نا ..... وہ تمہیں بلا رہا ہے۔  
جی نے کمرے کی چھوٹی کھڑکی سے انگلی سے اشارہ کیا۔  
سوہنی نے غور سے دیکھا۔  
جی ..... یہ وہی ہے جو مجھے پکڑنا چاہتا ہے۔  
سوہنی نے بیدار بخت کو روبی کے ساتھ دیکھ کر خوفزدہ ہو کر کہا۔  
کیا ہو رہا ہے ..... کام پر چلو۔  
میڈم کے آنے پر دونوں سیدھے ہو گئے۔  
میڈم!  
سوہنی نے کہا۔  
میڈم نے جی کی طرف دیکھا۔  
تم چلو ..... لوگ تمہیں بلاتے ہیں۔  
-Yes Madom  
جی باہر نکل گیا۔  
بولو کیا بات ہے۔  
میڈم نے کہا۔  
میڈم بیدار اسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے اور مجھے بلا رہا ہے۔  
سوہنی پریشان ہو کر بولی۔  
تمہیں بلا رہا ہے۔

بہنیں کہ اس وقت وہ پاگل ہونے کی حد تک اضطراب میں بستر پر پڑے  
تھے۔ بے قراری بے سکونی نے جیسے انہیں پسند کر لیا تھا۔ سوہنی کے ساتھ  
لے گئے مظالم، ضمیر کی غلٹ بن کر کچوکے مارنے لگے۔ وہ ان کی بیوی ہے۔  
لے اس قدر سفاکانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ رات بھر سولی پر  
لگے رہے۔ آخر صبح ناشتے کے فوراً بعد انہوں نے پیٹر کو بلوا بھیجا۔

اور پیٹر اطلاع ملتے ہی آن پہنچا۔  
کیا بات ہے..... آج آفس جانے کا ارادہ نہیں ہے۔  
پیٹر داخل ہو کر مسکرایا۔  
چلیں گے..... بیٹھو..... میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔  
فرمائیے۔

پیٹر تروتازہ لگ رہا تھا۔  
بات یہ ہے کہ تم نے نمی کو دیکھا ہے نا۔  
بیدار نے بڑے محتاط انداز میں پیٹر کو کہا۔  
نمی..... وہ میڈم میری کانہی۔

پیٹر نے چند سیکنڈ سوچ کر کہا۔  
وہی نمی..... لیکن وہ نمی نہیں ہے اور..... لڑکا بھی نہیں ہے۔  
بیدار نے پہلو بدلا۔

کیا کہہ رہے ہیں سر..... وہ نمی نہیں ہے اور لڑکا بھی نہیں، پھر وہ  
ان کی مخلوق ہے۔

پیٹر نے حیران ہونے کے بعد چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔  
وہ لڑکی ہے..... میں اس کی سسکی سے جان چکا ہوں کہ وہ لڑکی

بیدار بولے۔  
اب کیا حکم ہے میرے لیے جناب۔  
پیٹر بولا۔

رکھ کر ان کے پاس آئی۔

ہاتھ کے اشارے سے اس نے کہا۔  
جی سر کیا بات ہے۔

ادھر آؤ۔

بیدار بخت نے سوہنی کے بازو کو مضبوطی سے پکڑا۔

ایک ہلکی سی سسکی کے ساتھ سوہنی نے اپنا ہاتھ بیدار کے ہاتھ پر  
رکھ دیا اور پھر ایک دم چھوڑ دیا۔

بیدار بخت ایک زیرک نوجوان تھے۔ شک و شبہات کی ایک لہران  
کے اندر اٹھی۔ ان کو یہ تو احساس نہ تھا کہ واقعی سوہنی ہو گی لیکن وہ یہ  
جان چکے تھے کہ نمی لڑکا نہیں ہے بلکہ لڑکی ہے۔ وہ بازو پکڑ کر اندازہ لگا چکے  
تھے جو نزاکت صنف نازک کے وجود میں ہوتی ہے بالکل وہی احساس ان کے  
اندر جاگزیں تھا۔

جاؤ۔

بیدار بخت نے کہا۔

اور وہ اپنی مخصوص رفتار میں چل دی۔

بیدار بخت پرسکون انداز میں ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

جی آکس کریم کے دو کپ خوبصورت برتنوں میں رکھ گیا تھا۔

نمی کو اس طرح پکڑنے کی وجہ۔

روبی نے کہا۔

میں دیکھنا چاہتا تھا کہ نمی واقعی نہیں بول سکتا۔

بیدار اندر کی بات چھپا گئے۔

شام گہری ہوتے ہی وہ روبی کو ساتھ لے کر نور محل کی طرف چل

دیے۔

تمام شب کانٹوں پر بسر کی۔ اگر وہ لڑکی نہیں ہے تو لڑکا بھی نہیں  
ہے۔ اس کے جسم کی نزاکت جی کی طرح نہیں ہے۔ سوچیں اس قدر طویل



کب۔

پیٹر ایک کرسی پر بیٹھ گیا جو جی کے پاس رکھی تھی پھر اس نے سوچا کہ آجائیں گی ..... لودہ۔

جی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

سوہنی ایک دم سے ٹھٹھکی۔

میڈم پیٹر۔

پیٹر نے معمولی سی سرگوشی بھی سن لی۔

وہ ایک دم سے پلٹا اور کھڑا ہو گیا۔

سوہنی ..... تم ..... اللہ کا شکر ہے یہ اعزاز بھی مجھے ہی ملا ہے۔

اس نے لپک کر سوہنی کو شانوں سے پکڑ لیا۔

پیٹر ..... اب تم نے دیکھ ہی لیا ہے تو بیدار کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو گی۔

سوہنی نے تڑپ کر میڈم کو دیکھا۔

میڈم ..... بیدار اس کے لیے تڑپ رہا ہے ..... راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے اس کی۔

پیٹر نے کہا۔

جھوٹ ہے ..... نور محل کا کوئی باسی اپنی نیند حرام نہیں کر سکتا۔ ان کے پاس سکون کی اتنی دولت ہے کہ وہ بے سکون ہو ہی نہیں سکتے۔

میڈم کو غصہ آ گیا۔

سوہنی صرف نگاہیں پھاڑے ادھر ادھر حیرت سے تنک رہی تھی۔

نہیں نہیں میڈم میری ..... یہ ضروری نہیں کہ نور محل کے باسی بے سکون نہ ہو سکتے ہوں ..... کبھی کبھی ایسے لوگوں کا سکون بھی قدرت لوٹ لیتی ہے جس طرح بیدار کا سکون لوٹا گیا ہے۔

پیٹر نے کہا۔

بیدار کو اس کا ضمیر نشتر چھو رہا ہو گا ..... کس کس انداز سے اس

میری کہ کسی نہ کسی طرح تم نمی کی پہچان کرو۔ میرا سکون تباہ ہو رہا

ہے۔

بیدار کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

-Ok Sir

کسی دن ساحل پر چل کر اس غلط فہمی کو دور کرنا ہو گا۔

پیٹر نے بڑے مستحکم ارادے کے ساتھ کہا۔

چند یوم گزر گئے۔ دوپہر دو بجے کے قریب پیٹر نے تنہا ہی ساحل پر جا کر سوہنی کا پتہ لگانا چاہا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا ہوٹل پہنچا۔ میڈم میری موجود نہیں تھی صرف باہر نکلے پر جی کپڑے دھو رہا تھا۔

جی!

پیٹر نے چند قدم کے فاصلے پر آواز دی۔

جی صاحب۔

جی نے ایک دم پلٹ کر دیکھا اور لگتا ہوا کپڑوں سے بنیان نکال کر

پہننے لگا۔

میڈم میری کہاں ہیں۔

وہ نمی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔

کیوں کیا ہوا نمی کو۔

پیٹر کے ذہن میں گھنٹی سی بجی۔

وہ کام کرتے کرتے چکر اکر گر گئی ..... میرا مطلب کہ گر گیا۔

جی ایک دم سٹپٹا سا گیا۔

چلو گر گیا یا گر گئی ..... کوئی بات نہیں ..... وہ لوگ آئیں گے

جی نے آکر کہا۔

-Good Boy

میڈم نے جی کے شانے پر تھپکی دی اور پیٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔  
آؤ پیٹر، سوہنی ..... آ جاؤ ..... وہاں بیٹھ کر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔

چائے درمیانی میز پر پڑی تھی۔ میڈم اور پیٹر آنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میڈم نے سوہنی کی طرف دیکھا۔  
چائے بناؤ۔

میڈم نے کہا۔

سوہنی اٹھی اور بڑے سلیقہ مندی سے دو کپ بنا کر پہلے پیٹر اور دوسرا میڈم کو پیش کیا اور پھر اپنے لیے بنایا۔

پیٹر نے محسوس کیا کہ سوہنی میڈم میری کے پاس رہ کر خاصا طریقہ سلیقہ سکھ گئی تھی۔ اب تو لباس چال ڈھال سے کسی طور پر بھی سوہنی اوڈوں کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ کوئی کوئی لفظ وہ انگریزی کے بھی بول لیتی تھی۔ تقریباً "خاموشی میں ہی چائے ختم ہوئی۔

کوئی فیصلہ کیجئے میڈم۔

پیٹر نے کہا۔

پیٹر بابو ..... آپ مجھے یہاں ہی رہنے دیں ..... بس بیدار صاحب جی میرے پاس نہ آئیں ..... میں ان سے طلاق نہیں لینا چاہتی۔  
وہ پھر گڑگڑا اٹھی۔

سوہنی ..... تم سمجھتی کیوں نہیں ..... بیدار تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتے بلکہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔  
پیٹر نے پوری طرح یقین دلایا۔

دیکھو ..... اب تو سوہنی بیدار کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔  
سوہنی نے نگاہیں جھکا لیں۔

نے اس معصوم بچی پر ظلم کیا ہے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دیتا تاکہ روز روز کے مرنے سے سوہنی بچ جاتی۔

میڈم میری زبردست طیش میں تھیں۔

جی اور سوہنی آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھ رہے تھے۔ آج پہلی بار اس قدر غصے میں دیکھا تھا۔

پیٹر خاموش دیکھ رہا تھا۔ سوہنی کے حسن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی تروتازہ اور حسین نظر آ رہی تھی۔ اس کے رخساروں کی سرخی سے یوں لگ رہا تھا جیسے کہ نئی منزلوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اب تم کیا چاہتے ہو۔

جی واپس چلا گیا تھا۔

میں سوہنی کو بیدار کے پاس لے جانے کو آیا ہوں۔

پیٹر نے سوہنی کو دیکھا۔

نہیں میڈم ..... میں نہیں جاؤں گی ..... بیدار مجھے چھوڑ دے گا۔

اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی ..... میں نہیں جاؤں گی۔

سوہنی روتی ہوئی بے قرار میڈم کے قدموں پر جھکی۔

My Daughter تمہیں کون جانے دے رہا ہے۔

میڈم نے سوہنی کو ساتھ لگایا اور اپنے رومال سے اس کے آنسو

مٹا دیے۔

پیٹر نے میڈم کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا۔

اب کیا کیا جائے پیٹر ..... سوہنی خود خائف ہے بیدار سے۔

میڈم نے کہا۔

سوہنی بیدار سے خائف نہیں ہے وہ اس لفظ سے خائف ہے جو دو

وں میں نفاق ڈالتا ہے اور خدا کو بھی پسند نہیں۔

پیٹر نے کہا۔

میڈم جی ..... ڈرائنگ روم میں چائے بنا کر رکھ دی ہے۔

اور پیڑ ایک دم جوش مسرت میں کھڑا ہو گیا۔  
میں چچا بن جاؤں گا ..... میں ابھی بیدار کو لے کر آؤں گا۔ میڈم  
اب تو سوائے سوہنی کو اپنے ساتھ رکھنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے .....  
بیدار کبھی سوہنی کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتے ..... اجازت دیں اور کوئی  
مثبت حل تلاش کیجئے گا۔

(26)

پیڑ نے من و عن سب کچھ بیان کر دیا تھا۔ سوہنی کی کوکھ میں اپنے  
فنان کی پرورش وہ کبھی فراموش نہ کر سکتے تھے۔ اب تو سوہنی کا نور محل میں  
انا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ وہ دل میں سوچ کر اٹھے۔ آج دو ٹوک بیگم  
رالدین سے بات کرنا چاہتے تھے۔ ایک دم اٹھے اور خراں خراں لان کی  
لوف بڑھ گئے۔ روٹی ابھی ابھی اٹھ کر گئی تھی۔ یہ موقعہ ان کے لیے اچھا  
نہ۔

بیٹھ سکتا ہوں ماما۔  
چونک کر بیگم نورالدین نے دیکھا۔ آج خوشگوار موڈ میں دکھائی  
دے رہے تھے۔  
آؤ بیٹھو ..... بڑے خوش نظر آ رہے ہیں آج ہمارے بیدار بخت۔  
آپ سے گزارش کرنے آیا ہوں۔  
وہ مودب بولے۔  
گزارش ..... کیا مطلب ..... دیکھنا کوئی ایسی بات مت کرنا جس کی  
لانی نہ ہو سکے۔

وہ ایک دم سے گھبرا گئیں۔  
ماما ..... میں تو اب عادی ہو چکا ہوں ..... مجھے یہ سب کچھ جو میرے  
ماتھ وابستہ ہوا ہے معیوب نہیں لگتا ..... آپ کے لیے ضرور تکلیف دہ ہو  
لا۔

وہ ہنستا ہوا باہر آ گیا۔  
میڈم نے سوہنی کو ساتھ لگا لیا۔  
اب کیا ہو گا میڈم جی۔  
سوہنی میڈم کے پاس ہی بیٹھ گئی۔  
اچھا ہی ہو گا ..... بیدار اپنے خون کو ارزاں نہیں کریں گے۔  
میڈم نے کہا۔  
پھر میں چلی جاؤں اگر بیدار آئیں تو۔  
سوہنی نے کہا۔

وہ اس وقت بہاروں کے جھولے میں جھولنے لگی۔ اتنی تکالیف کے  
بعد خدا نے کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کیا تھا۔  
سوچ لو ..... میں تمہیں روکنا نہیں چاہتی ..... وہ تمہارا شوہر ہے۔  
اس کا تم پر حق ہے ..... میرے گھر کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے  
ہیں۔ جب جی چاہے چلی آنا ..... ہماری نگاہیں ہمیشہ تمہاری منتظر رہیں گی۔  
میڈم نے سوہنی کو ساتھ لپٹا کر پیشانی پر بوسہ دیا۔

میں تمہیں تمہارے باپ کے عتاب سے کیسے بچاؤں گی ..... وہ تو اپنے گھر میں  
بلی کتے کا بچہ بھی اعلیٰ نسل کا پسند کرتے ہیں ..... تمہاری بیوی کو کس طرح  
قبول کریں گے ..... اف خدا یا ..... مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی ..... وہ منظر  
مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔

بڑے کرب سے انہوں نے بیدار کی طرف دیکھا۔  
اما ..... وہ انسان ہے ..... انسان جانوروں سے افضل ہوتے ہیں۔  
یہ آپ نے کیسے کہہ دیا ہے۔  
وہ بولے۔

یہ تمہارا جذباتی فیصلہ ہے بیٹے ..... اور تمہاری نادان جوانی کی بھول  
..... تم سوہنی کے عشق میں گرفتار ہو کر اپنے مرتبے وقار اور حیثیت کو یکسر  
فراغ کر بیٹھے ہو ..... وہ دو نکلے کی عورت .....  
اما .....

بیدار بخت نے تڑپ کر بیگم نورالدین کی بات کاٹ دی۔  
وہ گھور کر دیکھنے لگیں۔  
آپ اس عورت کی توہین کر رہی ہیں جو میری بیوی ہے ..... اور  
اب وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

بیدار ..... یہی بات ہمیں ذلت و رسوائی کے اندوناک گڑھے میں  
پھینک سکتی ہے ..... لوگ کیا کہیں گے رئیس نورالدین کے بیٹے نے ایک  
جھگی والی سے شادی کی جو اب اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔  
اما ..... آپ ماں ہیں ..... آپ تو اس تفریق کو ختم کریں۔ پاپا سے  
میں بات کر لوں گا۔

بیدار جرات کر کے بولے۔  
کس طرح بات کرو گے ..... تمہیں ان کی طبیعت کا اندازہ ہے۔  
اپنی ذات کی نفی کون برداشت کر سکتا ہے اور یہ بات معمولی نہیں ہے۔  
بیدار خاموش رہے۔ بغور انہوں نے دیکھا، گاڑی میں بیٹھ کر روٹی

وہ کھل کر بات کرنا چاہتے تھے۔ ویسے بھی والدین کی اکلوتی اولاد  
ہونے کے ناطے ایسا حق سمجھتے تھے جو منوانا چاہتے ہوں۔  
وہ چپ سے ہو گئے۔

آپ بات تو کریں بیدار ..... ہم نے آپ کو جہنم دیا ہے .....  
پرورش کیا ہے ..... ہم آپ کے اندر کے انسان کو اچھی طرح جانتے ہیں جو  
اب بغاوت پہ اتر آیا ہے۔  
وہ حد درجہ پریشان لگ رہی تھیں۔

یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے۔  
بیدار بخت پہلو بدل کر بولے اور بغور بیگم نورالدین کے چہرے کو  
دیکھا۔

انہیں اپنی ماں کے چہرے پر اپنے ماضی کی پوری داستان کندہ نظر  
آئی پھر بھی جرات سوال کر ہی لیا۔  
میرا خیال ہے آپ کو ساری بات کا علم ہو چکا ہے۔  
بیدار بولے۔

مجھے ساری بات کا علم ہو چکا ہے بلکہ تمہارے اگلے قدم کا بھی علم  
ہے جو تم اٹھانے والے ہو۔  
وہ پلٹ کے بولیں۔ ان کے چہرے پر الجھنیں تیرنے لگیں۔  
یہ کس نے کہا۔

وہ حیران ہوئے۔  
کسی نے نہیں ..... میں نے گزشتہ دنوں تمہاری اور پیٹر کی تمام  
گفتگو سن لی تھی۔

بیگم نورالدین مضطربانہ انداز میں گویا ہوئیں۔  
بیدار خاموش رہے۔  
وہ پھر بولیں۔  
مجھے تو اب اندیشے و سو سے چاٹ رہے ہیں کہ آنے والے وقتوں

کہیں گئی تھی۔

اگر روہی کا وجود اس گھر میں نہ ہوتا تو کسی حد تک بات چھپائی جا سکتی تھی۔ سب سے بڑی مصیبت اس گھر میں روہی ہے ..... اس کی منشا کے بغیر تو نور محل کا پتہ بھی نہیں مل سکتا۔

بیدار خفا خفا سے بولے۔

کیوں نہیں ..... وہ تمہارے باپ کے پارٹنر کی اولاد ہے ..... اور پھر اربوں کی جائیداد اس کے نام ہے ..... تمہاری معمولی سی غفلت سے یہ سب کچھ چھوڑا تو نہیں جاسکتا۔

بیگم نور الدین نے شانے اچکائے۔

سوہنی اوپر والے پورشن میں رہے گی۔

وہ جہاں بھی رہے ..... نور خاندان کے لیے باعث عذاب ہوگی۔

وہ جل کر بولی۔

وہ خاموش رہے۔ وہ ماں کی زیادہ باتوں کا جواب دینا نہیں چاہتے

تھے۔

ہمیں علیحدہ رکھنے کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔

وہ فوراً بولیں۔

ہرگز نہیں ..... تم اس گھر سے کٹ آف ہونا چاہتے ہو ..... تاکہ

ہم تمہاری صورت کو ترس جائیں۔

وہ بے چین ہو گئیں۔

پھر میں کیا کروں۔

وہ زچ ہو گئے اور لجاجت بھرے انداز میں بولے۔

اسے طلاق دو ..... بڑے ہو چکے چو نچلے۔

وہ سفاک لہجے میں بولیں۔ ہمدردی نام کی کوئی چیز ان کے پاس

نہیں تھی۔

یہ نہیں ہو سکتا ..... ہرگز نہیں ماما..... وہ زندگی کا حصہ بن چکی

وہ یوں تڑپ کر بولے جیسے ان کے جسم سے ان کی کھال اکھٹڑدی

آئی۔

روہی انگلیں لباس میں ملبوس لان میں اتر آئی۔

یہ کیا ہے۔

بیدار تو خاموش دیکھتے رہے۔

لیکن وہ روہی کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا لفافہ دیکھ کر حیران ہوئیں۔

پاپا کا خط ہے ..... ویسے پرسوں فون بھی آیا تھا۔

روہی بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔

کیا ہے ..... خوشی کی بات ہوگی۔

بیگم نور الدین نے قیاس آرائی کی۔

ایسی ویسی ..... پڑھ لیجئے ..... آپ کے اور بیدار کے لیے بھی لکھا

وہ لفافے کو پکڑاتے ہوئے خود بیدار کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ

بیگم نور الدین نے ایک نظر میں سارے خط کا متن پڑھ لیا۔

V . Good ..... تم دونوں پروگرام بنا لو جانے کا۔

وہ خط کو لفافے میں ڈال کر بولیں۔

پروگرام .....

بیدار تذبذب کے عالم میں بولے۔

ہاں بیٹا! سیٹھ بہاؤ الدین نے تمہیں اور روہی کو فوراً امریکہ بلایا

تمہارے باپ کی تاکید ہے کہ فوراً آئیں۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

میں تو اب چند ماہ کے بعد ہی آؤں گی آنٹی ..... یہاں بڑی بوریت

ہوئی ہے مجھے۔

روبی نے ناک سکیڑی۔

آپ کو تو پاکستانی مناظر بڑے اچھے لگتے تھے۔

بیدار نے کہا۔

جی ہاں ..... بہت اچھے لگتے تھے ..... آپ سوائے ساحل کے کب لے کر گئے ہیں ..... کبھی کسی خوشگوار مقام کی سیر کرائی آپ نے ..... یو لگتا ہے آپ کو تو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہیں۔

روبی نے بے دھڑک کہہ دیا۔

اس کا جواب بیدار کے پاس نہیں تھا۔ صرف مسکرا کر رہ گئے۔

ایسی بات نہیں ہے بیٹی ..... تمہیں معلوم تو ہے بزنس میں الجھنے

بعد بیدار کو کہاں وقت ہو گا ..... ہاں البتہ اب تمہارے ساتھ امریکہ جائیں گے ..... کیوں بیدار ٹھیک ہے نا۔

بیگم نور الدین نے بیدار کی مشکل آسان کر دی۔ وہ خاموش رہے۔

اب بیدار صاحب انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے ..... دو تین دن امریکہ روانہ ہو جائیں گے ..... انکل نور ہمیں ایر پورٹ پر رسیو کر لیں گے۔

بہت کوشش کے باوجود بھی وہ انکار کر نہ سکے اور نہ ہی وہ اپنی ماں کے سامنے انکار کر سکے اور ایک دن وہ روبی کے ساتھ امریکہ روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد بیگم نور الدین نے سکھ کا سانس لیا۔

وقت کا گھن چکر چلتا رہا۔

پیٹر بیدار بخت کے جانے کے بعد ایسا الجھا کہ اس کو سر کھجائے ہیں۔

وقت نہ ملا اور دن ہفتوں اور مہینوں میں گزر گئے۔ انتظار کرتے کرتے سوئے کی طاقت جواب دے گئی تھی ..... ویسے بھی وہ امید سے تھی ..... کمزور کمزور ہو رہی تھی ..... آنے والے وقت کا خوف اس کو پریشان کئے ہوئے

خوف اندیشے و سو سے زہریلے ناگ بن کر اس کے حواس کو ڈنگ رہے بیدار ایسا تو نہ تھا اور نہ ہی پیٹر نے اس طرف کا رخ کیا۔ حیرت اور نا نے گھر کا سکون تباہ کر دیا تھا۔ میڈم میری بھی بہت افسردہ تھی۔ وہ پریشان حال ساحل پر ایک جگہ ریت پر بیٹھی تھی ..... ہاتھ میں ریت ٹھاکر پانی میں پھینک رہی تھی۔

سوہنی۔

جی میڈم۔

میڈم کی پکار پر وہ ایک دم سے چوٹکی۔

کیوں Sad ہو ..... کوئی فائدہ نہیں ہے ..... تمہاری نمکبانی خدا کا ..... وہ سب کا پالنہار ہے اور میں جو ہوں تمہارے ساتھ ..... ہم لوگ ہیں ..... تمہیں چھوڑیں گا نہیں۔

میڈم نے بڑی محبت سے کہا۔

ڈز ..... ڈز۔

گولی کی آواز پر دونوں ریت پر لیٹ گئیں۔

ہمارا پیچھا کر رہا ہے کوئی ..... کوئی ہمیں مارنا چاہتا ہے۔

سوہنی نے میڈم کے ساتھ چلتے چلتے ہوٹل میں قدم رکھا۔

میڈم یہ کون لوگ ہیں ..... میں نے ایک دن پہلے بھی سامنے

ہاکی اوٹ میں سائے حرکت کرتے دیکھے ہیں۔

وہ سہم گئی۔

یہ سب نور محل والوں کی چال ہے ..... وہ تمہیں جان سے مار دیتا

ہیں۔

میڈم نے کمرے کا پردہ درست کیا۔

میرا کیا قصور ہے میڈم۔

وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

تم نے ..... کیا قصور کیا ہے ..... تم نے بیدار بخت سے شادی کی

ڈاکٹر..... سوہنی کیسی ہے..... ٹھیک تو ہے نا۔  
شمشیر نے بڑی بے قراری سے کہا۔

مبارک ہو..... بیٹا ہوا ہے۔

بیٹا..... پیٹر نے بے ساختہ شمشیر کو لپٹا لیا اور میڈم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

اب آپ مریضہ سے مل سکتے ہیں لیکن شور نہیں خاموشی کے ساتھ۔

ڈاکٹر دوسری طرف بڑھ گئی۔

ہسپتال کے آرام دہ پرسکون پرائیویٹ کمرے میں سوہنی اور بچے کو لٹا دیا گیا..... کیوں نہ ہوتا۔ شہر کے سب سے بڑے رئیس بیدار بخت کا تخت جگر تھا۔

شمشیر نے بغور دیکھا، بچہ بالکل بیدار کی صورت تھا اور سوہنی ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔

دوائیوں کا بڑا سالفافہ لے کر پیٹر داخل ہوا۔

پیٹر بابو..... سوہنی کو ابھی تک ہوش کیوں نہیں آیا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ چہرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔

گہراؤ نہیں یار..... سوہنی بالکل ٹھیک ہے صرف انجکشن اور میڈسن کا اثر ہے۔

بیٹھے آپ۔

شمشیر نے کہا۔

نہیں..... میں نور محل جا کر بیگم صاحبہ کو اس خوشخبری کو سنانا چاہتا ہوں۔ بڑے خوش نصیب ہیں بیدار بخت..... خدا نے بن مانگے اتنی بڑی نعمت سے نواز دیا۔

پیٹر نے سوہنی کو غور سے دیکھا۔ وہ شکل و صورت سے کسی شہزادی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

ہے..... اس سے زیادہ اور تمہارا کیا تصور ہو سکتا ہے۔

میڈم جی..... میڈم جی..... پیٹر بابو آگئے اور ساتھ کوئی اور.....

جی ہانپتا ہوا داخل ہوا۔

بیدار آگئے..... بیدار.....

کہتے ہوئے ایک چکر سا آیا..... ساری کائنات گھوم گئی اور وہ.....

کر گری۔

سوہنی.....

میڈم ایک دم لپکی۔

بی بی.....

نہی کی چیخ نکل گئی۔

لیکن..... وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

میڈم.....

پیٹر اور شمشیر حراساں داخل ہوئے۔

پھر کوئی بات ہوگی..... پہلے سوہنی کو ہسپتال لے جانا ہو گا۔

میڈم نے پیٹر اور نوجوان خوبرو شمشیر کی طرف دیکھا۔

ہلے پیٹر بابو..... دیر نہیں ہونی چاہئے۔

شمشیر نے ایک پھول کی طرح سوہنی کو اٹھایا اور تیز رفتاری۔

گاڑی تک لے گیا۔ میڈم، پیٹر اور شمشیر سوہنی کو لے کے ہسپتال پہنچ گئے۔

زندگی شطرنج کا مرہ ہے۔ کس کس طرح بساط الٹی ہے۔ سوہنی

لیبر روم میں گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا تھا۔ تینوں پریشان باہر نکلے۔

تھے۔ شمشیر کی حالت قابل غور تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی جا

دے کر سوہنی کو بچا لیتا۔

اچانک ڈاکٹر ریحانہ تھکے تھکے انداز میں باہر نکلیں۔

تینوں بڑی برق رفتاری سے اس کے پاس چلے گئے۔

پیٹر حیرت زدہ سا بولا۔

بیدار سے پہلے ہمیں سوہنی کی موت چاہئے ..... اب ہم اس زمین  
سوہنی کا ناپاک وجود برداشت نہیں کر سکتے ..... اس لڑکی نے ہمارے دل کا  
نمرویران کر دیا ہے ..... ہمارا بیٹا تقسیم کر دیا ہے ..... بیدار ہماری بات ٹالنا  
مناہ سمجھتا تھا اور اب .....  
وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔

پیٹر نے نگاہیں جھکا لیں۔

پیٹر.....

انہوں نے پکارا۔

بیگم صاحبہ!

پیٹر مودب بولا۔

ہمیں سوہنی کی موت کی خبر ملنی چاہئے ..... میں حیران ہوں اتنی تاخیر  
لیوں ہو گئی ..... بچہ بھی ابھی تک نہیں آیا۔

وہ غلت میں باہر دیکھنے لگیں۔

بیگم صاحبہ ..... اب وہ آپ کے بیٹے کی بیوی ہے ..... وہ نور محل  
کی عزت بن چکی ہے۔

پیٹر نے بڑی جسارت سے کام لیا۔ بچہ والا معاملہ اس کی سمجھ سے  
بالا تر تھا۔

تمہاری کوئی بات ہمیں گراں نہیں گزرتی ..... لیکن سوچو تو سہی کہ  
بھڑیے کا بچہ لاکھوں انسانوں میں تربیت پائے گا ..... آخر کار وہ بھیڑیا ہو گا۔  
وہ تاریکی میں جھانکنے لگیں۔

فضا کافی گھمبیر ہو چکی تھی ..... سائیں سائیں کرتی فضا اور بھی  
فناک لگ رہی تھی۔

پیٹر باہر پلٹ آیا ..... دور بجلی چمک رہی تھی۔ برہنہ شاخیں جیسے  
سک رہی ہوں۔ شاخوں کے جگر سوکھ گئے ہوں ..... پتوں نے درختوں کی

بیٹا بہت بڑی نعمت ہے پیٹر بابو ..... لیکن کیا فائدہ اس کے مقدر نہ  
جاگے۔

شمشیر کو سوہنی پر رحم آ رہا تھا ..... اس کی محبت قربانی مانگتی تھی  
..... وہ سوہنی سے محبت کرتا تھا ..... سوہنی اس کی محبت تھی۔

اس کے بھی جاگیں گے مقدر ..... اچھا میں چلتا ہوں ..... تم خیال  
رکھنا۔

پیٹر باہر نکل گیا۔

بیگم صاحبہ.....

وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

بیگم نور الدین نے آنکھیں اٹھائیں ..... وہ اس وقت تنہا ہی بیٹھی  
تھیں۔

آپ کو مبارک ہو ..... بیدار بخت کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔  
پیٹر.....

وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئیں۔

پیٹر نے بغور بیگم نور الدین کے کرخت چہرے کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے تم سوہنی کی موت کی خبر سناتے تو ہم تمہارا منہ  
موتیوں سے بھر دیتے۔

پیٹر نے دیکھا کہ بیگم نور الدین کے چہرے پر فرعونیت امنڈ آئی  
تھی۔ چہرے کے خدوخال ظالمانہ حد تک کرخت ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں  
جیسے خون اتر آیا ہو۔

موت ..... سوہنی کی موت ..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔



کی طرف بڑھ گیا۔  
 نہ جانے کس کس کا خون کیا ہو گا اس کافر نے .....  
 موت ناچ رہی ہے ..... پیڑ بہت دن بستر سے نہ اٹھ سکا۔ اس  
 سفاکی پر مہربان رہا.....

شہ رگ سے نانا توڑ لیا ہو ..... ہر طرف سسکیاں ہی سسکیاں سنائی دے رہی  
 تھیں ..... ہر طرف بخ بستہ دیرانی ہے ..... ایک تلگبی سی اداسی ..... ایک مہر  
 بلب خاموشی اور سفاکی ..... ایک روح کھینچ لئے والا منظر ..... الٹی ..... ایسا  
 کیوں ہے ..... وہ بہت دیر باہر کھڑا رہا۔

چند لمحے اسے یوں احساس ہوا کہ فضا چیخ رہی ہے ..... وہ آنکھیں  
 پھاڑے ایک طرف ہو گیا۔ قوی ہیکل شخص تاریکی چیرتا ہوا ڈرائنگ روم کا  
 پردہ اچھال کر اندر داخل ہوا۔  
 پیڑ ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ تاریکی اس کے راستے کی دیوار تھی۔  
 صرف آواز سن سکتا تھا۔

لیجے بچہ ..... باقی صفایا۔  
 کپڑے میں لپٹا ہوا بچہ اس قوی ہیکل شخص نے بیگم نور الدین کو  
 تھمایا اور پلٹا۔  
 ٹھہرو۔

وہ مڑا۔  
 اور حکم .....  
 اس کی گرج دار آواز سے فضا سہم سی گئی۔  
 یہ لو ..... ساری پشتوں کے لیے کافی ہوں گے... کم ہوں تو اور لے  
 جانا کسی وقت۔

ایک تھیلا اس کی طرف پھینکا گیا جسے بڑی چابک دستی سے اچک لیا  
 گیا۔

اب تم جاؤ ..... اس تاریکی میں غائب ہو جاؤ۔  
 بہتر۔

زیورات اور رویوں کا تھیلا لئے وہ جس راستے سے آیا تھا، اسی  
 راستے سے واپس چلا گیا۔  
 پیڑ نے ستون سے سر ٹکا لیا اور ..... پھر دبے قدموں اپنے کمرے

ہو نہ.....

وہ مسکرا دیں۔

جو ہونا تھا ہو چکا..... اب اس بات کو بیدار کے سامنے منظر عام پر نہیں آنا چاہئے۔

وہ پرسکون انداز میں بولیں۔

کیسے منظر عام پر آ سکتا ہے..... تاریکی کے دبیز پردے میں سب کچھ چھپ گیا ہے بیگم صاحبہ۔

نہیں پیڑ..... اس راز سے جب بھی پردہ اٹھے گا تم اٹھاؤ گے۔ میرا خیال ہے کہ تم خاموش رہو گے..... خواہ مخواہ خرابہ پیدا کرنے سے فائدہ۔

بیگم نور الدین نے ایک ابرو اوپر اٹھایا۔

آپ میری طرف سے اطمینان رکھئے..... یہ راز میری موت کے بعد بھی کسی پر عیاں نہیں ہو گا۔

ایک دم دونوں بری طرح چونک گئے۔

ملازمہ بچہ اٹھائے گھرائی ہوئی لان میں اتر آئی۔

کیا بات ہے۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

بچہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہ بری طرح اٹھ کر رو رہا تھا۔

پیڑ نے اٹھ کر فوراً "ملازمہ کے ہاتھوں سے روتے ہوئے بچے کو

قائم لیا لیکن بچے کے رونے میں کوئی فرق نہ آیا۔

بیگم صاحبہ..... گستاخی معاف..... اس نایاب تحفے کو ضائع نہ کیجئے

گ۔ کسی آیا کا بندوبست ہونا چاہئے۔

وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہلانے لگا۔

یہی ہم چاہتے ہیں..... کسی ایسی آیا کا بندوبست ہو جائے جو بچے کی

اچھی طرح نگہداشت کر سکے..... تم تلاش کرو۔

بہتر ہے..... میں کوشش کروں گا..... شہر سے باہر کافی غریب

(27)

آج قدرے طبیعت سنبھلی تو وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔  
جناب لان میں بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔  
آ رہا ہوں۔

وہ بے دلی سے بولا۔

نور محل میں اب اس کا جی ہی نہیں لگ رہا تھا۔ نہ کام میں اور نہ کہیں اور..... اسے نور محل کے سارے کینوں سے نفرت سی ہو چکی تھی..... صاف ستھرا شریف النفس انسان تھا۔ مکاری، ریاکاری اس کے پاس سے پھٹکی تک نہیں تھی۔ بیگم نور الدین کی سفاکی، ظالمت کی جیتی جاگتی تصویر دیکھ کر اس کی روح لرز گئی تھی۔

ست روی سے چلتا ہوا وہ لان کا زینہ اتر۔

آؤ پیڑ..... تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔

بیگم نور الدین نے یوں کہا جیسے پیڑ کو کسی بات کا علم ہی نہ ہو۔

جی..... فرمائیے۔

ہم نے انتقام کے جوش میں بہت بڑا قدم اٹھایا ہے..... اب اس معاملے کو سلجھانا بھی تمہارا کام ہے۔

بیگم نور الدین نے بڑی امید سے پیڑ کو دیکھا۔

کیسا کام..... قتل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں بیگم صاحبہ۔

پیڑ خوفزدہ ہو کر بولا۔

عورتیں مل سکتی ہیں۔

اوپر والے پورشن میں ہی تربیت کرے گی۔

پیٹر نے کہا۔

ٹھیک ہے ..... ہم اوپر والا پورشن اس بچے اور آیا کو ہی دے دیں  
ہم اس کے وجود کو اس طرح سرعام نہیں دیکھ سکتے۔

وہ ناک سکیٹر کر بولیں جیسے یہ بچہ کسی تعفن زدہ گندی نالی کا کیزا

پیٹر اٹھ گیا مگر پھر چند لمحوں بعد بیٹھ گیا۔

پھر وہ آنے والے حالات سے نبٹنے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے

بیگم نور الدین ایک ذہین، چالاک اور معاملہ فہم عورت تھیں۔ وہ  
لی کو کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ روپی کروڑوں نہیں اربوں  
مالک تھی جو ساری جائداد اس کے باپ نے اس کے نام کر دی تھی۔

سب ٹھیک ہو جائے گا بلکہ اس بچے اور شادی کی کوئی بات روپی  
، پوشیدہ ہی رہے گی۔

کچھ کہنا چاہتے ہو۔

بیگم نور الدین نے پوچھا۔

اگر آپ کو گراں نہ گزرے تو میری گزارش ہے کہ اس بچے کا نام  
رکھ دیں۔

پیٹر منت بھرے لہجے میں بولا۔

تم خود ہی رکھ دو ..... ہم اس جھگی والے جنم زادے کو دیکھنا پسند  
ن کرتے نام کیا رکھیں گے۔

پیٹر نے دیکھا شدید نفرت اور کراہت سے بیگم نور الدین نے چہرہ  
الیا تھا۔

میں اس کا نام خاقان رکھوں گا۔

پیٹر نے کہا۔

ہم نے کوشش کی کہ اسے بھی ختم کروا دیں ..... اس  
سنپولے کو بھی جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

وہ کس قدر خود غرض اور ظالمت سے بھرپور جیلے ادا کر رہی تھیں۔  
پیٹر نے بچہ واپس ملازمہ کو دیا۔

یوں نہ سوچئے ..... یہ تو سر بیدار کی امانت ہے۔

اس کا خیال رکھو ..... انشاء اللہ میں جلد بندوبست کر لوں گا۔

پیٹر جاتی ملازمہ سے کہہ کر گہری سوچ میں کھو گیا۔

ملازمہ واپس چلی گئی۔

اس بچے کی وجہ سے ہم اور پریشانیوں میں گرفتار ہو چکے ہیں۔  
روپی اور بیدار بہت جلد آنے والے ہیں ..... ماشاء اللہ اب وہ رشتہ ازدواج  
میں منسلک ہو چکے ہیں۔ ان کی شادی ہو گئی ہے۔

..... Very Good

اچھی خبر ہے ..... اب تو تمام پریشانیاں ختم ہو گئیں بیگم صاحبہ۔

پیٹر بظاہر ہنس دیا۔

اور یہ مصیبت .....

وہ نفرت حقارت سے جاتی ملازمہ کی طرف دیکھ کر بولیں۔

ایسا مت کہئے ..... آپ کے بیٹے کا خون ہے ..... اولاد ہے آپ

کی۔

پیٹر آہستہ آہستہ نڈر ہوتا جا رہا تھا۔

ہماری اولاد نہیں ہے ..... یہ سانپ ہے جس نے اس گھر کے سکون  
کو ڈس لیا ہے ..... کاش اس جھگی والی کے ساتھ یہ بھی ختم ہو جاتا۔

وہ زبردست ظالمانہ انداز اختیار کر چکی تھیں۔

پیٹر اس عورت کی لاتعلقی اور بے اعتنائی پر حیران رہ گیا۔

آپ فکر نہ کیجئے ..... میں آیا کا جلد بندوبست کروں گا جو اس بچے

خوبصورت کرسیاں ..... چھتریاں ..... سنگ مرمر کے  
ڈیکوریشن پیس وہاں کوئی چیز بھی نہ تھی۔ ہوٹل کے باہر سامان کا ڈھیر لگا ہوا  
تھا۔

باہر کھڑے ہو کے پیٹر نے بیل دی۔

جی صاحب۔

جی نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔

میڈم کہاں ہیں۔

یہیں ہیں ..... سوہنی کی طبیعت بڑی خراب ہے ..... اس کے پاس  
بیٹھی ہیں۔

کیا کہہ رہے ہو تم ..... سوہنی زندہ ہے۔

وہ پردہ اٹھا کر جوش جذبات میں اندر چلا گیا۔

پیٹر بابو ..... شمشیر کو گولی مار دی ان ظالموں نے ..... وہ مجھے بچاتا  
رہا۔

سوہنی ہاتھوں پر چہرہ رکھے رو دی۔ اتنا روئی کہ اس کی سسکی بندھ  
گئی۔ پیٹر افسردہ میڈم میری کے پاس بیٹھ گیا۔

آپ کے ساتھ کیا ہوا ..... مجھے بڑا افسوس ہے ..... کیوں ایسا ہوا۔

وہ لوگ سوہنی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار ان کی سکیم کامیاب

ہو گئی ..... شمشیر سوہنی کو بچاتا ہوا قتل ہوا اور وہ بچہ لے کر بھاگ گئے۔

سوہنی کی حالت اس قدر خراب تھی کہ خدا جانتا ہے کس طرح سڑک پر ہم

نے ٹیکسی کی اور یہاں پہنچے ..... اب اس کی فکر ہے ..... بچے کی جدائی

برداشت نہیں کر سکتی۔

میڈم کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

پیٹر بابو ..... مجھے میرا بچہ لا دو ..... میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ

سکتی ..... بچہ نور محل میں ہے۔

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

ہونہ ..... خاقان اعظم ..... بہت بڑا بادشاہ ..... یہ لائق ہے اس  
نام کے۔

وہ ہونٹوں کو سیڑ کر بولیں۔ انداز طنزیہ تھا۔

کیوں نہیں بیگم صاحبہ ..... بیدار کا بچہ ہے ..... جھگی والی کو بھول  
جائے ..... اب تو اس کی ہڈیاں بھی مٹی میں مٹی بن چکی ہوں گی۔

پیٹر نے جانے کے لیے قدم اٹھائے اور ملازمہ نے موبائل فون بیگم  
صاحبہ کو تھما دیا۔

وہ بہت دیر فون سنتی رہیں ..... بڑی خوش نظر آ رہی تھیں۔

پیٹر نے پلٹ کر دیکھا۔

پھر بھاری قدموں سے اوپر والے پورشن کا زینہ چڑھ گیا۔

بچہ اب بھی روہ رہا تھا ..... بلک بلک کر ..... ملازمہ پریشان ہو رہی

تھی۔ پیٹر کا دل بری طرح دکھ گیا۔ اوپر چڑھتے ہی وہ بولا۔

ابھی تک تم اس بچے کو خاموش نہیں کروا سکی۔

صاحب جی کئی مرتبہ فیڈر دے چکی ہوں ..... بچہ دودھ پینے کا نام

ہی نہیں لے رہا ..... میرا تو کوئی قصور نہیں صاحب جی۔

وہ پریشان ہو کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے لگی۔

ٹھیک ہے۔

پیٹر پلٹا اور ساحل کی طرف بڑھ گیا۔

لاشعوری طور پر گاڑی فراتے بھرتی ہوئی ساحل کی طرف بڑھ گئی۔

کوئی نہ کوئی تو ہو گا۔ جی تو ہو گا۔ وہ سوہنی کی موت کے بارے میں پوچھ

گچھ کرنا چاہتا تھا۔

میڈم نے کہا اور سوہنی کی طرف دیکھا۔  
کب تک روائگی ہے آپ کی۔  
پیٹر نے کہا۔

بہت جلد ..... جی کے کچھ کاغذات مکمل کروانے والے ہیں۔

میڈم نے کہا۔  
میں بھی سوہنی کو نور محل سیٹ کرنے کے بعد واپس امریکہ چلا  
جاؤں گا۔

پیٹر بھی تنگ آیا ہوا نظر آیا۔  
وہاں میری ماسک فیکٹری ہے ..... آئس کریم سے اچھا کام چلتا ہے  
میرا ..... اب تو جی بھی میرے ساتھ ہے ..... میں چند دنوں میں دو تین  
ہلک تیار کر دوں گی جو سوہنی کے لیے کافی ہوں۔  
میڈم نے سوہنی کو دیکھا۔

سامان اور اوزار۔

پیٹر حیرت سے بولا۔

سب کچھ ہے ..... پہلے میرا ارادہ یہاں یہی کچھ کرنے کا تھا۔ پھر  
لوگوں کا رجحان دیکھ کر آئس کریم کا کام شروع کر دیا۔

پیٹر خاموش بیٹھا تھا۔

دیکھو پیٹر ..... سوہنی کو اب کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔

میڈم نے کہا۔

تکلیف کیسی میڈم جی ..... میرا بچہ میرے پاس ہو گا۔

وہ پرست انداز میں بولی۔

بالکل آیا بن کر تم نے بچے کی پرورش کرنی ہے ..... کسی کو کسی  
بات کا علم نہ ہو ورنہ ایک نئی مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔

میڈم نے کہا۔

نہیں ..... سوہنی ایسی نادان نہیں ہے۔

حوصلہ کرو سوہنی ..... خدا کوئی بہتر تدبیر نکال دے گا۔  
ٹھیک ہے ..... وہ لوگ تو تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوہنی کو  
مار چکے تھے اور بچے کو بیگم نور الدین کے حوالے کر دیا۔  
پیٹر نے کہا۔

اب کیا کروں ..... میرا بچہ ..... میں وہاں نوکرائی رہ لوں گی۔ پیٹر  
بابو ..... مجھے وہاں لے چلو ..... بڑی بیگم ..... روپی کے ظلم سہ لوں گی .....  
بس مجھے میرے بیٹے کے پاس لے چلو۔

وہ ہلک ہلک کر رو دی۔

مبر کرو نا ..... کچھ سوچنے دو۔

پیٹر نے آیا کا مسلہ پیش کر دیا۔

سارے مسئلے حل ہو گئے ..... ہم ایسا ماسک اس کے چہرے پر چڑھا  
دیں گے کہ کوئی نور محل کا باسی پہچان نہیں سکے گا۔

میڈم نے کہا۔

پیٹر کو تسکین سی ہو گئی لیکن سامان بکھرا دیکھ کر وہ پھر میڈم کی  
طرف پلٹا۔

آپ نے ساحل کو ویران کیوں کر دیا ہے۔

میں سب کچھ فروخت کر کے جرمن واپس جا رہی ہوں۔

میڈم نے کہا۔

پیٹر بابو ..... میں بھی جا رہا ہوں۔

جی نے کہا۔

ہاں پیٹر ..... جی کو ساتھ لے جا رہی ہوں ..... میری طرح یہ بھی  
اکیلا ہے ..... میرے ساتھ رہے گا تو اس کو بھی اکیلے پن کا احساس نہ ہو گا۔  
میں تو صرف سوہنی کی وجہ سے رکی ہوئی تھی ..... خوف اور دہشت سے جینا  
عذاب ہو گیا ہے ہمارا ..... اچھا ہوا ہے جو اب اس کا مسلہ بھی حل ہو گیا  
ہے۔

پیٹر نے کہا۔

پھر وہ مطمئن ہو کر واپس دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔  
کئی دن گزر گئے۔ کام میں فرصت ہی نہ ملی۔ وہ بیدار کے آنے  
تک سارے کام نبھانا چاہتا تھا اور سارا حساب کتاب جانچ پڑتال کے بعد  
صاف ستھرا رکھنا چاہتا تھا۔

وہ عورت بولی۔

آ جاؤ بی بی ادھر ہی ..... وہ سامنے بیٹھی ہیں۔  
بوڑھے ملازم نے اشارہ کیا۔  
آداب بیگم صاحبہ۔

وہ مودب ہاتھ چہرے تک لا کر بولی۔

پیٹر نے پلٹ کر دیکھا اور دل ہی دل میں میڈم میری کی مہارت  
کا قائل ہو گیا۔ سوہنی اس وقت چالیس پتالیس کی ادھیڑ عمر عورت لگ رہی  
تھی۔ رخساروں پر کچھ جملے ہوئے زخموں کا نشان تھا۔ سفید شلوار قیض میں  
لبوس سفید ہی چادر اچھی طرح اوڑھی ہوئی تھی۔  
تمہیں معلوم ہے تم کس لیے یہاں آئی ہو۔  
بیگم نور الدین نے کرننگلی کو خیر باد نہیں کہا تھا۔ بچے کی کڑواہٹ  
ہوں کی توں قائم رہی۔

جی ہاں ..... بچے کی آیا بن کر۔

وہ پیٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

ٹھیک ہے ہم تمہیں دو ہزار ماہوار دیں گے۔

جی .....

سوہنی نے کہا۔

پیٹر نے آنکھیں جھپکیں۔

کچھ مدت کے بعد تمہاری تنخواہ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

ہاں کیوں نہیں ..... کیا معلوم بیدار خود اضافہ کر دیں۔

سوہنی نے سنا اور چہرہ پر سکون انداز میں پیٹر کی طرف گھمایا۔

بابا .....

پیٹر نے دور کھڑے ملازم کو آواز دی۔

جی پیٹر بابو!

نمو کو یہاں بھیجو ..... بچہ لے کر آئے۔

Yes Madom

آؤ پیٹر ..... ہم خاقان کے لیے بست پریشان ہیں۔

پریشانی دور ہو چکی ہے بیگم صاحبہ۔

پیٹر نے کہا۔

آیا مل گئی ..... سنبھال لے گی نا ..... کیونکہ روپی کے لیے کوئی مسئلہ

نہیں بننا چاہئے۔

کوئی مسئلہ نہیں ہے بیگم صاحبہ ..... شام کو وہ آ جائے گی۔

اب شام نہیں ہے ..... شام تو ہو گئی۔

وہ بے قراری سے بولیں۔

اس وقت آیا کو آ جانا چاہئے تھا۔

لو وہ رکشہ رکا ..... شاید وہی ہے۔

رکشے سے چالیس کے لگ بھگ عورت اتری ..... چھوٹا سا اٹیچی

اس کے پاس تھا۔

بابا ..... ہمیں بڑی بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔

ہمارا ایک بچہ تھا ..... وہ ہمارا شوہر ہم سے چھین کر لے گیا۔  
 سوہنی نے کہا۔  
 چلو آیا ..... اوپر والے پورشن پر ..... نمو لے جاؤ آیا کو۔  
 پیٹر نے کہا۔ (وہ سوچنے لگا کہ کہیں باتوں باتوں میں کچھ اگل نہ  
 دے)۔  
 ٹھیک ہے صاحب جی۔  
 نمو نے کہا۔  
 سنو آیا۔  
 بیگم نور الدین نے کہا۔  
 جی۔  
 وہ پلٹی۔

بچے کو لے کر تم نے اوپر والے پورشن پر ہی رہنا ہے۔ نیچے آنے  
 کی کوئی ضرورت نہیں ہے ..... تمہاری اور بچے کی ضرورت کی ہر شے اوپر  
 موجود ہے۔ سمجھی۔  
 ٹھیک ہے جی ..... کیا ضرورت ہے ..... ہم تو بچے کے لیے آئے  
 ہیں۔

وہ کہتے ہوئے نمو کے ساتھ اوپر والے پورشن کا زینہ چڑھ گئی۔  
 اوپر جا کر سوہنی نے جی بھر کر خاقان کو پیار کیا۔ اور ..... اپنے دودھ پر اس  
 کی پرورش کرنے لگی کہ نور محل کے مکین یہی جانتے تھے کہ وہ خاقان کو فیڈر  
 سے فیڈ کراتی ہے لیکن وہ اپنا جگر اپنا خون اس پر نچھاور کرتی رہی۔  
 دوسروں کو احساس تک نہ ہوا کہ خاقان کس کی گود میں پرورش پا رہا ہے۔

پیٹر نے کہا۔  
 بوڑھا اوپر والے پورشن کا زینہ چڑھ گیا۔  
 بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔  
 ماما تڑپ اٹھی ..... لان کا فاصلہ صدیوں کا طویل فاصلہ بن گیا لیکن  
 اس کو ہر حال میں اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا تھا۔  
 جی بیگم صاحب جی۔  
 وہ خاقان کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ خاقان شدت گریہ سے بے قابو  
 ہو رہا تھا۔

ہمیں دو لڑکی۔  
 سوہنی نے ایک دم بیتاب ہو کر نمو سے خاقان کو لے کر سینے سے  
 لگا لیا۔

خاقان دس دن سے ماما کی گرمی کو تڑپ رہا تھا۔ محسوس ہوتے ہی  
 روتے روتے پرسکون کلاکریوں میں تبدیل ہو گیا۔ اس کا تڑپ کر رونا سکون  
 میں تبدیل ہو گیا۔

بیگم نور الدین نے قرآلود نظر نمو پر ڈالی۔  
 دس دن ہو گئے تم ایک دن بھی بچے کو بہلا نہیں سکیں ..... کیسی  
 لڑکی ہو تم۔

بیگم صاحب جی ہم نے تو بہت بہلایا ..... ہم سے تو دودھ بھی نہیں  
 پیتے تھے۔

نمو خوفزدہ ہو کر سوہنی کی طرف دیکھ کر بولی۔  
 اس کا قصور نہیں ہے بیگم صاحب جی ..... یہ لڑکی ہے ..... ابھی  
 اس کی گود ماما کی گرمی سے مانوس نہیں ہوئی۔  
 سوہنی نے خاقان کو شانے پر لگا لیا۔

تمہارے بچے ہیں۔  
 بیگم نور الدین نے کہا۔

سیٹ کروا دیا تھا۔ آیا اور خاقان بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔  
حسب معمول وہ آفس سے واپس نور محل آئے تو پورچ میں گاڑی کھڑی  
کہ ملازم بھاگتا ہوا آیا۔

لو بھی بریف کیس لے جاؤ..... ہم اوپر خاقان بیٹے سے مل کر آتے

ٹھیک ہے صاحب۔

ملازم چلا گیا۔

وہ اوپر والے پورشن کی سیڑیاں چڑھ گئے۔

ارے کہاں ہو بھی خاقان بیٹے!

وہ خالی خولی سب دیکھ کر حیران ہو گئے۔

آیا ماں..... پاپا ہیں۔

وہ کرسی سے اٹھتا ہر لپکا۔

پاپا..... آئیے آئیے..... کھانے کا وقت ہے آپ بھی آئیے۔ بڑے

پٹنے کے شامی بنائے ہیں آیا ماں نے۔

وہ دونوں ڈانگ ہال میں داخل ہوئے۔

ہوں.....

وہ مسکرا دیے۔

سلام صاحب جی۔

آیا نے دوپٹہ درست کیا۔

بیٹھیں نا..... آج میرے ساتھ کھانا کھائیں..... کبھی نہیں کھایا

پٹنے میرے ساتھ کھانا۔

خاقان اصرار کرنے لگا۔

کیوں نہیں کھاؤں گا..... یہ دیکھو شامی لے رہا ہوں۔

بیدار بخت نے ایک شامی اپنی پلیٹ میں رکھا۔

یہ لیجئے..... ماش کی دال اور قیمہ..... قسم سے غضب کی بنائی ہوئی

(28)

وقت اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ گزرتا چلا گیا۔

تک تک کرتی گھڑی کی سویاں اپنے پیچھے ہزاروں یادیں چھوڑ  
گئیں۔ کئی چاند ابھرے اور کئی اماوس کی راتوں میں ڈوب گئے۔ سوہنی بطور  
آیا بیس برس خاقان کی پرورش کرتی رہی۔ نور محل کے مکین اتنے سالوں  
کے بعد بھی اپنی نفرتوں کو کم نہ کر سکے۔ روہی نے اپنے بچوں کے ذہنوں میں  
جس طرح سے نفرتوں کا بیج بویا تھا وہ کم نہ ہوا بلکہ ایک تناور درخت بن کر  
پھیل گیا۔ روہی کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی زہیرہ اور ایک لڑکا بختاور۔ بختاور  
خاقان سے دو ڈھائی سال چھوٹا تھا اور زہیرہ چند ماہ۔ روہی اور بیگم نور الدین  
کی نفرت نے رخ نہیں بدلا اور وہ زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔

خاقان آیا (سوہنی) کی گود میں پل کر ایک خوبصورت نوجوان بلکہ ہو  
ہو بیدار بخت کی تصویر نکلا سوہنی نے اپنے اوپر آیا کا جو غلاف چڑھایا ہوا تھا  
اسے کبھی بھی اتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نے آیا بن کر نور محل کے  
ہر ستم کا ہنس کر مقابلہ کیا۔ خاقان ایک شریف النفس سیدھا سادا لائق اور  
ذہین نوجوان تھا۔ وہ نور محل کے ہر مکین کی نفرت کا مقابلہ کرنا اپنی عادت بنا  
چکا تھا۔ گو بیدار بخت گھر جھگڑایا قیامت برپا کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن پھر بھی  
انہوں نے خاقان کے حق کو کبھی تلف نہیں کیا تھا۔ وہ دن میں ایک آدھ  
مرتبہ اوپر آیا کے پاس ضرور جاتے اور خاقان کے بارے میں بات چیت  
کرتے۔ اوپر والا پورشن اسے قدر آباد نظر آتا تھا کہ بیدار بخت نے کچن بھی



ہے آیا ماں نے۔

خاقان کو سامنے باپ یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات اختیار کر لی ہو۔

Very Good

آیا نے ایک خالی پلیٹ ان کے سامنے رکھی۔

(چہرے کی نسبت ہاتھ کتنے صاف اور خوبصورت)۔

وہ دل میں سوچ کر رہ گئے۔

بھئی واہ ..... اب صبر نہیں کر سکتا۔

وہ جی بھر کے کھانا کھا گئے۔

خاقان بیٹے۔

وہ پانی کا گلاس میز پر رکھ کر بولے۔

اب تم مطمئن ہونا ..... یہ چند ماہ سے تم لوگوں کا کچن علیحدہ کر دیا ہے نا۔

ہے نا۔

بیدار بخت جانتے تھے کہ ایک ساتھ ڈانگ ہال میں کس کس طرف

کی اور گھٹیا باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

ہاں پاپا یہ آپ نے بہت اچھا کیا ..... مئی اور دادو ماں کو اچھا نہیں

لگتا تھا میرا سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔

خاقان مسکرا کر بولا۔

تم دل پر کوئی بات نہ لینا ..... میرے لیے بخاور اور خاقان ایک ہی

ہیں۔

وہ کھڑے ہو گئے۔

میں جانتا ہوں پاپا ..... میں کیا ہوں ..... خیر مجھے اس کا غم بھی نہیں

ہے۔ خون تو آپ کا ہی ہوں ..... بیٹا تو آپ کا ہوں۔

وہ محبت سے بولا۔

My lovely Son

ایک دم بیدار بخت نے خاقان کو لپٹا لیا اور بڑی محبت سے پیشانی

چوم لی۔

سوہنی نے آنکھیں بند کر لیں۔

دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کے سہارے نیچے تک چلے گئے۔

خدا حافظ پاپا۔

بیدار بخت آگے بڑھ گئے اور خاقان اوپر آگیا۔

آیا ماں۔

وہ حسب عادت باہر سے ہی پکارا۔

بیٹا میں ادھر ہی ہوں۔

وہ ڈانگ ہال سے ہی بولی۔

آپ کھانا کھائیں نا ..... پاپا کے آجانے پر آپ نے ایک لقمہ بھی

نہیں کھایا۔

خاقان نے شانے پکڑ کر آیا کو کرسی پر بٹھا دیا۔

تم کھاؤ میرے چاند ..... میں نے دیکھا تم نے بھی کچھ نہیں کھایا۔

وہ پلیٹ میں سالن ڈالنے لگی۔

خاقان نے لقمہ آیا کی ہی پلیٹ میں سے لیا۔

بیٹا سالن ڈال دوں۔

وہ دیکھ کر بولی۔

نہیں آیا ماں ..... ایک ہی پلیٹ میں کھالیں گے ..... مجھے آپ کے

ساتھ کھانا اچھا لگتا ہے۔

سوہنی نے ساری جان سے قربان اس بیٹے کو دیکھا جو تھا تو اپنا لیکن

وہ دنیا کے خوف سے اپنا نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس پر ساری مامتا کی محبت

نچھاور ..... میری جان میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔

کھائیں نا ..... کیا سوچ رہی ہیں۔

خاقان نے لقمہ نگل کر کہا۔

کھا رہی ہوں۔

وہ لقمہ سالن کے ساتھ لگا کر منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

کیا بات ہے۔

روبی نے آنکھیں اٹھائیں۔

پاپا جوانی میں بڑے رومانٹک ہوں گے۔

بخاور زہرہ کے ساتھ مل کر ہنس دیا۔

کھانا کھاؤ ..... باتیں بعد میں کرنا۔

بیگم نور الدین کو اچھا نہیں لگا۔

بخاور کھیانہ سا ہو کر کھانا کھانے لگا۔ زہرہ بیگم نور الدین سے زیادہ خوفزدہ تھی اس لیے خاموش رہی۔

کھانا ختم کرتے ہی دونوں اٹھ گئے۔

روبی بچوں کو منع کیا کرو ..... ایسی باتوں سے گھر میں نفاق پڑنے کا

اندیشہ ہے۔

بیگم نور الدین نہیں چاہتی تھیں کہ نور محل میں کوئی ایسا فساد پڑے اور پھر ایک نئی کہانی جنم لے۔

آنٹی ..... آپ سوچیں تو سہی ..... چند ماہ سے کچن علیحدہ ہو گیا

خاقان کا۔ اب کوئی ملہ کھڑا نہیں ہوتا ..... میں مانتی ہوں بچے اسے تنگ

کرتے تھے ..... اب کیا کیا جائے ..... میں بچوں کی زبانوں پر پورا نہیں بٹھا

سکتی۔

بیگم نور الدین نے ایک دم روبی کی آنکھوں میں بغاوت کی چمک

دیکھی۔

تم اس گھر کی مالکہ ہو ..... جو مقام تمہیں حاصل ہے وہ کسی اور کو

نہیں ہے۔ تمہیں کیسے بتائیں کہ تمہارے لیے ہم نے کیا کچھ کیا ہے ..... بات

صرف خاقان کی ہے۔ اس کو ہر وقت طنز کا نشانہ بنانا زیب نہیں دیتا۔ اب تو

وہ خاموش رہتا ہے ..... مبادہ کہ وہ جھگڑے میں سبقت نہ لے جائے۔

وہ چونک کر در پیچے سے باہر دیکھنے لگیں۔

کون ہے۔

بیدار بخت زینہ اتر کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔

کھانا کب سے ٹھنڈا ہو رہا ہے ..... اتنی دیر لگا دی آپ نے اوپر۔

روبی نے کہا۔

کھانا میں کھا آیا ہوں ..... خاقان ضد کر بیٹھا تھا۔

بیدار بخت نے اپنی نکلتائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے کہا۔

آپ نے کھا لیا ..... اور ہم ابھی تک انتظار کرتے رہے۔

روبی تیز آواز کے ساتھ بولی۔

کوئی بات نہیں ..... اب کھالیں آپ ..... کوئی خاص وقت نہیں

ہوا۔

وہ کلاک کو دیکھ کر بولے۔

ہو نہ .....

وہ شانے جھٹک کر کمرے سے نکل گئیں۔

کھاؤ تم لوگ۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

میں نے انہیں جھگڑنے والے کے پاس جاتے دیکھا ہے۔

بخاور نے کہا۔

زہرہ نے قہقہہ لگایا لیکن بیگم نور الدین خاموش کھانا کھاتی رہیں۔

اما۔

بخاور نے ہنستے ہوئے کہا۔

بنائے تھے..... کھا بھی لئے..... تم ٹائم پر آ جاتی تو کھا لیتی۔

وہ سنجیدہ سامنہ بنا کر بولا۔

مہک نے آیا کی طرف دیکھا۔

بھلا ترے بغیر ہم کباب کیسے کھا سکتے ہیں..... بیٹھو میں گرم کر کے

ہوں۔

آیا پلٹی۔

آیا ماں..... ٹھہرو میں خود گرم کر لوں گی۔

مہک دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ٹھیک ہے آیا ماں..... شکر کرے ہم نے اس کے لیے رکھ ہی لیے

تھے۔

وہ شریر انداز میں ہنس دیا۔

ایسا نہ کہا کرو بیٹا..... مہک بہت اچھی بچی ہے۔

آیا کو مہک بہت اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ جالی سے کبابوں سے بھری پلیٹ نکال کر گیس پر گرم کرنے لگی

ایک دم بری طرح سے اچھلی۔ بخٹاور اور زنیہ ہنستے ہوئے داخل ہوئے۔

اچھا..... یہ کباب حلال ہو رہے ہیں۔

بخٹاور نے ایک کباب اٹھا کر منہ میں رکھا۔

آیا اس جھگی والے کو کھانے بڑے اچھے کھلاتی ہے..... کتنے مزے

لے ہیں۔

بخٹاور بولا۔

زنیہ نے ایک کباب منہ میں رکھا۔

ہمارا خانہ ماں دال زیادہ ڈالتا ہے۔

زنیہ نے بڑی رغبت سے دوسرا کباب اٹھایا۔

تم اس طنزیہ فقرے سے باز نہیں آ سکتے۔

مہک کو غصہ آ گیا۔

مہک ہے۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

لیکن مہک گاڑی سے اتری اور اوپر والے پورشن کا زینہ چڑھ گئی۔

خاقان.....

وہ اوپر جاتے ہی بولی۔

اندر چلی جاؤ..... سو رہا تھا شاید۔

آیا کچن سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

اتنا خوبصورت موسم اور اس کو سونے کی پڑی ہے..... دیکھتی ہوں

تا.....

وہ ایک دم سے اندر داخل ہوئی۔

وہ چہرے پر تکیہ رکھے خرائے لے رہا تھا۔

خاقان اٹھو.....

مہک نے تکیہ کھینچ لیا۔

خاقان نے دوسری طرف کروٹ لی۔

اوہو کیا مصیبت ہے..... اٹھتے کیوں نہیں ہو۔

مہک نے جھنجھلا کر دونوں ہاتھوں سے خاقان کو جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر

بالوں کا ستیاناس کر دیا۔

آیا ماں..... اس جنگلی بلی کو اندر کیوں آنے دیا۔

وہ اٹھ کر مہک کے دونوں ہاتھ اپنے ایک ہاتھ میں دبوچ کر بولا۔

آیا ماں ہنستی ہوئی داخل ہوئی۔

بیٹا..... وہ میری بیٹی ہے..... جس وقت جی چاہے آ جائے۔

مہک نے فاتحانہ انداز میں خاقان کی طرف دیکھا۔

آیا ماں..... کباب بنا لیے۔

وہ مسکرا کر بولی۔

آیا ہنس دی۔

کیوں ..... یہ حقیقت نہیں ہے ..... وہ جھگی والی کا بیٹا ہے تو جھگی والا ہی ہوا نا۔

بختاور کے انداز میں سارے جہان کی نفرت سمٹ آئی۔

چلو آؤ خاقان کے کمرے میں۔

مہک نے برا سامنہ بنایا۔

وہ پلیٹ کو پکڑے پکڑے بولی۔

ہم لوگ تو تمہیں دیکھ کر آگئے تھے ورنہ اوپر آنے کا ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔

زنیرہ نے کہا۔

ٹھیک ہے ..... کباب کھاؤ اور جاؤ ..... چائے ہم اکیلے پیئیں گے۔

مہک اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

اوہو زہے نصیب ..... بھائی اور بہن آئے ہیں۔

خاقان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

بد قسمتی سے۔

زنیرہ نے منہ میں کہا جسے صرف مہک نے سنا۔ خاقان صرف منہ کھول کر رہ گیا۔

کیا ارشاد فرمایا آپ نے۔

مہک نے کہا۔

جی کچھ نہیں۔

دونوں کبابوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولے۔

آیا ماں کہاں ہے۔

خاقان نے کہا۔

میرا خیال ہے نماز پڑھ رہی ہیں۔

زنیرہ نے کہا۔

اسی وقت آیا داخل ہوئی۔

آیا ماں ..... بھائی اور بہن کو کبابوں کی خوشبو لے کر آئی ہے۔

خاقان ہنس دیا۔

بیٹا ..... یہ روز آئیں میں روز کباب بنانے کو تیار ہوں۔

آیا نے محبت سے کہا۔

آیا ماں اچھی سی چائے۔

زنیرہ نے کہا۔

ابھی لائی۔

اور آیا کچن میں چل دی۔

کافی دیر گپ شپ ہوتی رہی۔

آیا چائے بنا کر لے آئی تھی۔

اسے دیکھتے ہی مہک کھڑی ہو گئی۔

لایئے آیا ماں میں بناتی ہوں چائے۔

مہک نے ٹرائی تھام لی۔

لو بیٹی ..... میں چلتی ہوں ..... بعد میں برتن لے جاؤں گی۔

آیا ماں ..... ادھر بیٹھیں نا ..... چائے پیئیں۔

خاقان نے پکارا۔

نہیں بیٹا ..... تم لوگ پیو چائے میں ذرا آرام کروں گی۔

وہ مسکرا کر بولی۔

اچھا چلے مہک آپ کے لیے چائے لاتی ہے۔

خاقان نے کہا۔

زنیرہ نے بختاور کی طرف دیکھا۔

آیا باہر نکل آئی۔

مہک پہلے آیا ماں کو چائے دے آؤ۔

خاقان نے کہا۔

ارے خاقان اعظم ..... وہ تمہاری مایہ ناز ہے ..... اتنا مرتبہ دے دیا

زمانہ کیسا جا رہا ہے ..... اس میلی شام میں نوجوان لڑکی اکیلی جائے

اس کو۔

بخاور طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر بولا۔

وہ میری ماں کی جگہ ہے ..... حقیقت تو یہ ہے مجھے آیا ماں کی موجودگی میں ماں یاد ہی کبھی نہیں آئی اور نہ میں اسے ملازمہ سمجھتا ہوں۔

خاقان نے حسب عادت پھر سلجھا ہوا جواب دے دیا۔

مہک نے خاموشی سے سب کے لیے چائے بنائی سب کو کپ پیش کیے اور پھر آیا کو بھی دے آئی اور بعد میں خود لے کر بیٹھ گئی۔ چائے اچھی بنائی تھی۔

بخاور تمہاری سالگرہ کب ہے۔

مہک نے کہا۔

جب کوگی سال میں گرہ باندھ لیں گے۔

بخاور نے کہا۔ سب ہنس دیے۔

ہاں بھی ضرور ..... کوئی دھوم دھڑکا ہونا چاہئے ..... کیوں مہک۔

حسب عادت خاقان نے مہک سے مشورہ لیا۔

دل تو یہی چاہتا ہے کوئی فنکشن ہو ادھر یا ادھر۔

مہک نے کہا۔

زنیرہ خاموش چائے پیتی رہی۔

ایک دم چونک کے مہک نے سامنے دیکھا۔

اوہو شام ہو گئی ..... باتوں باتوں میں پتہ ہی نہیں چلا۔

کوئی بات نہیں بخاور چھوڑ آئے گا۔

زنیرہ نے کہا۔

ہاں ہاں ..... چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔

بخاور کھڑا ہو گیا۔

نہیں ..... ایسی کوئی بات نہیں ہے ..... میں اکیلی چلی جاؤں گی۔

مہک نے خاقان کی طرف دیکھا۔

خاقان نے کہا۔

نہیں میں اکیلی جاؤں گی ..... یہ شام میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

وہ باہر نکل گئی۔

ارے رکو مہک ..... میں تمہیں چھوڑ آؤں گا ..... اس وقت اکیلے

جانا۔

خاقان نے کہا۔

خاقان ..... بخاور جا رہا ہے ..... تم رہنے دو۔

زنیرہ نے کہا۔

لیکن بخاور پہلے ہی گاڑی لے کر وہاں پہنچ چکا تھا۔

وہ بادل خواستہ انگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

میں تمہاری خاقان سے زیادہ بے تکلفی برداشت نہیں کروں گا۔

بخاور خفگی بھرے انداز میں بولا۔

کیا ..... میں سمجھی نہیں۔

مہک حیرت سے بولی۔

مطلب یہ ہے کہ خاقان سے زیادہ گھٹنے ملنے کی ضرورت نہیں ہے

وہ جھگی والی کا بیٹا ہے ..... اپنے وقار کا خیال رکھو۔

وہ زبردست کراہٹ سے بولا۔

اگر خاقان جھگی والی کا بیٹا ہے تو وہ عورت بڑی عظیم ہو گی۔

مہک ایک دم سے بولی۔

یہ کیا کہہ رہی ہو۔

میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ..... خاقان انتہائی شریف اور سلجھا ہوا

ہے۔

مہک کو غصہ آ گیا۔

ممی ..... خاقان کو آپ برا کیوں سمجھتی ہیں ..... وہ ایک شریف آدمی ہے۔

مہک زچ ہو کر بولی۔

ہو گا شریف ..... لیکن تم نے کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ بیٹا کس کا ہے۔ اس نے کس کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

بیگم شفیق کے الفاظ نفرت و حقارت کے زہریلے نشتر بن کر مہک کے دل میں اترنے لگے۔

وہ میں سن چکی ہوں کہ اس نے جھگی والی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ بات کا ذکر تو روٹی آگنی ہمیشہ کرتی رہتی ہیں۔

وہ غصہ کرتے ہوئے بولی۔

وہ ہے نا جھگی والی کا بیٹا ..... تمہیں سمجھ جانا چاہئے ایسے لوگوں کا بچے طبقے کے ساتھ کیا واسطہ ہے ..... ہمارا ان کا کیا جوڑ ہے۔

بیگم شفیق کو خاقان سے ازلی بیر تھا۔

ممی ..... وہ رئیس بیدار بخت کا بیٹا بھی تو ہے ..... آپ لوگ اس کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں۔

وہ پاؤں زمین پر مار کر بولی۔

خاقان کے اپنے اس سے نفرت کرتے ہیں ..... اس کے بہن بھائی کا راستہ کاٹ کر گزر جاتے ہیں اور تمہیں معلوم ہے بیگم نور الدین کس رگراہت کرتی ہیں اس سے۔

بیگم شفیق نے ناک سیڑی۔

ان کو جھگی والی سے نفرت ہے ..... لیکن یہ نہیں احساس کہ خاقان کے لخت جگر کے جسم کا حصہ ہے ..... انکل بیدار تو نفرت نہیں کرتے۔

مہک نے کہا۔

اگر نفرت نہیں کرتا تو کھلم کھلا محبت نہیں کر سکتا ..... جو کچھ بھی

اس کا مطلب ہے کہ تمہیں حسب نسب کا بھی احساس نہیں ہے۔ بخاور نے ٹوکا۔

حسب نسب کی یہاں کیا بات ہوئی ..... بس وہ اچھا ہے۔ مہک نے کھل کر خاقان کی تعریف کی۔

اور ہم برے ہیں ..... جن کا بچپن تمہارے ساتھ گزرا ہے۔ بخاور نے کہا۔

بچپن تو اس کے ساتھ بھی گزرا ہے۔ مہک نے کہا۔

پھر مجھ میں اور اس میں اس قدر فرق کیوں ہے ..... تم سب سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارتی ہو۔

بخاور رقابت کی آگ میں جل رہا تھا۔

پورچ میں گاڑی رکی اور مہک گاڑی سے اتری۔ مہک .....

بخاور نے آواز دی۔

وہ پٹی۔

خدا حافظ نہیں کہو گی۔

وہ مسکرا کر بولا۔

خدا حافظ!

اور وہ برآمدے کا زینہ چڑھ گئی اور بخاور گاڑی واپس لے آیا۔

آگنی ..... کون چھوڑنے آیا تھا۔

بیگم شفیق مسکرا دیں۔

بخاور تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چل دی۔

اچھا ..... میں نے سوچا بیش کی طرح پھر خاقان۔

بیگم شفیق نے بل کر کہا۔

آیا سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔  
تم مک کو ٹیلی فون کر لو۔  
آیا نے کہا۔

کیسے کر لوں ماں ..... می جڑی رہتی ہیں ..... سن لیتی ہیں سب

کچھ۔

وہ مایوس ہو کر بولا۔

بیٹا تم نے مک کے بارے میں ہی معلوم کرنا ہے ..... کوئی ایسی  
ویسی بات تو نہیں کرنی۔

آیا سے خاقان کی پریشانی دیکھنا محال تھی۔

وہ خاموش رہا۔

ایسے کرو ..... غسل کرو، لباس تبدیل کرو اور خود چلے جاؤ۔ ٹھیک

ہے۔

اماں ..... کتنی بھولی ہیں آپ ..... اس کی ماں مجھے گھنے نہیں دے  
گی۔ نفرت کرتی ہے مجھ سے۔

خاقان نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

کیوں ..... تم تو چاندنی کی طرح اچلے اور جھرنے کے پانی کی طرح  
شفاف ہو۔ ترا دل ہر کسی کی کدورت سے پاک ہے پھر بھی .....  
وہ حیرت سے بولی۔

آپ جانتی تو ہیں ..... میں جھگی والی کا بیٹا ہوں۔

وہ اداس انداز میں بولا۔

اور آیا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یوں احساس ہوا  
جیسے کسی نے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

کیا وہ انسان نہیں تھی۔

آیا کی آواز حلق میں انک گئی۔

میں تو سمجھتا ہوں ..... وہ فرشتہ تھی جس نے مجھے جنم دیا اور دنیا

بیگم نور الدین کے قبضے میں ہے خاقان کو ایک روپیہ بھی نہیں ملے گا۔  
بیگم شفیق نے دوسری طرف سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔  
اچھا ..... ایک نفرت کی یہ بھی صورت ہے ..... وہ دولت کے بغیر  
بھی ٹھیک ہے۔

مک .....  
وہ چیخ اٹھیں۔

لیکن وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے وہ خاقان کو کسی قیمت پر چھوڑنے کا  
تیار نہیں تھی۔ خاقان کے مقابلے میں اسے سب کچھ پیچ نظر آتا تھا۔  
اس نے کروٹ لی۔

خاقان ..... خاقان ..... چاروں جانب خاقان ہی نظر آ رہا تھا۔  
اگر خاقان مک کو نہیں بھول سکتا تھا تو خاقان کو بھی ایک دن کا  
دوری برداشت نہیں ہوتی تھی۔ بیگم شفیق کا رویہ اس قسم کا ہوتا تھا کہ وہ  
وہاں جانا بڑا ہی معیوب سمجھتا تھا۔ آج مک کو آئے ہوئے ایک ہفتے سے  
اوپر ہو چکا تھا۔ وہ کتاب لیے خواجواہ ہی کرسی بچھائے بالکونی میں بیٹھا تھا جہاں  
سے باہر کا منظر بخوبی نظر آتا تھا۔

آیا اس کی پریشانی اور اداسی کا مطلب جانتی تھی۔

چائے کا کپ لئے وہ اس کے پاس آئی۔

آیا کو دیکھ کر خاقان نے میز پر سے ٹانگیں نیچے اتار لیں۔

لو بیٹا چائے پی لو ..... طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

خاقان نے خاموشی سے کپ تھام لیا۔

خوب اٹن شین ہو کر براؤن سوٹ زیب تن کئے سلیقے سے بال  
ہائے وہ زینہ اتر کر نیچے آیا۔ چابی لہراتا وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔  
او جھکی والے۔

وہ ایک دم چونکا۔  
اس کی پشت سے بخٹاور نے آواز دی تھی۔  
فرمائیے۔

وہ پلٹ کر اس کے قریب آگیا۔  
کوئی کام ہے۔

پہلے تو یہ بتاؤ..... تمہیں میری بات کا غصہ نہیں آیا۔  
بخٹاور نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

غصہ کیوں کروں گا..... جب میں جھکی والی کا بیٹا ہوں تو پھر۔  
خاقان مسکرا دیا۔

کہاں جا رہے ہو۔  
بخٹاور کھسیانہ سا ہو گیا۔  
بس یہاں ہی..... کسی دوست کو ملنے۔  
وہ جھوٹ بول گیا۔

جھوٹ مت بولو..... اس حالت میں تو صرف تم مہک کے پاس جا  
لے ہو۔

وہ بڑے بھائی کا احترام یکسر فراموش کر چکا تھا۔  
جی..... بہت دن ہو گئے تھے..... اس کی طرف سے کوئی اطلاع  
نہیں ملی۔ کالج ویسے ہی بند ہیں۔  
خاقان نے کہا۔

اداس ہو گئے تھے۔  
بخٹاور نے پھر طنز کیا۔  
تم نے مجھے کس لئے پکارا..... کوئی کام تھا۔

سے کوچ کر گئی..... پیدا کر کے مر گئی وہ۔  
خاقان نے آیا کو دیکھا۔  
اگر وہ زندہ رہتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔  
وہ آنکھیں صاف کرنے لگی۔

آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں..... مجھے تو کبھی ماں یاد ہی نہیں آئی  
- آیا ماں ترے احساس سے دل اتنا خوش ہوتا ہے کہ سب کچھ بھول گیا ہوں  
..... آپ نہ دل میلا کریں۔ دنیا کتنی ہے تو کتنی رہے۔

وہ محبت سے آیا ماں کے ہاتھوں کو تھام کر آنکھوں سے لگا کر بولا۔  
میرے چاند..... لوگ ترے باپ کو کیوں فراموش کر رہے ہیں کہ  
تو بھی رئیس بیدار بخت کا بیٹا ہے۔

آیا نے محبت سے خاقان کے الجھے بال سنوارے۔  
جا تو..... ترے کپڑے استری کر کے میں نے رکھ دیے ہیں..... جا  
اسے لے آ۔

وہ جانتی تھی محبت میں کتنی تڑپ اور اضطرابیت ہوتی ہے۔  
اماں..... کوشش کروں گا اگر اس کی ماں حاکل نہ ہوئی تو.....  
وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا۔

جھگڑا نہیں کرنا میرے چاند..... جو بات اثرورسوخ سے حل ہو  
جائے اس میں تلخی سے فائدہ نہیں۔  
وہ نصیحت کرنے لگی۔

میں جھگڑا لو لگتا ہوں آپ کو۔  
وہ آیا کے دونوں شانے تھام کر محبت سے بولا۔  
نہیں تو ایسا کب ہے..... میں تو ویسے تمہیں سمجھا رہی ہوں..... جا  
لے آ اسے..... اس کی پسند کی چیزیں پکاؤں گی۔

وہ محبت سے بولی۔  
اور خاقان گنگناتا ہوا ہاتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔



میں گاڑی ورکشاپ چھوڑ آیا ہوں ..... میں بھی وہیں جانا چاہتا ہوں۔

چلے۔

خاقان نے زبردست فراخ دلی کا ثبوت دیا اور گاڑی مہک کی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔

(29)

شام کے چھ بج چکے تھے ..... وہ ابھی تک کالج سے نہیں آیا تھا۔ اوپر سے جھانک کر اس نے دیکھا دور مغربی گوشے میں بیگم نور الدین اور روبی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ملازم اپنا اپنا کام کر رہے تھے لیکن اور کوئی نہ تھا۔ وہ زینہ اتری اور گیٹ کی طرف چل دی۔ خاقان کو جب بھی دیر ہوتی وہ سڑک پر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس کی جدائی بری طرح تڑپاتی اس کو۔ وہ آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔

آیا۔

دور سے خان بابا نے آواز دی جو بوڑھا تو کافی ہو گیا تھا لیکن آواز میں وہی رعب تھا۔

جی بابا۔

وہ خان بابا کے پاس ہی چل دی۔ خاقان بیٹے کو دیکھنے آئی ہو ..... ابھی بخاور اور زنیہ بیٹی بھی نہیں آئے۔

خان بابا نے تسلی کروائی۔

اچھا ..... اب دل کو ڈھارس ہوئی ہے ..... نظروں سے اوجھل ہوتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے میرا۔ کیوں نہ ہو ..... اپنے خون سے پالا ہے تو نے ..... پرانی اولاد جو ہوئی۔

وہ بولی۔

ہاں تو اور کیا..... اتنی گولیاں چلیں، زندہ کیسے بچتی۔  
بوڑھے خان نے کہا۔

میرا خیال ہے خاقان آگیا ہے۔

سفید گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہوئی..... اس کے بعد دوسری،  
بختاور گاڑی کو آگے لے گیا اور خاقان نے گاڑی وہیں روک دی۔  
آیا ماں۔

کھڑکی میں سے خاقان نے پکارا۔

وہ اس کی طرف لپکی۔

اتنی دیر لگا دی بیٹا.....

خاقان نے دروازہ کھولا اور آیا کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھالیا۔  
دور سے روٹی نے دیکھا، جل کر بیگم نور الدین سے مخاطب ہوئی۔  
آیا اپنی حیثیت بھولتی جا رہی ہے۔

روٹی نے کہا۔

بیگم نور الدین نے عینک کی اوٹ سے دیکھا خاقان بڑے مودب  
انداز سے آیا کو باہر نکال کر اوپر والے پورشن کی طرف لے گیا۔  
ایسی بات نہیں ہے..... فطری طور سے خاقان مودب بچہ ہے۔  
بیگم نور الدین نے کہا۔

آپ کی بات بھی درست ہے آنٹی..... وہ اوپر والے پورشن کی  
ماکن نظر آتی ہے۔ میرا تو خیال ہے اب آیا کی چھٹی کروادیں۔

روٹی نے زبردست سنگ دلی کا مظاہرہ کیا۔

یہ نہیں ہو سکتا..... ایسا ہوا تو خاقان بے آسرا رہ جائے گا۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

یہ آپ کہہ رہی ہیں۔

روٹی بولی۔

وہ ایک دم تڑپی۔

بابا..... میں نے تو پرایا بنا کر نہیں پالا نا۔

وہ بولی۔

اس کی ماں بڑی اچھی تھی..... کچھ وقت میں نے اس کے ساتھ  
گزارہ تھا..... میری بیٹی تھی وہ..... اس کو میں یہاں کے خوف سے اپنے  
بھانجے اور بھتیجی کے پاس چھوڑ آیا لیکن انہوں نے اس کی حفاظت نہ کی۔  
بابا..... کہیں چلی گئی وہ۔

سوہنی کو ایک دم سے خوفناک ماضی یاد آگیا۔

معلوم نہیں..... ان لوگوں نے کہا کہ وہ بھاگ گئی..... میں نے  
بہت جھگڑا کیا۔

خان بابا اداس ہو گیا۔

پھر کیا ہوا۔

وہ بولی۔

پھر کیا..... میں ناراض ہو کر وہاں سے آگیا..... اس وقت سے  
اب تک ان کی شکل نہیں دیکھی۔

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔

پھر کیا ہوا بابا..... اسے معلوم تو سب کچھ تھا لیکن وہ خان کی زبانی  
سننا چاہتی تھی۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

پھر کیا ہونا ہے..... ہسپتال میں گولی چلی..... اس کے چاچے کا پوت  
مارا گیا۔ اس کی لاش نہیں ملی۔

خان بابا رو دیا۔

اور آیا نے آنسو صاف کیے۔ شمشیر کی صورت اس کی آنکھوں میں  
گھوم گئی۔

مرکب گئی ہو گی بابا۔

نہیں بیدار بخت کے الفاظ ہیں جو میں دہرا رہی ہوں۔  
اچھا۔

روبی نے آنکھیں پھاڑیں۔

ہاں ..... خاقان کے کام کون کرے گا ..... یہاں ہزاروں نوکر ہیں،  
خاقان کے پاس تو صرف آیا ہے۔

بیگم نورالدین نے کہا۔

بیدار کو تو ویسے بھی آیا سے بہت ہمدردی ہے۔

روبی بولی۔

تم اس بات کو چھوڑو ..... جو اگلا مسئلہ ہے اس کی بات کرو۔

بیگم نورالدین خواجواہ کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتی تھیں۔

میں اب بچوں کی شادیاں کرنا چاہتی ہوں۔

روبی نے کہا۔

کوئی اچھے رشتے ہیں تمہاری نظر میں۔

بیگم نورالدین نے دور آتے بیدار کو دیکھا۔

روبی نے پلٹ کر دیکھا۔

آج بیدار بھی آلیں تو بات ہو جائے ..... مجھے صرف بخاور کی  
پریشانی ہے۔

بیدار قریب آ گئے۔

روبی کھڑی ہو گئی۔

بیگم نورالدین نے ہنس کر دیکھا۔

آؤ بیٹھو ..... باہر کا موسم اچھا ہے ..... کچھ باتیں بھی تم سے کرنا

ہیں۔

روبی دوسری کرسی پر بیٹھ کر ہنس دی۔

بیگم نورالدین بھی ہنس دیں۔

کہنے۔

بیدار ہنس دیے۔

بیٹا، بخاور کی سالگرہ قریب آ رہی ہے۔

میں چاہتی ہوں زنیہ کی منگنی بھی کر دوں ..... عاطف باہر سے آنے  
ہے۔

روبی نے کہا۔

بیگم نورالدین نے روبی کی طرف دیکھا اور کہا۔

بیگم شفیع سے مکہ کے لیے بات کرو۔

میرا خیال ہے مکہ خاقان کے لیے بہتر رہے گی۔

بیدار بولے۔

وہ مکہ کو خاقان کے ساتھ اکثر دیکھتے تھے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے ..... خاقان کو کیا حق حاصل ہے ..... ہمارے

ملے میں خلل ہونے کا۔

روبی تنک کر بولی۔

خاقان میری اولاد ہے ..... میں اس کے حق کو فراموش نہیں کر

بیدار بولے۔

تو کیا وہ جھگی والا میرے بیٹے کی برابری کرے گا۔

روبی نفرت و حقارت سے بولی۔

یہ لعنت ختم نہیں ہوگی ..... وہ میرا بیٹا ہے ..... جھگی والا کہہ کر اس

لمسی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

بیدار حسب عادت اٹھے اور واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دیکھ لیا آئی ..... کتنی تکلیف پہنچتی ہے بیدار کو، بات نہیں سن

ا۔

بیگم نورالدین کے لیے اب فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نفرت کا جو

بوچکی تھیں وہی کاٹنا تھا ان کو۔

میں خود..... ہم تینوں کام کر لیں گے۔  
اچھا۔

بیدار بخت آہستہ سے ہنس دیے۔  
جی ہاں۔

Good۔

بیدار بخت نے خاقان کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا دیے۔  
مہک قنوا بنا رہی ہے..... ابھی لایا آپ کے لیے۔  
Good V. بس یہ چیز بہت قیمتی ہے۔  
وہ اٹھا اور ٹھک ٹھک زینہ چڑھ گیا۔  
ایا ماں..... اماں۔

حسب عادت اونچی آواز سے بولا۔

کیا ہے..... آیا ماں کو یوں آوازیں دے رہے ہو جیسے کھو گئی ہو۔  
مہک کچن سے باہر آگئی۔  
سامنے کمرے سے آیا ہنستی ہوئی باہر آگئی۔

یہ میری ماں ہے..... اس کو کھونے کون دے گا..... ساری کائنات  
ہار کر جیت لوں گا ماں کو۔

وہ محبت سے آیا کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر بولا۔

آیا نے جھک کر خاقان کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

اچھا ایسے کرو..... پیپا کے لیے جلدی سے ایک کپ قنوا بنا دو، میں  
انہیں کہہ کر آیا ہوں۔

وہ چنگی بجا کر مہک کے پاس آیا۔

ابھی لائی..... قنوا تو تیار ہے۔

مہک واپس کچن میں چلی گئی۔

اماں..... بڑی سکھڑ ہے تمہاری بہو۔

وہ آیا ماں کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

بیدار خاموش اپنے کمرے میں داخل ہوئے..... وہ بے دل بستر پر  
لیٹ گئے۔ پریشانیوں ان کے مقدر میں شامل ہو چکی تھیں۔

پیپا.....

خاقان کی آواز پر وہ چونکے۔

آؤ.....

وہ بستر پر سے اٹھے۔

آداب۔

خاقان نے بڑے ادب سے کہا اور سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔

کیسے آنا ہوا میرے بیٹے کا۔

وہ بڑی محبت سے دیکھ کر بولے۔

آج خاقان کی خوبصورت آنکھوں اور چمکتے رخساروں میں سوہنی کی  
شبیبہ نظر آ رہی تھی..... کتنی محبت کرنے والی عورت تھی..... مجھ سے  
جدائی کے خوف سے چھپتی پھرتی تھی۔

خاقان نے چونک کر دیکھا اور پھر بولا۔

پیپا..... رات کو کھانا آپ نے میرے ساتھ کھانا ہے۔

کیوں نہیں..... ضرور کھائیں گے..... لیکن ہمارا بیٹا کیا کھلائے گا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

آپ کیا پسند کریں گے، وہی بن جائے گا۔

وہ مسکرایا۔

مجھے تو آیا کے بنے ہوئے شامی اور وہی پھلکیاں بہت پسند ہیں۔

وہ بڑی چاہت سے بولے۔

وہی کچھ بنے گا جو آپ پسند کریں گے۔

ارے بیٹا، وہ اکیلی عورت ہے..... سب کچھ کیسے تیار کرے گی۔

وہ بولے۔

اس کی آپ فکر نہ کریں..... مہک بھی آئی ہوئی ہے، مل کے بلکہ

میں جاؤں ..... پاپا کے لیے لانا ہے ..... آپ کو جب بھی ضرورت  
آپ کو بنا دیا کروں گا۔

وہ بڑی محبت اور خلوص سے بولا اور واپس زینہ چڑھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ واپس پلٹ آیا۔  
لیجئے پاپا۔

عجلت میں وہ روٹی کو نہ دیکھ سکا۔

بیدار بخت پیالی کو پکڑ کر مسکرائے۔

اپنی ممی کے لیے بھی لاؤ۔

اوساری ماما ..... ابھی لایا۔

وہ بولا۔

نہیں نہیں ..... مجھے ضرورت نہیں ہے ، آپ پیئیں۔

روٹی نے لاپرواہی سے انکار کر دیا۔

وہ روٹی کو دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

بست اچھا قنوا ہے ..... طبیعت کی ساری تھکن دور ہو جائے گی۔  
تو اچھا تھا۔

وہ خاقان کے جاتے ہی بولے۔

آپ پیجئے اور تھکن بھی آپ دور کیجئے۔

وہ صوفے پر پہلو بدل کر بولی۔

آج موڈ اس قدر کیوں خراب ہے ..... رہی خاقان کی بات تو  
بے ضرر بچہ ہے ..... اس سے تمہیں تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

بیدار بخت خالی کپ قریبی میز پر رکھ کر بولے۔

یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں ..... تکلیف تو پہنچ چکی۔

روٹی نے آگے ہو کر اپنی بات کی اہمیت کو واضح کیا۔

کیسی تکلیف ..... خاقان .....

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

کیا کہا۔

مہک پیالی پکڑ کر باہر آئی۔

واپسی پہ بتاؤں گا۔

وہ پیالی پکڑ کے جلدی جلدی زینہ اتر گیا۔

وہ بیگم نور الدین کے پاس سے گزرا۔

آداب دادو ماں۔

وہ مودب بولا۔

یہ کیا ہے۔

جواب یا دعا دینے کی بجائے وہ پوچھنے لگیں۔

سواتی قنوا ہے ..... پیئیں گی آپ۔

وہ قریب آیا۔

نہیں رہنے دو۔

وہ کپ کو دیکھتی رہیں۔

آپ پی لیں ..... سچ دادو ماں غضب کا ہے ..... آپ پی کے تو

دیکھیں۔

وہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی آرائشی کرسی کو اٹھا کر بیگم نور الدین

کے پاس لایا۔

بیٹھے ..... یہ لیں۔

کس کے لیے لے جا رہے تھے۔

انہوں نے استفسار کیا۔

پاپا کے لیے ..... میں ان کے لیے اور لے آؤں گا۔

بیگم نور الدین نے چسکی لی ، واقعی یوں محسوس ہوا جیسے جسم میں

ایک نئی لہر دوڑ گئی ہو۔

واقعی بہت اچھا ہے۔

وہ بڑی رغبت سے پینے لگیں۔

یہ وقت ماضی کو بے نقاب کرنے کا نہیں ہے..... اگلی بات سوچو۔  
بیدار کو روٹی کی باتیں اچھی نہ لگیں لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ  
دے۔ روٹی کھڑی ہو گئی۔

ہم پہلے سے بھی زیادہ الجھنوں میں گرفتار ہو چکے ہیں..... ہمارا  
تجربہ جیسا بھی تھا گزر گیا..... اب ہمیں اولاد کے لیے کرنا ہے جو بھی کچھ کرنا

وہ پلٹ کر بولی۔

بخٹاور کے لیے اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... میں  
کو سمجھا لوں گا۔

وہ بڑے وثوق سے بولے۔

ٹھیک ہے۔

وہ باہر نکل گئی۔

لیکن بیدار مستقل سوچوں میں گھر چکے تھے۔ واقعی بخٹاور ان کا بیٹا  
انہوں نے کسی کی ایک نہ مانی اور سوہنی سے شادی کر کے چھوڑی.....  
سوہنی تو جان لٹاتی تھی..... محبت کرتی تھی مجھ سے..... اور مکہ کب  
ہے..... وہ بخٹاور کو پسند نہیں کرتی..... بخٹاور ہی اسے چاہتا ہے۔  
بہ چاہت انجام تک پہنچ سکتی ہے..... یک طرفہ نہیں..... وہ خاقان کو  
رتی ہے۔

وہ سوچوں کے اثناء سمندر میں اتر گئے۔

پاپا..... پاپا جانی..... کھانا تیار ہے۔

خاقان بڑی محبت سے بولا۔

آگئے..... وہ ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔

دیکھو بیٹے..... اپنی دادو ماں کو اور اپنی ممی کو انوائٹ کرو۔

پاپا..... میں تو آپ سے پہلے انہیں کہہ کے آیا ہوں..... انکار کر

بخٹاور گھر پہ نہیں ہے..... البتہ زہیرہ مان گئی اسے مکہ اپنے ساتھ اوپر

جی ہاں..... خاقان نے بخٹاور کا حق غصب کیا ہے..... مکہ پر  
بخٹاور کا حق تھا..... مکہ بخٹاور کی طرف منہ ہی نہیں کرتی۔

روٹی سچ پا ہو گئی۔

تمہارا وہم ہے روٹی بیگم..... مکہ شروع سے ہی خاقان میں دلچسپی  
لیتی تھی۔

بیدار نے کہا۔

میں کیسے مان لوں..... بے تکلف تو وہ ہے ہی..... دلچسپی کی بات  
میری سمجھ میں نہیں آئی۔

روٹی نے کہا۔

بے تکلفی اور دلچسپی میں بڑا فرق ہے..... ہم نے بھی جوانی گزاری  
ہے۔ عشوے غمزے تو ہم جانتے ہی ہیں۔

بیدار بہت لے میں بول رہے تھے۔

بالکل..... کیوں نہیں..... آپ کو خاصہ تجربہ ہے۔

روٹی نے چوٹ کی۔

بیدار ہنس دیے۔

خیر چھوڑو..... ہمیں اپنے بچوں کی پسند نا پسند کا خیال رکھنا ہے۔

بیدار بولے۔

بخٹاور تو ہر ممکن مکہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

روٹی بے بس ہو چکی تھی۔ بخٹاور کی خواہش کو پورا کرنا اس کی

مجبوری تھا۔

میں بخٹاور کو سمجھا لوں گا۔

بیدار بولے۔

بالکل نہیں سمجھے گا..... وہ آپ کا بیٹا ہے..... آپ سمجھے تھے۔ کتنا

منع کیا تھا آئی نے..... لیکن اس جھگ والی کی جان نہیں چھوڑی آپ نے

..... کس کس مصیبتوں سے پالا پڑا نور محل کو۔

دہی پھلکیاں اور سویوں کی کھیر آیا ماں نے تیار کی ہے۔

ارے آیا ماں کہاں ہے۔

وہ ایک دم سے اٹھا۔

آیا ماں.....

وہ باہر جا کر زور سے پکارا۔

میں کچن میں ہوں بیٹا۔

وہ اندر سے بولی۔

اماں..... کھانا نہیں کھائیں گی..... سب وہاں آپ کو دیکھ رہے

ہیں۔

خاقان اندر داخل ہو کر بولا۔

یہیں کھالوں گی بیٹا..... صاحب جی بیٹھے ہیں۔

ہمارے بغیر ہی..... چلے..... پیپا تو خود آپ کو بلا رہے ہیں۔

خاقان نے بازو پکڑ کر آیا کو اٹھایا۔

بیٹا، سب کے ساتھ کچھ اچھا نہیں لگتا..... میں پھر بھی.....

وہ کچھ شرم محسوس کر رہی تھی۔

یہ کیسے سوچ لیا آپ نے کہ آپ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتیں۔ میرا اٹھنا بیٹھنا آپ کے ساتھ ہے آپ کی گود میں بیس سال پرورش پائی ہے میں نے۔ آپ نے سارے زمانے کی محبتیں نچھاور کی ہیں، تو کیا آپ ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتیں..... اٹھئے..... میں ہرگز آپ کو یہاں نہیں بیٹھنے دوں گا۔

وہ بے حد اصرار کے بعد آیا کو ڈانگ ہال میں لے گیا۔

آئیے آئیے۔

خاقان نے اپنے ساتھ والی کرسی پر آیا کو بٹھالیا۔

جب میں خاقان جیسی قیمتی شے آپ کو سوئپ سکتا ہوں تو آپ کو

اس کے گھر پر پورا پورا اختیار ہے۔

لے گئی۔

ماما نے بھی انکار کر دیا۔

بیدار بولے۔

ہاں پیپا..... دادو ماں اور می نے ایک ساتھ انکار کیا۔ میں ہنس

چلا آیا۔

وہ سادگی سے مسکرا دیا۔

ٹھیک ہے..... آؤ چلیں۔

وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اوپر والا زینہ چڑھ گئے۔

آئیے انکل..... کھانا تیار ہے۔

مہک نے باہر نکل کر کہا۔

ارے واہ ہمارا بیٹا زنیہ بھی ہے۔

وہ ڈانگ ہال میں زنیہ کے سر پر دست شفقت رکھ کر بولے۔

جی پیپا..... خاقان اور مہک لے آئے۔

وہ مسکرا دی اور پلیٹیں رکھنے لگی۔

بڑی مسرت ہوئی بیٹے..... خاقان تمہارا بڑا بھائی ہے، اس کا احترا

کیا کرو۔

وہ پر مسرت انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔

زنیہ بیدار بخت کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی..... مہک اور خاقا

ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔

شروع کیجئے انکل۔

مہک نے کہا۔

بیدار بخت نے بھرے ہوئے میز کو دیکھا جس پر انواع و اقسام

خوبصورت کھانے برتنوں میں رکھے ہوئے تھے۔

بھئی واہ غضب کی چیزیں بنائی ہیں ہماری مہک بیٹی نے۔

واقعی آج مہک اور زنیہ نے بہت کام کیا لیکن اس میں یہ کہا۔

ساری سے کام نہیں چلے گا..... کھانے کے بعد میرے کمرے میں  
آتا۔

وہ آخری لقمہ حلق سے اتار کر بولے۔

-Yes Papa

بختاور نے کہا اور بڑی رغبت سے کھانے لگا۔

یہ بھی لو..... آج بہت کباب بنائے ہیں، جی بھر کے کھاؤ۔

خاقان نے کبابوں کی ڈش بختاور کے سامنے رکھ دی۔

سب خاموش کھاتے رہے۔

بختاور نے ایک نظر دیکھا..... مہک اور خاقان ایک ہی پلیٹ میں کھا  
رہے تھے۔ مہک نے کہا۔

چاول ڈالوں اور.....

ہاں ہاں کیوں نہیں..... کبابوں کے ساتھ بڑے مزے کے لگ  
رہے ہیں۔

خاقان نے کہا۔

مہک نے چاول پلیٹ میں ڈالے۔

خاقان نے آیا ماں کی طرف دیکھا۔

اماں چاول اور لیس گی آپ۔

وہ ڈش رکھ کر بولا۔

نہیں بیٹا..... بس۔

آیا نے کہا اور نوالہ نگل کر رومال سے چہرہ بڑی احتیاط سے صاف  
کیا۔

مہک جلدی کر لو..... کھانے کے بعد قہوا بنانا ہے پیپا کے لیے۔

بس میں جا رہی ہوں..... سب کے لیے بناؤں گی۔

وہ انھی تو زنیہ بھی اس کے ساتھ چل دی۔

بختاور کھا رہا تھا۔

آپ کی مہربانی ہے صاحب جی..... ورنہ میں کناں اور آپ کہاں۔

وہ احسانوں کے بوجھ تلے دبتی جا رہی تھی۔

ہم آپ کے ممنون ہیں..... جس اچھے انداز میں آپ نے خاقان کی

ترہیت کی ہے میں اگر کوئی ٹیوٹر بھی رکھتا تو شاید ممکن نہ تھا۔

وہ خود احسان مند نظر آ رہے تھے۔

یہ میرا کمال نہیں ہے صاحب جی..... خاقان کی رگوں میں بلند نسبی

اور اعلیٰ اچھے خون کی آمیزش ہے..... جس کا باپ اس قدر اچھا ہو اس کا بیٹا

کیوں نہ اچھا ہو گا۔

-Good Good

خاقان اور مہک بلکہ زنیہ بھی اس بات سے بہت خوش ہوئے اور

تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

سب نے مل کر خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

زنیہ نے محسوس کیا کہ پیپا اس جگہ آکر زیادہ خوشی محسوس کرتے

ہیں۔ کیونکہ یہاں پیپا کی ذہنی اٹن شین ختم ہو جاتی ہے۔

سب پر مسرت انداز میں کھانا کھا رہے تھے۔

جھگی والے.....

اچانک بختاور کی آواز آئی۔

بیدار بخت نے سنا۔ انہیں زبردست تکلیف پہنچی۔

آ جاؤ یا ر اندر..... ابھی کھانا موجود ہے۔

خاقان کو جیسے کوئی احساس ہی نہ ہوا ہو۔

زنیہ اور مہک نے آیا کی طرف دیکھا۔ آیا خاموش نوالہ چبا رہی

تھی۔ بختاور اندر داخل ہوا۔

بیدار بخت نے اسے معنی خیز انداز میں گھورا۔

ساری پیپا۔

وہ کھیانہ سا ہو کر دہی پھلکیوں کے ڈونگھے کی طرف لپکا۔



خانساں جلا ہوا بولا۔  
 اوپر ..... بیدار اور بختاور بھی۔  
 روپی ایک دم سے بولی۔  
 جی ہاں ..... گاڑی سے اترتے ہی چھوٹے سرکار سیدھے اوپر چلے  
 گئے۔

خانساں نے کوشش کی کہ آگ لگ جائے لیکن روپی اور بیگم  
 نور الدین بچوں کا رجحان دیکھ رہی تھیں اس لیے ہوش رہیں۔  
 بیگم نور الدین نے ایک ڈونگھے پر سے ڈھکنا اٹھایا۔  
 یہ کیا ..... ڈونگھے میں اوپر پانی اور نیچے دی تھا۔  
 دی پھلیاں جی۔  
 خانساں لرز گیا۔

یہ دی پھلیاں ہیں ..... دی میں گرم گرم پھلیاں ڈال دیں۔ تو  
 صرف آلو گوشت پکا سکتا ہے۔  
 بیگم نور الدین نے ڈونگھے پر ڈھکنا بند کر دیا۔  
 خانساں رخصت ہو گیا۔  
 ٹھہریے آنٹی ..... کسی کو ہاتھ مت لگائے گا ..... ہم آپ کے لیے  
 بھی کھانا لائے ہیں۔

سب سے آگے مہک، خاقان، زہیرہ اور بعد میں بختاور۔  
 ایک ایک ٹرے سب کے ہاتھوں میں تھی۔  
 مہک نے کھانا باری باری سامنے چن دیا اور خانساں کا کھانا ایک  
 طرف کر دیا۔

بیٹی کیوں تکلف کیا تم نے۔  
 روپی مسکرا کر مہک سے بولی۔  
 تکلف کیا آنٹی ..... بے شک آپ نے انکار کر دیا تھا لیکن ہم نے  
 فراموش نہیں کیا۔ لیجئے نوش فرمائیے۔

بیدار بخت دیکھ رہے تھے کہ بختاور بڑے مزے سے کھا رہا ہے اور  
 اس نے ہر چیز کو چکھا تھا۔  
 سچ پایا ..... یہ آیا ماں کھانا بڑا اچھا بناتی ہے۔ گاڑی سے اترتے ہی  
 میں خوشبو سے پاگل ہو گیا۔ سیدھا زینہ چڑھا اور اوپر آ گیا۔ وہ بڑا خوش نظر  
 آ رہا تھا۔

خاقان تو می اور دادو ماں کو بھی کہہ آیا تھا۔  
 بیدار بخت نے کہا۔  
 میں تو نہیں رہ سکا۔  
 وہ آیا کی طرف دیکھ کر بولا۔  
 سو مرتبہ کھاؤ بیٹا ..... یہ تمہارا اپنے بھائی اور باپ کا گھر ہے .....  
 تمہارا حق ہے یہاں۔

آیا کھڑے ہو کے بختاور کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔  
 Thank You آیا ماں۔  
 وہ ہنس دیا اور نیپکن سے ہونٹ صاف کرنے لگا۔  
 کھانا ختم ہوا ..... سب اٹھ کر باہر کی کھلی فضا میں آ گئے۔ مہک نے  
 سب کو خوبصورت پیالیوں میں قنوا پیش کیا۔

ادھر خانساں نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ روپی اور بیگم  
 نور الدین دونوں بیٹھ گئیں۔

بیدار اور نیچے کہاں ہیں۔  
 بیگم نور الدین نے خانساں سے دریافت کیا۔  
 اوپر چلے گئے ہیں کھانے کے لیے۔

کیوں بیٹا..... تمہاری مٹی نے کھایا کھانا۔

بیدار بخت ہنس کر بولے۔

کیوں نہیں پایا، دادو ماں تو شاید خانساں کو ڈانٹ بھی رہی تھیں۔

خاقان ہنس کر بولا۔

بڑی گماگمی میں کھانا ختم ہوا پھر قہوے کا دور چلا۔ شب کے نو بج چکے تھے۔ بیدار بخت کا جی تو نہ چا رہا تھا..... نہ جانے اوپر والے پورشن کا ماحول اس قدر پرسکون کیوں لگتا تھا۔ وہ اٹھے۔

بیٹھے ناپایا۔

خاقان نے کہا۔

نہیں بیٹا..... اب جانے دو..... صبح آفس بھی جانا ہے۔

وہ زینہ اتر گئے۔

زینہ مک کی طرف پلٹی۔

آجاؤ میرے کمرے میں۔

زینہ نے کہا۔

یہیں سو جاؤ دونوں..... وہ باہر والا کمرہ بہت پرسکون ہے۔

خاقان نے کہا۔

خاقان بیٹا۔

آیا نے دوسرے کمرے سے آواز دی۔

جی اماں۔

وہ لپک کر پہنچ گیا۔

مک کو زینہ کے ساتھ اس کے کمرے میں سو جانے دو بیٹا۔

آیا نے سرگوشی کی۔

کیوں ماں..... یہاں کیا ہے۔

خاقان نے کہا۔

تو اس قدر شفاف ہے لیکن دنیا ایسی نہیں ہے میرے بچے..... بس

خاقان زینہ اور بختاور ہنسنے لگے۔

روٹی اور بیگم نور الدین اتنے اچھے کھانے دیکھ کر انکار نہ کر سکیں

اور کھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

دادو ماں آپ آرام اور سکون سے کھائیے بعد میں قہوہ بھی پینے گا۔

خاقان نے کہا۔

چاروں باہر آ گئے۔

مک تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی۔

خاقان ایک دم چونکا۔

نہیں..... میں آج رات زینہ کے ساتھ رہوں گی۔

اچھا..... مٹی سے پوچھا۔

خاقان خوش ہو کر بولا۔

مٹی گھر میں نہیں ہیں..... پایا نے اجازت دے دی۔

مک ہنس دی۔

بہت اچھے ہیں تمہارے پایا۔

خاقان نے اس کے ساتھ چلتے چلتے کہا۔

واقعی جب مٹی کوئی بات نہیں مانتی تو پایا سے کہہ کر منوا لیتی

ہوں۔

وہ بڑے فخر سے بولی۔

بہت اچھی بات ہے..... جھگی والے کی سفارش کر دینا۔

وہ بڑی معصوم سی صورت بنا کر بولا۔

خاقان..... خبردار جو آئندہ تم نے ایسی بات کی..... میں تو احسان

مند ہوں اس عورت کی جس نے تمہیں پیدا کیا..... خاقان تم اتنے اچھے ہونا

کہ بس..... تم میں کوئی بری بات نظر ہی نہیں آتی۔

مک نے خاقان کے ہاتھ کو دبایا۔

دونوں اوپر چلے گئے۔

تو مہک کو زہیرہ کے پاس سونے دے۔  
ٹھیک ہے ..... جیسے آپ کی مرضی۔  
وہ بخوشی راضی ہو گیا۔

زہیرہ .....

خاقان نے زہیرہ سے کہا۔

زہیرہ نے چہرہ اٹھایا۔

تم مہک کو نیچے لے جاؤ اپنے کمرے میں، مہک وہیں سو جائے گی۔

خاقان نے کہا۔

ٹھیک ہے۔

زہیرہ خوش ہو گئی۔

صبح جلدی اٹھنا۔

وہ مہک کو دیکھ کر بولا۔

کتنے بجے آؤں۔

مہک جانتی تھی خاقان کو ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارہ نہیں ہے۔

صبح پانچ بجے لان میں ملاقات ہو گی۔

خاقان نے کہا۔

ٹھیک ہے ..... زہیرہ اٹھ جانا۔

مہک نے کہا۔

ہاں تو اور کیا ..... نماز نہ پڑھوں تو دادو ماں سے جھڑکیاں کون

کھائے گا۔

اچھا بابائے۔

زہیرہ اور مہک ہاتھ ہلاتی ہوئی زینہ اتر گئیں اور وہ اپنے کمرے کی

طرف چل دیا۔

(30)

ساون کی پہلی بارش ہونے کا امکان تھا، چھوٹی چھوٹی آوارہ بدلیاں  
جھوم جھوم کر تیز ہوا سے اٹھیلیاں کرتیں اور آفتاب کے سفید دھتے گولے  
کو ڈھانپ لیتیں۔ اس طرح کائنات پر سرمئی رنگ کا غلاف سا چڑھ جاتا۔  
کچھ دیر کائنات ملفوف سی رہتی پھر بدلیاں شوخ ہو جاتیں تو آفتاب سب کچھ  
منور کر دیتا۔ وہ اپنے راشننگ روم میں بیٹھے کچھ آفس ورک کرنے میں  
مصروف تھے۔ کچھ خیال آتے ہی فون پر انگلی رکھ کر ریسور کان کو لگایا۔  
بخاور بیٹا ..... آ جاؤ تم سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔

Yes Papa ..... ابھی آ رہا ہوں۔

بخاور اپنے کمرے سے نکلا اور ان کے پاس پہنچ گیا۔

آ سکتا ہوں بابا۔

وہ دروازے کے پاس کھڑے کھڑے بولا۔

آؤ۔

وہ بخاور کو دیکھ کر کاغذات درست کرنے لگے۔

بیٹھو۔

وہ کرسی کا رخ پلٹ کر سامنے صوفے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے

ہوئے بولے۔

کیا کر رہے تھے۔

وہ بولے۔

جھگی والی کی کوکھ سے جنم لیا ہے جس کو بار بار طعنہ زنی کے لیے جھگی والا کہا جاتا ہے۔

بیدار بخت نے بیٹے کو دیکھا۔

بخاور سر جھکائے باپ کی باتیں سن رہا تھا۔

-I am sorry Papa

بخاور کو احساس ہو چکا تھا کہ اس کے باپ کو اس سے تکلیف پہنچی

ہے۔

صرف تم نہیں ..... میں روپی کو بلکہ اس گھر کے پرانے ملازمین کو بھی جھگی والا کہتے سنا ہے ..... اس میں خاقان کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔

بیدار بخت بولے۔

بخاور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ عورت بڑی اچھی تھی جس کو جھگی والا کہتے ہو ..... وہ واقعی جھگی والی تھی لیکن انتہائی محبت کرنے والی عورت تھی۔

پاپا ..... واقعی وہ ایک عظیم عورت ہو گی ..... خاقان کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور شستہ انداز اس بات کا غماز ہے کہ وہ عورت انتہائی اچھی اور نیک تھی۔

بخاور مان گیا کہ خاقان نے ایک اچھی عورت سے جنم لیا ہے۔

لیکن میں نے اس عورت کی قدر نہ کی ..... اس کو تحفظ نہ دے

سکا۔

وہ پچھتاوے کی آگ میں جل رہے تھے۔

آپ نے ایسا کیوں کیا ..... آپ با اختیار تھے پھر بھی آپ حفاظت نہ

کر سکے۔

بخاور نے بیدار بخت کے چہرے کو بغور دیکھا جس پر ماضی بچھتاوہ

بن کر جھلک رہا تھا۔

میں با اختیار تھا لیکن جرات نہ تھی ..... ان دنوں ماما اور ڈیڈی

کچھ بھی نہیں ..... میچ دیکھ رہا تھا ..... آپ نے بلایا تو چلا آیا۔

بخاور نے گھنے بالوں کو درست کیا۔

آپ نے کیوں بلایا ہے۔

وہ پھر بولا۔

ہاں ..... تم سے ایک ریکویسٹ ہے۔

وہ نرمی سے بولے۔

پاپا ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

وہ شرمسار سا ہو گیا۔

ایک لمحہ میں گزشتہ گھورتی ہوئی دو آنکھیں اس کو نظر آ گئیں۔ وہ

سب سمجھ گیا۔ کہ اس کے باپ نے کیوں آج راشنگ روم میں بلایا ہے۔

ہاں بیٹے ..... میں نوجوان اولاد پر اپنی مرضی تھوپنے اور بے وجہ

سرزنش کرنا پسند نہیں کرتا ..... تم سمجھ دار ہو اپنا اچھا برا سمجھ سکتے ہو۔

بیدار چند سیکنڈ بخاور کو گھورتے رہے۔

ہم سے کوئی خطا ہوئی ہے۔

بخاور نے کہا۔

نہیں بیٹے ..... خطا نہیں ..... ہم سے کچھ کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں

جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں۔

وہ افسردہ ہو چکے تھے۔

پاپا۔

وہ چونک کر بولا۔

تم جانتے ہو کہ خاقان کس کا بیٹا ہے۔

بیدار خود بخاور کے منہ سے اگوانا چاہتے تھے۔

خاقان میرا بھائی ہے میرا بڑا بھائی۔

بخاور بولا۔

لیکن اس نے تمہاری ماں کی کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ اس نے ایک

بختاور نے باپ کے ٹھنڈے ہاتھوں کو تھام لیا۔  
ہاں میری جان ..... وہ میری ماں ہے ..... ان کے تقدس کو میں کبھی  
پامال نہیں کروں گا..... میری ہمیشہ سے ہی یہی کوشش رہی ہے کہ والدین  
کی حرمت برقرار رہے چاہے میں اب تک ضمیر کی غلش میں روز جیتا روز  
مرتا رہوں۔ یہ بار بار جینا اور مرنا کتنا اذیت ناک ہے۔  
وہ کرسی پر ٹیک لگا کر آنکھیں موند کر بیٹھے رہے۔

پاپا ..... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی  
تکلیف نہیں پہنچے گی۔

Thank You Son خاقان کو اپنا بھائی سمجھو ..... وہ تیرے باپ  
کے خون سے پیدا ہوا ہے اور تیرا خون ہے ..... تیرا بازو ہے ..... تیرے دکھ  
درد کا شریک ہے۔

بیدار بخت اٹھے اور انہوں نے بختاور کی پیشانی کو چوم لیا۔  
اجازت ہے۔

ہاں جاؤ۔  
وہ بولے۔

بختاور ان کے حکم ملتے ہی کمرے سے باہر آگیا۔  
یوں احساس ہو رہا تھا جیسے بختاور نے کوئی نئی دنیا میں قدم رکھ لیا  
ہو۔ باپ نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے قلب و جگر کو کس  
قدر صاف و شفاف پایا۔ وہ کمرے سے نکلتے ہی تیزی سے زینہ چڑھ گیا۔

خاقان ..... خاقان بھائی۔

وہ زینہ چڑھتے ہی زور سے چلایا۔  
ہیں ..... آیا ماں ..... یہ بختاور کو کیا ہو گیا ہے ..... پاگل تو نہیں ہو

گیا۔

کیا ہو گیا۔

وہ کرسی پر سیدھی ہو کر بولی۔

اس قدر دبدبہ اور جلال تھا کہ میں اپنی مرضی پر اختیار ہی نہ رکھتا تھا لیکن  
اس غیر ذمہ داری کی وجہ یہ تھی کہ میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔  
وہ چند لمحے خاموش ہو گئے۔

پھر.....

بختاور ہمہ تن گوش تھا۔

پھر کیا ہوا ..... میرے آتے ہی پتہ چلا کہ وہ خاقان کے پیدا ہوتے  
ہی موت کی وادی میں اتر گئی ہے۔

وہ خاموش ہو گئے۔ حزن و ملال کے گہرے سائے ان کے چہرے پر  
اُمڈ آئے تھے۔ بختاور کو افسوس ہو رہا تھا ..... ایسا عظیم باپ میرے اس الفاظ  
پر کتنا دکھی ہوتا ہو گا جس نے سب کچھ سن کر بھی میری سرزنش نہیں کی۔  
پاپا ..... مجھے معاف کر دیں ..... میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچا  
آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔

وہ دو زانو قالین پر بیٹھ گیا۔

بیٹا ..... میں بھی اپنی مرضی تم لوگوں پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ تمہیں  
اختیار ہے کہ جہاں چاہو ..... اپنی مرضی سے مجھے آگاہ کر سکتے ہو کیونکہ زندگی  
بسر تم لوگوں نے کرنی ہے ..... میں دیکھ چکا ہوں کہ والدین کی اجارہ داری  
اولاد کو کس قدر برباد کرتی ہے۔

وہ خاموش ہو گئے۔

بختاور دیکھتا رہا۔

وہ پھر گویا ہوئے۔

میں دیکھتا ہوں ماما کیوں خاموش رہتی ہیں ..... اپنے کمرے میں یا  
شام کو لان میں ..... اس کی یہی وجہ ہے گزرے وقت کے پچھتاوے ان کو  
چین نہیں لینے دیتے۔

لیکن پاپا جانی ..... دادو! ماں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ  
خاقان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں۔

آج اس نے جھگی والا نہیں کہا..... اس نے کبھی میرا نام نہیں لیا۔  
خاقان کھڑا ہو گیا اور بالکونی سے واپس پلٹ کر زینے کے پاس آگیا  
جہاں بختاور کھڑا تھا۔

میرے بھائی..... میرے بڑے بھائی..... یار معاف کر دو۔ میں بڑی  
دیر تمہیں ذہنی اذیت دیتا رہا ہوں۔

خاقان کو کچھ بھی سمجھ نہ آیا۔ بس وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا۔  
لیکن اس وقت اس کا سکتہ ٹوٹا جب بختاور نے بیتاب انداز میں خاقان کو گلے  
لگا لیا۔

خاقان ہنستا ہوا بختاور کو اپنے بازو کے حصار میں لے کر ماں کے پاس  
ہی لے آیا۔

آیا ماں..... سنا کچھ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

خاان نے آیا ماں کے پاس جا کر کہا۔

آیا ماں..... آپ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ خاقان کو جھگی والا نہ کہا کرو  
اس کا باپ بہت بڑا ہے..... بڑا عظیم ہے اس کا باپ..... اب میں جان گیا  
ہوں کہ اس کی ماں بھی بہت عظیم تھی جس نے ایسا سپوت پیدا کیا۔

خاقان نے قہقہہ لگایا اور ایک مرتبہ پھر دونوں بھائی بغلگیر ہو گئے۔

آیا نے روشن آنکھوں سے دیکھا جیسے آج وہ خود سرخرو ہو گئی ہو۔

چلو اچھا ہوا..... آج تمہیں بھی میری ماں کی عظمت کا یقین آگیا۔

خاقان نے کہا اور دونوں ہنستے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

اماں چائے بن سکتی ہے..... آج بھائی ملنے کی خوشی میں۔

خاقان نے منت بھرے انداز میں کہا۔

واری جاؤں میرے چاند..... دس مرتبہ بناؤں چائے تیری خوشی  
میرے لیے بڑی افضل ہے۔

آیا انہی۔

خاقان اور بختاور دونوں آیا کو چاہت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔

یار تیرے مقدر بڑے اچھے ہیں۔  
بختاور نے جاتی ہوئی آیا کو دیکھ کر کہا۔  
وہ کیوں۔

خاقان نے ٹیک لگالی۔

کیا ہوا جو تیری ماں نے جنم دے کر موت کو گلے لگا لیا۔ ساری ماما  
تو تجھے آیا ماں سے مل جاتی ہے..... اور ایک ہماری ماما۔  
بختاور کو رشک آنے لگا۔

اسی لیے تو مجھے ماں کبھی یاد نہیں آئی..... نہ جانے دل یہی کہتا ہے  
ابس تیری یہی ماں ہے..... خاقان تو اسی کا بیٹا ہے..... جب آیا ماں کی گود  
میں سر رکھتا ہوں تو جنت کے سارے دروازے کھل جاتے ہیں۔

خاقان بڑی چاہت سے بولا۔

ہماری ممی ہمیں سینے سے کیوں نہیں لگاتیں..... آخر وہ بھی تو ماں  
ہے۔

بختاور کو حیرت ہوئی۔

تیری ممی نے اپنی زندگی کا تین گنا حصہ امریکہ میں گزارا ہے۔ شکر  
کر ساری زندگی نہیں گزاری ورنہ تجھے بیٹا کہہ کر بھی نہ پکارتی۔  
خاقان ہنس دیا۔

شاید یہی وجہ ہے..... میں پیپا اور دادو ماں میں بھی ایسی ہی پر تکلف  
بات دیکھتا ہوں..... یار ماں بیٹے کی محبت میں تکلف کی دیوار نہیں ہونی  
چاہئے۔

بختاور جھنجھلا گیا۔

ماں آخر ماں ہے..... ممی تمہاری ماں ہے..... تم ان سے محبت کرو  
ممکن ہے انہیں بھی تم پر پیار آنے لگے۔

خاقان نے قیافہ لگایا۔

بختاور نے پلٹ کر دیکھا آیا ٹرائی میں چائے لے آئی تھی۔

خاقان ایک دم سے اٹھا اور آیا کے ہاتھوں سے ٹرائی کا ہینڈل پکڑ لیا۔

آپ بیٹھیں، میں لے آتا ہوں۔  
آیا ہاتھ پونچھتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔  
بخاور سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

کتنا خوش قسمت ہے خاقان ..... ماں کے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے اور وہ بھی محبت اور شفقت کے ساتھ۔

لو بھی چائے پیو۔

خوبصورت ساکپ بنا کر خاقان نے بخاور کو دیا اور دوسرا کپ آیا کو اور تیسرا خود لیا۔

بیٹا ..... یہ چیزیں کس لیے ہیں، کھاؤ۔

آیا نے بسکٹ اور مٹھائی کی طرف توجہ دلائی۔

Thank You آیا ماں۔

بخاور نے اپنی پسند کی مٹھائی اٹھائی اور بڑی رغبت سے کھانے لگا۔  
ارے تم لوگ یہاں بیٹھے ہو ..... کہاں کہاں تلاش نہیں کیا میں

نے۔

زنیرہ اوپر آتے ہی ہنستے ہوئے بولی۔

آؤ آؤ ..... زنیرہ چائے پیو ..... یہ دیکھو تمہاری پسند کے بسکٹ۔

خاقان نے خوش آمدید کہا اور پلیٹ آگے رکھ دی اور بخاور ہنس

دیا۔

اگر کبھی بخاور نہ ملے تو یہاں آ جایا کرو۔

بخاور ہنس کر گویا ہوا اور زنیرہ بسکٹ اٹھا کر کھانے لگی۔

(31)

کرسی پر بیٹھا وہ بری طرح چونک گیا اور کسی کے نرم و نازک ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

خاقان نے بڑے اطمینان سے ہاتھوں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے ہنس دیا۔ تمہاری خوشبو تو چاروں جانب پھیل جاتی ہے مک صاحبہ ادھر بیٹھو۔

خاقان نے ہنستی ہوئی مک کے ہاتھوں کو تھام کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

تم نے فون کیوں نہیں کیا۔

مک نے ادائے دلربائی سے کہا۔

کیسے فون کرتا ..... تمہاری می سے ڈرتا ہوں۔

خاقان مسکرا کر بولا۔

خواجواہ ڈرتے ہو تم ..... می پہلے جیسی نہیں ہیں۔

مک نے اس کو یقین دلانا چاہا۔

اچھا ان کی ہیئت بدل گئی ہے۔

وہ مذاق سے بولا۔

اوہو ..... بھی اب می کی ساری غلط فہمی دور ہو چکی ہے۔ تمہیں

معلوم ہے ڈیڈی کا ووٹ میری طرف ہے۔

مک نے خاقان کے بالوں کو بری طرح الجھا دیا۔

زور سے کاٹی گئی ..... اوہو Sorry-

وہ ہنس دیا۔

اپنے ہاتھوں سے گلا کاٹ دو سی نہ کروں گا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔

خاقان تم کیا جانو ..... میری رگوں میں تو سرایت ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میں نہیں تو ہی تو ہے ..... اس کا اظہار میں نے ڈیڑی سے بھی کر دیا ہے۔

وہ بے دھڑک بولی۔

پھر.....

خاقان نے کہا۔

پھر کیا ..... ڈیڑی کمانا میری طرف ہیں ..... ویسے ان کو تم پہلی مرتبہ ہی اچھے لگنے لگے تھے۔

مہک نے بے پناہ محبت سے خاقان کے نرم اور معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کا مطلب ہے جھگی والے کو پسند کر لیا گیا ہے۔

خاقان کے اندر لڈو پھوٹنے لگے اور وہ ایک دم مہک کے ہاتھوں پر اتھ رکھ کر بولا۔

ہائے اللہ خاقان ..... اپنے آپ کو ایسا مت کہا کرو۔ مجھے تکلیف دیتی ہے۔

Yes Boss

وہ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سیلوٹ مار کر بولا۔

اب تم ایسے کرو انکل کو بھیجو ..... یہ معاملہ رفع دفع ہونا چاہئے۔ کیسے بات کروں مہک ..... یقین کرنا مہک ..... میں تمہاری خاطر مر لٹا ہوں ..... زہر پی سکتا ہوں ..... برباد ہو سکتا ہوں ..... مجنوں بن سکتا ہوں .....

بس یہ گندی عادت نہ گئی تمہاری۔

وہ بال درست کرنے لگا۔

تمہارے الجھے ہوئے بال اچھے لگتے ہیں ..... بس یوں ہی رہا کرو۔

وہ پھر خاقان کے ہاتھوں کو پکڑنے لگی۔

پاگل ہو ..... ایک تو میں پہلے ہی تمہارا دیوانہ ہوں اوپر سے اور بنا

دو۔

خاقان.....

وہ کیس کھوئی کھوئی سی بولی۔

کیا ہے۔

خاقان نے کہا۔

میں تو چاہتی ہوں اب تم شادی کر ہی ڈالو۔

کس سے۔

خاقان نے چونک کر کہا۔

مہک سے ..... اور کس سے۔

وہ ہنس دی۔

شرم تو نہیں آتی ..... اپنی شادی کی خود بات کر رہی ہو، وہ بھی

نوجوان لڑکے کے سامنے ..... بلاؤں آیا ماں کو ..... آیا .....

وہ جھکا۔

کیا بکواس ہے ..... خاقان کبھی تو سنجیدہ ہوا کرو۔

خاقان کے ہونٹوں پر مہک نے ہاتھ رکھ دیا۔

آئی بیٹا۔

کچن سے آیا کی آواز آئی۔

آیا ماں کچھ نہیں ..... اس کی تو عادت ہے بکواس کرنے کی۔

مہک نے خاقان کی حسب عادت زور سے چٹکی کاٹی۔ وہ سسک کر

رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مہک نے بڑے پیار سے اس کا بازو سہلایا۔



ہو چکا ہے۔  
 کیا..... واقعی..... سچ۔  
 مہک خوشی سے اچھلی۔  
 اس نے جان لیا ہے کہ محبت یک طرفہ کامیاب نہیں رہتی بلکہ دو  
 طرفہ ہو تو بہتر ہے۔  
 ایک دم دونوں چوٹے۔  
 گاڑیوں کا شور..... کون آگیا ہے اس وقت۔  
 خاقان اور مہک نے اٹھ کر بالکونی سے جھانکا۔  
 یہ کس کی گاڑی ہے۔  
 خاقان سیاہ رنگ کی مرسڈیز دیکھ کر حیران رہ گیا۔  
 دوسری گاڑی پیپا کی۔ دوسرے ہی لمحے خاقان نے آیا کو آواز دی۔  
 آیا ماں.....  
 وہ دونوں دیکھتے رہے۔  
 آئی بیٹا۔  
 اماں جلدی سے..... جلدی سے..... دیکھیں ناکون ہے۔  
 وہ زور سے بولا۔  
 کون آگیا۔  
 آیا بھاگ کر آئی اور بالکونی سے نیچے دیکھا۔  
 چھڑی پکڑے مہذب باوقار شخص، ایک عورت اور دو لڑکیاں۔  
 پیٹر بابو.....  
 اندر ہی اندر سسک اٹھی..... رگوں میں گردش کرتا خون جیسے ہتھم  
 گیا ہو..... سانس کی رفتار تیز ہو گئی یوں لگا جیسے دشت میں ریت کے ذروں  
 کے ساتھ بکھر گئی ہو۔  
 کون ہے اماں۔  
 خاقان نے پوچھا۔

بس بس..... مجھے تمہاری محبت کا یقین آ چکا ہے۔  
 مہک نے ہنستے ہوئے خاقان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔  
 لیکن جھگڑا نہیں کر سکتا.....  
 وہ آہستہ سے بولا۔  
 کیا مطلب ہے تمہارا۔  
 مہک نے کہا۔  
 مطلب صاف ظاہر ہے کہ میری تربیت تخریب کاری سے نہیں  
 تعمیری جذبے سے ہوئی ہے۔  
 وہ ہنس دیا۔  
 اچھا جی..... بے شک کوئی اور لے جائے مجھے اور تم منہ دیکھتے  
 رہنا۔  
 مہک اٹھلا کر بولی۔  
 کبھی نہیں ہو سکتا..... اگر میرا جذبہ صادق ہے تو ایسا کوئی کر ہی  
 نہیں سکتا۔  
 وہ بڑے وثوق سے بولا۔  
 تم بختاور کو جانتے ہو نا..... روپی آنٹی کئی مرتبہ میری می کے پاس  
 جا چکی ہیں۔  
 مہک کو خوف نے پریشان کر دیا۔  
 بختاور کا تم کوئی فکر نہ کرو..... اللہ ہمارا ساتھ دے گا۔  
 نجانے خاقان کو اتنا اعتماد کیوں تھا۔  
 کیوں فکر نہ کروں..... تمہارا کیا ہے اپنے پیپا کے کہنے پر کسی اور  
 سے شادی رچا لو گے اور میں..... میں دوزخ میں جلتی رہوں گی..... سچ  
 خاقان میں تمہارے بنا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔  
 وہ بڑے مستحکم ارادے سے بولی۔  
 خواجواہ پریشانی کو گلے لگا لیا ہے تم نے..... بختاور تم سے دستبردار

No Sir صرف بیدار کو۔ تمہیں پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ تم بھائی ہو ہمارے ملازم نہیں ہو۔

کیوں نہیں..... تم ہمارے بیٹوں کی جگہ ہو پیٹر۔  
بیگم نور الدین نے مسکرا کر کہا۔

میں آپ کا احسان مند ہوں جو مجھ ناچیز کو اتنے بڑے رتبے سے نوازہ۔

پیٹر نے کہا۔

دونوں ہنستے ہوئے پاس پاس صوفے پر بیٹھ گئے۔

یہ میری دونوں بیٹیاں فاطمہ اور زینب۔

دونوں لڑکیاں مودب کھڑی ہو گئیں۔

بیدار نے اٹھ کر سر پر ہاتھ رکھا۔

اور یہ آپ کی بھالی۔

پیٹر اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر بولا۔

آپ کیسی ہیں بھالی..... پیٹر سے کوئی شکایت ہو تو بتائیے۔

اس کے ساتھ ہی سب کھل کھلا کر ہنس دیئے۔ بیگم نور الدین بھی کھل کر ہنسیں۔

پیٹر..... بھی ایک بات ہماری سمجھ نہیں آئی۔

بیگم نور الدین نے کہا۔

کون سی بیگم صاحبہ۔

یہ بچیوں کے ناموں کی..... تم نے کھترن، لیزا رکھنے کی بجائے اس قدر مقدس ناموں کو کیوں پسند کیا۔

بیگم نور الدین کی بات پر روبی نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔

آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے بیگم صاحبہ کہ میں ایک عرصے

سے مشرف اسلام ہو چکا ہوں اور میرا سارا گھرانہ صوم و صلوة کا پابند ہے۔

پیٹر بڑے فخر سے بولا۔

معلوم نہیں بیٹا..... تمہارے پیپا کے جاننے والے ہوں گے۔  
وہ واپس پچھی کرسی پر بیٹھ گئی..... جسم میں طاقت کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

مہمانوں کو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ بیگم نور الدین نے بڑے خلوص اور چاہت کے ساتھ سب کو خوش آمدید کہا۔ وہ پیٹر کی بہت احسان مند تھیں کہ امریکہ میں سیٹھ نور الدین کے اچانک انتقال پر جس ایمانداری اور نیک نیتی سے کروڑوں کا بزنس سنبھالا تھا، اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی..... ویسے بھی ہر مشکل وقت میں پیٹر نے نور محل کی ساکھ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

پیٹر کی دونوں بیٹیاں نہایت سلجھے ہوئے پاکستانی لباس میں ملبوس صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔

غالباً یہ بیدار کی بیٹی ہو گی۔

پیٹر نے قیافہ لگایا۔

آداب انکل۔

زنیہ نے کہا۔

جیتی رہو۔

پیٹر نے شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔

روبی نے باہر کی جانب دیکھا، گاڑی پورچ میں کھڑی ہوئی تھی اور عین اسی وقت بیدار تیز رفتاری سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ پیٹر اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے بیدار سے بغل گیر ہو گیا۔  
اطلاع کیوں نہیں دی..... چھپ چھپ کر کام کرنے کی عادت نہ گئی

تمہاری۔

بیدار محبت سے شانے دباتے ہوئے بولے۔

سب ہنس دیئے۔

جو مزا اچانک ملنے میں ہے اطلاع میں نہیں ہے سر۔

Very Good ہمیں آپ سے ایسی ہی امید تھی ڈیر انکل۔

بخاور تالیاں بجاتے ہوئے داخل ہوا۔

پیٹر نے چونک کر حیرت سے دیکھا۔

میرا چھوٹا بیٹا بخاور۔

بیدار بولے۔

بخاور ..... پیٹر اٹھا اور بخاور کو ساتھ لگا لیا۔ دوسرے لمحے نگاہیں

جس کی متلاشی تھیں وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

بیدار نے معنی خیز انداز میں آنکھیں جھپکیں۔

پیٹر بخاور کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

بہت دن یوں ہی گزر گئے۔ نہ جانے اس کی ہمت کیوں نہیں پڑ

رہی تھی۔ نور محل میں اس کو بڑا اختیار تھا محل کے مغربی جانب شاندار

کمرے اور دو ملازم ہمہ وقت خدمت کے لیے مامور کر دیے گئے تھے۔

ایک نخل تھی جو بار بار اس کو اکساتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اوپر والے

پورشن کو نگاہیں اٹھا کر دیکھ چکا تھا۔ خاقان اب جوان ہو چکا ہو گا۔ لیکن

بیدار نے مجھے ملوایا کیوں نہیں۔ آج ڈرائنگ روم میں خوش گہیوں کے

دوران پیٹر نے پوچھ ہی لیا۔

بیگم صاحبہ ..... میں یہ پوچھنے کی جسارت کروں گا کہ جو بچہ میں آیا

کی نگہداشت میں دے کر گیا تھا ..... اس سے ملنا چاہتا ہوں۔

پیٹر کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

خاقان ..... تم ابھی تک خاقان سے نہیں ملے ..... بس جوانی کی

مکمل تصویر ہے میری۔

بیدار بڑے خوش ہو کر بولے۔

بیگم نورالدین صرف مسکرا کر رہ گئیں۔

اسے ملوایا ہی نہیں آپ نے ..... ورنہ میں تو بڑا بیتاب تھا بلکہ ابھی

اسی وقت ملوں گا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔

وہ آیا کے ساتھ اوپر والے پورشن میں ہے۔

بیدار اس مرتبہ سنجیدہ ہو گئے۔

اچھا ..... وہ پورشن آباد ہے۔

پیٹر ہنسا۔

ہاں پیٹر ..... وہ پورشن آباد ہے ..... ہم نے تمہاری امانت کی

حفاظت کی ہے۔

بیگم نورالدین نے کہا۔

اسی اثنا میں روبی داخل ہوئی۔

چلے بیگم صاحبہ اور مسز بیدار بخت ..... پلیز زحمت کیجئے اوپر والے

پورشن پر۔

پیٹر نے درخواست کی۔

تم ہو آؤ ..... بیدار تمہارے ساتھ جائیں گے ..... ایسی کوئی بات

نہیں ہے۔

بیگم نورالدین مسکرا کر بولیں۔

ہاں ہاں ..... بیدار کے ساتھ چلے جائیے ..... ویسے بھی اکثر ان کا

وقت اوپر والے پورشن میں گزرتا ہے۔

روبی نے چھپی ہوئی چوٹ کی۔

لیکن پیٹر ٹال گیا۔

بیدار صرف اس چوٹ پر مسکرا دیئے۔ ویسے بھی ایسی طنز کے عادی

ہو چکے تھے۔

نہیں مسز بیدار میں آپ سب کی موجودگی میں خاقان سے ملنا چاہتا

ہوں۔

میرا خیال ہے سب بچے اوپر ہیں۔

روبی نے کہا۔

کی ہو ہو تصویر ..... خاقان میرے بچے۔  
 پیڑنے والمانہ انداز میں خاقان کی پیشانی چوم لی اور بڑی محبت سے  
 گلے لگایا۔

بیگم نورالدین اور روبی خاموش بیٹھی رہیں۔  
 خاقان مسکرایا۔  
 تشریف رکھے۔

خاقان نے محبت سے پیڑ کو صوفے پر بٹھا دیا۔  
 زہیرہ اور مہک باہر آئیں۔  
 آیا ماں، نماز پڑھ لی آپ نے۔  
 مہک نے کہا۔

ہاں بیٹی ..... تم چلو میں چائے بناتی ہوں۔  
 خاقان ایک دم کمرے میں داخل ہوا۔  
 آپ ادھر آئیں مہمانوں کے پاس، چائے ہم لوگ بنا لیں گے۔  
 نہیں بیٹا ..... میں کس لیے ہوں۔  
 آیا پہلو تہی سے کام لینے لگی۔

نہیں آپ ان کے پاس چلیں ..... وہ لوگ ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔  
 خاقان نے کہا۔

اچھا اچھا ..... تو نہیں باز آئے گا ..... ذرا ٹھہر بچیوں کو سمجھا دوں  
 ..... زہیرہ اور مہک بیٹی۔  
 جی آیا ماں۔

فریج میں کباب ہیں قل لینا ..... پکوڑوں کا بیسن بھی ہے اور مٹھائی  
 بھی ہے اور ہاں بیسن کا حلوہ بنا کر رکھا ہے ..... گرم کر لینا۔  
 آیا نے کہا اور چہرہ صاف کیا اور چادر درست کی۔  
 واہ آیا ماں ..... سب کچھ تو بنا بنایا ہے بس چائے ہی بنے گی۔  
 مہک نے ہنس کر کہا۔

بچوں کا اوپر بہت دل لگتا ہے ..... نہ جانے آیا نے کیا کر دیا ہے ان  
 کو۔

بیگم نورالدین بولیں۔  
 آیا بچوں سے محبت کرتی ہوگی۔  
 پیڑنے کہا۔

سب خاموش رہے لیکن پیڑ کچھ دیر بعد پھر اصرار کرنے لگا۔  
 ہاں ماما ..... آج روزہ کھول لیجئے ..... اوپر والا پورشن بھی دیکھ  
 لیجئے۔

بیدار کو روبی اور بیگم نورالدین کی ضد سے کوفت ہونے لگی۔  
 چلے۔

پیڑنے کہا۔  
 اور بڑے اصرار کے بعد دونوں تیار ہوئیں اور سب کے ساتھ قدم  
 بقدم زینہ چڑھ گئیں۔  
 خاقان ..... دادو ماں!  
 زہیرہ نے سرگوشی کی۔

ایک دم سے سب کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ سب پیڑ، مسز پیڑ،  
 بیگم نورالدین، روبی اور بیدار کو دیکھ کر سکتے میں آچکے تھے۔  
 پیڑ نے ادھر ادھر دیکھا، آیا نہیں تھی۔  
 انکل ڈرائنگ روم میں آجائے۔

بختاور سب کو ڈرائنگ روم میں لے گیا، ڈرائنگ روم کی آرائش  
 و زیبائش دیکھ کر روبی بھی نظروں ہی نظروں میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی۔  
 خاقان ..... ادھر آؤ بیٹا ..... انکل پیڑ سے ملو۔

بیدار نے خاقان کو پکارا۔  
 خاقان ہنس کر قریب آیا اور مودب سلام کیا۔  
 او میرے بیٹے ..... بیدار کی صورت والے ..... واقعی بیدار کی جوانی

خاقان بھی کھڑا ہو گیا۔  
تشریف لائیے۔  
پیٹر کو اس وقت وہ کس قدر منذب اور پروقار نظر آرہی تھی۔  
وہ دو قدم اندر داخل ہوئی۔  
آیا آپ نے ہمیں پہچانا۔  
پیٹر نے کھڑے کھڑے کہا۔  
آپ پیٹر بابو ہیں ..... ہم بھلا کیسے بھولیں گے آپ کو۔  
خاقان کو حیرت ہوئی ..... (اس دن آیا ماں نے کہا تھا کہ وہ نہیں جانتی انہیں)۔

وہ سوچنے لگا۔  
تو پھر ہم آپ کو اصل صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔  
جی .....  
وہ ساری جان سے لرز گئی۔  
خاقان ہنس دیا۔  
کیا کہہ رہے ہیں انکل ..... آیا ماں کے دو چہرے ہیں۔  
سب سراسیمگی کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔  
ہاں ..... میرے بچے ..... تمہاری آیا ماں وہ عظیم عورت ہے جس کے دو چہرے بھی قابل احترام ہیں۔  
پیٹر قریب آیا۔

سوہنی دہشت زدہ بیدار کو تکنے لگی لیکن وہ خود حیران تھے۔  
پیٹر نے چرا بیگم نورالدین کی طرف کیا۔  
بیگم صاحبہ ..... تیس سال پہلے کا واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے  
جہاں شمشیر کی موت واقع ہوئی تھی اور کس طرح خاقان کو آپ کے حوالے کیا گیا۔

بیگم نورالدین کی آنکھوں میں چند لمحے تاریک رات کا وہ منظر گھوم

فاطمہ آ جاؤ۔  
زنیہ نے آواز دی۔  
میری ضرورت ہے۔  
بختاور نے کہا۔  
جی نہیں آپ بیٹھے رہئے۔  
زنیہ جانتی تھی اگر فاطمہ آگئی تو وہ کہاں رکے گا۔  
آ رہا ہوں۔

وہ کہاں رکنے والا تھا، اٹھا اور باہر آ گیا۔  
میں آگیا ہوں ..... جہاں فاطمہ ہوگی وہاں بختاور ضرور ہو گا۔  
وہ ہنس دیا۔

فاطمہ نے حجاب سے نظریں جھکا لیں۔  
تمہیں معلوم ہے مکہ کہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔  
زنیہ نے کہا۔  
اچھا ..... خوشی کی بات ہے۔  
مک نے خاقان کی طرف دیکھا جو پہلے ہی دیکھ رہا تھا۔  
آجائے نا اماں۔

وہ آیا سے بولا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔  
پیٹر نے بیدار سے باتیں کرتے چونک کر خاقان کی طرف دیکھا۔  
خاقان بیٹے ..... اپنی آیا ماں کو بلاؤ ..... ہم ملنا چاہتے ہیں۔  
بیگم نورالدین اور روبی کو حیرت ہوئی، ایک دوسرے کی طرف

دیکھا۔

دروازے میں آیا سفید لباس اور سفید ہی دوپٹہ اوڑھے عظمت و وقار کی دلکش تصویر کھڑی تھی ..... حسب عادت پیشانی پر ہاتھ لیجا کر سلام کیا۔

پیٹر ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔

نے.....

خاقان ماں سے پٹ کر رو دیا۔  
میرے بچے کیسے نہ چھپاتی..... ورنہ تیری جدائی میں مر جاتی۔  
سوہنی نے بے قرار و مضطرب خاقان کو لپٹا لیا۔  
بیدار اور بیگم نورالدین دیکھتے رہے..... لیکن ہلنے کی سکت کسی میں  
بھی نہ تھی۔

پیٹر نے بیدار بخت کی طرف دیکھا۔  
میرا پاکستان آنے کا بھی یہی مقصد تھا..... میں سب کو اندھیروں میں  
رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

تب کہیں بیدار کا سکتہ ٹوٹا۔  
سوہنی..... ہم تمہارے گناہ گار ہیں..... ہماری خطاؤں کو معاف کر  
دینا۔

بیدار بولے۔  
صاحب جی..... ہم تو کنیز ہیں آپ کی..... ہمیں اپنی غلامی میں  
رہنے دیجئے۔  
وہ جھکی۔

سوہنی..... میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں..... تم جیسی  
وفا شعار بیوی کہاں ملے گی۔

وہ جھکے اور سوہنی کو شانوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔  
بیگم صاحبہ..... ہمیں قبول کر لیجئے..... ہم اب بھی خاقان کی آیا بن  
کر زندگی گزار لیں گے..... ہم اس بیٹے کی خاطر روپی بیگم کی نوکری بھی کر  
لیں گی لیکن ہم جدا نہیں ہو سکتے۔

سوہنی کی گرفت خاقان کے بازو پر سخت ہو گئی۔  
اماں..... میری مقدس اماں..... کوئی تمہیں اس گھر سے نہیں نکال  
سکتا..... ہم ڈھال بن جائیں گے..... آپ کی طرف آنے والا ہر دار خود سہ

گیا۔

پیٹر.....  
وہ چلا انھیں۔

Do not worry بیگم صاحبہ..... اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کہیں  
گے۔ آج صرف آیا کا اصلی چہرہ دکھائیں گے۔

بیگم نورالدین نے سکون طلب سانس لیا۔  
پیٹر بابو..... آج بھی ہم اسی بات کے لیے پریشان ہیں۔  
بیدار ایک دم کھڑے ہو گئے..... (یہ وہی لب و لہجہ)۔  
وہ سوچنے لگے۔

خاقان قریب آگیا۔  
خاقان بیٹے..... یہ آیا ماں نہیں..... یہ تیری حقیقی ماں ہے جس  
نے تئیس برس صرف اس خوف سے چرا چھپائے رکھا کہ وہ تم سے اور  
تیرے باپ بیدار سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔  
دیکھو..... اپنی ماں کا اصل روپ.....  
اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر پیٹر نے پیشانی سے پکڑ کر سوہنی کے  
چہرے سے باریک ماسک اتار دیا۔

سوہنی.....  
ایک بارگی سب کے منہ سے نکلا اور سب دانتوں میں انگلی دا بے  
بے حس و حرکت کھڑے تھے..... صاف و شفاف چہرہ..... خوبصورت  
خود خال..... عظمت کی دلکش تصویر..... سب دنگ رہ گئے۔  
وہ بت بنی کھڑی رہی..... اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں

تھا۔

ہونہ.....  
نفرت سے شانے جھکتی روپی ٹھک ٹھک کرتی زینہ اتر گئی۔  
اماں..... تو میری ماں تھی..... کیوں چھپایا مجھ سے اپنے آپ کو تو

لیں گے۔

خاقان نے ماں کے ہاتھوں کو چوم لیا۔

بیگم نور الدین آگے بڑھیں۔

ہم تمہارے مفکور ہیں ..... تم نے اتنی مدت گمنامی میں صرف اس لیے گزار دی کہ تمہیں اپنے شوہر اور بچے سے جدائی کا زہر نہ پینا پڑے۔

بیگم نور الدین نے سوہنی کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

تمہارا یہ مقام ہے کہ تم نور محل میں برابر کی شریک ہو۔

بیگم نور الدین نے سوہنی کو پکڑ کر بیدار کے ساتھ بٹھا دیا۔

پاپا.....

خاقان بخٹاور کو پکڑ کر بیدار کے پاس آیا۔

زنیرہ.....

بیدار نے زنیرہ کو پکارا۔

زنیرہ مک کو بھی پکڑ لائی۔

میرے بچو.....

سوہنی نے بازو پھیلا کر چاروں کو ساتھ لگا لیا۔

میری ماں کو اپنی ماں سمجھنا یار۔

خاقان نے حسب عادت بخٹاور کو چھیڑا۔

ہم آیا ماں کی محبتوں کو فراموش تو نہیں کر سکتے۔

صرف ماں..... آیا ماں نہیں۔

وہ ایک شہادت کی انگلی کھڑی کر کے بولا۔

سب کھل کھلا کر ہنس دیئے۔

بخٹاور بیٹے اپنی ممی کے پاس جاؤ۔

بیدار بولے۔

گہرائی نہیں پاپا..... میں سب ٹھیک کر لوں گا۔

وہ فاطمہ کی طرف رخ کر کے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

محفل پھر سے زعفران بن گئی۔

پیڑ..... فاطمہ میری امانت ہے تمہارے پاس ..... میری بیٹی ہے، جب وقت ملا میں لے جاؤں گا۔

بیدار جانتے تھے کہ بخٹاور فاطمہ کی سادگی کو پسند کرتا ہے۔

فاطمہ تمہاری ہے ..... بلکہ میں سب کام نبھا کر جاؤں گا۔

پیڑ ایک عظم سے بولا۔

شام تک یونہی باتیں ہوتی رہیں۔

خاقان نے رات کو شاندار دعوت کا اہتمام کیا جس میں نئے نئے لذیذ کھانے پکائے گئے ..... وہ اس قدر خوش تھا ..... اتنا مل گئی تھی اور ..... سوہنی ..... اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، اللہ نے اس کی دعائیں سن لیں ..... جن کی چاہت میں وہ برباد ہوئی تھی وہی اس کے خیر خواہ بن چکے تھے۔

ممی ..... آیا ماں تو اس قدر بے ضرر عورت ہے ، وہ آپ کی سیٹ نہیں لے گی۔

بختاور نے کہا۔

وہ اب آیا نہیں ہے ..... اب وہ تمہاری سوتیلی ماں ہے ، تمہارے باپ کی دوسری بیوی۔

وہ چیخ کر بولی۔

ممی ..... ہمارا نہیں تو پاپا کا خیال کیجئے ..... کتنے پریشان ہوں گے۔ بختاور نے کہا۔

اگر تمہارے پاپا کی اس بات کا مجھے پہلے دن علم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی ..... میں امریکہ اپنے پاپا کے پاس چلی جاتی۔ وہ اکڑ کر بولی۔

لیکن اب تو نانا ابو نہیں ہیں ..... کون ہے وہاں آپ کا۔ زنیہ نے کہا۔

میرا بزنس وہیں ہے ..... جتنا کاروبار بھی ہے تمہارے پاپا کا ، اس میں میرا شیر ہے اور دوسری کمپنیاں ..... وہ پھر بولی۔

لیکن پاپا تو یہاں ہیں ..... پاپا کو چھوڑ کر مت جائیے۔ زنیہ نے منت کی۔

وہ جانتی تھی کہ ان کی ماں روبی امریکہ کی پرورہ ہے ..... اس کی رگوں میں ولایتی خون ہے ..... اگر تعلق توڑنے پر آئی تو ساتھ نہ دے گی۔

دونوں بسن بھائی خاموش آنسو بہانے لگے لیکن روبی کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا ..... وہ صوفے پر بیٹھی آئندہ کے بارے میں سوچتی رہی۔

اچانک وہ ایک دم بھری ہوئی شیرنی کی طرح کھڑی ہوئی۔

تم بتاؤ ..... ماما کے پاس رہو گے یا پاپا کے پاس۔

دونوں خاموش تھیں۔

(32)

روبی اپنا سامان پیک کر چکی تھی۔

ممی ..... آپ ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

بختاور نے کہا۔

تم لوگ میرے ساتھ جاؤ گے ..... سمجھے۔

روبی طیش میں بولی۔

یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ..... زنیہ تم نے سنا ..... ممی کیا کہہ رہی

ہیں۔

بختاور پریشان بال پیشانی سے ہٹا کر زنیہ سے مخاطب ہوا۔

ممی آپ ہم سب کو چھوڑ کر جائیں گی ..... ایسا نہیں ہو سکتا۔

زنیہ نے کہا۔

میں نے کہا تھا ..... تم لوگ میرے ساتھ جاؤ گے ..... میں یہاں ایک

پل گزارنے کو تیار نہیں ہوں۔

روبی نے دوسرے بیگ میں کپڑے ٹھونستے ہوئے کہا۔

آپ اس لئے جا رہی ہیں کہ آیا ماں پاپا کی بیوی ہے تو پھر کیا ہوا

..... ان کا مقام اپنی جگہ اور آپ کا اپنی جگہ۔

زنیہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں اپنی سیٹ کی تقسیم برداشت نہیں کر سکتی ..... امریکہ میں میرے

لیے پرسکون جگہ ہے ..... وہ صوفے پر تھکی تھکی سی بیٹھ گئی۔



بولو ..... کس کے پاس رہو گے ..... بولو ..... تم نے پایا کے پاس رہنا ہے یا میرے ساتھ چلنا ہے۔  
وہ گلا پھاڑ کر چیخی۔

بھائی ..... ہم نہیں جائیں گے ..... پایا کو چھوڑ کر۔  
زنیہ بھاگ کر بختاور سے لپٹ گئی۔  
روبی کی آنکھیں پھٹ گئیں۔  
کیا.....

ہم پایا کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔  
بختاور زنیہ کو لے کر باہر آ گیا۔  
آپ ..... انکل۔  
پیٹر کو کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹھکے۔

میں مسز بیدار بخت سے ملنا چاہتا ہوں بختاور بیٹا ..... آنے کی اجازت لے لو ان سے۔

پیٹر نے بختاور کی پیٹھ تھپکی۔

پیٹر نے محسوس کیا کہ بچے روتے ہوئے نکلے ہیں۔

ماما ..... انکل پیٹر آئے ہیں ..... آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔  
بختاور نے دروازے میں ہی سے کہا۔

آجائیں۔

روبی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے الجھے بالوں کو درست کیا۔

بختاور باہر چلا گیا۔

چلے جائیے انکل۔

اور دونوں بہن بھائی اوپر والے پورشن کا زینہ چڑھ گئے۔

اجازت ہے۔

پیٹر دروازے میں کھڑے ہو کر مودب بولا۔

آؤ آؤ پیٹر ..... آج کس مشن پر نکلے ہو۔

روبی نے زبردستی مسکرا کر چوٹ کی۔

جی ہاں ..... اب اس مشن کی کامیابی کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہا ہوں۔

پیٹر سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

اب ایسا کون سا مشن ہے جس کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی جا رہی ہے۔

روبی نے مسکرا کر کہا۔

پیٹر نے ہنس کر رومال سے چہرہ صاف کیا اور پہلو بدلا۔

میرے خیال میں اب نور محل میں کوئی پرابلم باقی نہیں رہی۔

روبی نے دوبارہ کہا۔

ابھی ہے مسز بیدار بخت ..... اس پرابلم کو حل کئے بنا چارہ انہیں۔

پیٹر نے کہا۔

جی ..... اچھا۔

روبی نے چشم حیرت سے دیکھا۔

دراصل میں نے نور محل میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ نور محل

کی تمام خوشیاں میرے لیے اولیں حیثیت رکھتی ہیں ..... اس لیے میں نور

محل کو کسی بھی تشنگی کا شکار ہونے نہیں دینا چاہتا۔

پیٹر نے سنجیدگی سے روبی کی طرف دیکھا، وہ کچھ سوچ رہی تھی۔

مسز بیدار آپ سن رہی ہیں نا۔

پیٹر نے کہا۔

بڑی اچھی طرح ..... تم نے نور محل کے ہر کمیز کی تشنگی دور کر دی ہے لیکن مجھے کس گناہ کی سزا دلوائی ہے۔

روبی کو کوفت ہوئی۔

مسز بیدار ..... میں نے کوئی تکلیف نہیں دی آپ کو ..... صرف

آپ نے اپنے اوپر یہ ساری تکلیف دھار لی ہے ..... اگر آپ ..... صرف

پیٹر نے ایک ہی سانس میں کہا۔  
تمہاری باتیں بھی درست ہیں لیکن جو نقصان ہو چکا ہے اس کی  
تلافی تو نہیں ہو سکتی۔

روبی کو پھر غصہ آ گیا۔  
آج تک کسی نقصان کی تلافی نہیں ہوئی ..... کرچیں بکھر جاتی ہیں  
م اٹھا کر پھینک دیتے ہیں ..... تمام شب ستاروں کا خون ہوتا ہے صبح صادق  
ملا دیتی ہے ..... یہ جذبے ہیں مسزبیدار .....

روبی نے آنکھیں پھاڑیں۔  
اچانک فضا میں ایک چیخ ابھری۔  
چاروں طرف سے بھاگنے کی آوازیں آئیں۔ لحوں میں اوپر والا  
رشن اہل مکین سے بھر گیا۔

کیا ہوا .....  
کیسے گری .....  
اوی اللہ سر پھٹ گیا ..... کتنا خون بہ گیا۔  
چاروں جانب سے آوازیں آرہی تھیں۔  
پیٹر اور روبی برق رفتاری سے اوپر پہنچ گئے۔  
لیکن ..... خاقان نے زنیہ کو ہاتھوں پر اٹھایا ..... چلو بخٹاور۔ سوہنی  
بے بھاگتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔

زنیہ کی حالت بڑی تشویش ناک تھی ..... فوارے کی طرح سر سے  
نا بہ رہا تھا ..... سوہنی ہر طرح سے کوشش کر رہی تھی کہ خون بند ہو  
ئے لیکن بے سود .....

انہیں جاتے دیکھ کر پیٹر نے گاڑی لی اور بیگم نور الدین اور روبی کو  
ماں صورت بٹھایا اور ہسپتال کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی  
ال کے اندر پہنچ گئی۔

انہیں دیکھ کر بخٹاور بھاگتا ہوا آیا۔

میر سے کام لیتیں ..... یہی کہنا چاہتے ہو نا تم۔  
روبی نے فوراً پیٹر کی بات اچک لی۔  
آپ بجا فرماتی ہیں ..... کوئی عورت محبت کی تقسیم برداشت نہیں کر  
سکتی۔

پیٹر آہستہ آہستہ اس طرف آ رہا تھا۔  
پھر تم نے ایسا کیوں کیا ..... میرے سکون کے تلاطم میں پتھر پھینک  
کر مجھے بے سکون کیوں کیا۔  
وہ بے چین نظر آنے لگی۔

میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا مسزبیدار ..... میں نے سوہنی کو سامنے لا  
کر خاقان کو اندھیرے سے نکالنا چاہا تھا ..... وہ معصوم ماں کی قربت میں رہ کر  
بھی ماں کی محبت کو ترستا رہا۔  
تم ٹھیک کہتے ہو ..... خاقان کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے ہیں۔

روبی نے کہا۔  
پھر سوہنی سے بھی تعلقات استوار کر لیں۔  
پیٹر نے گزارش کی۔  
یہ کیسے ہو سکتا ہے ..... وہ عورت کسی طور پر بھی مجھ سے مماثلت  
نہیں رکھتی، اس کو کیسے قبول کر لوں۔

روبی کے انداز میں نفرت کا شائبہ پایا جاتا تھا۔  
ایسا مت کہئے بیگم بیدار بخت ..... خدا نے سب انسانوں کے لیے  
ایک ہی مٹی اور ایک جیسی قبر کی جگہ رکھی ہے ..... یہ سب کچھ تو دنیاوی  
جھیلے ہیں ..... جو ہم لوگوں نے اپنائے ہوئے ہیں۔

روبی لرزی گئی لیکن خاموش رہی۔  
تم اب کیا چاہتے ہو۔

میں چاہتا ہوں کہ اپنے رویے میں ٹپک پیدا کریں ..... بیدار اور  
بچوں کے سکون کا خیال کریں۔

خاقان کو حسب عادت شرارت سوجھی۔

بخاور اور روپی دونوں ہنس دیے۔

چند سیکنڈ بعد نرس سوہنی کو لے کر اندر آئی۔

روپی نے دیکھا سرخ و سفید رنگت والی سوہنی ہلدی کی طرح زرد ہو رہی تھی، نکاہت کے باعث چلنا دو بھر ہو رہا تھا۔

آپ یہاں بیٹھے اور آرام کیجئے۔

نرس کہہ کر واپس چلی گئی۔

سوہنی اٹھ کر زنیہ کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

ابھی ہوش نہیں آیا میری بچی کو۔

وہ زنیہ پر جھکی اور پیشانی چوم لی۔

آہستہ سے زنیہ نے آنکھیں کھولیں۔

آیا ماں۔

زنیہ نے کہا۔

میری بیٹی.....

روپی اس پر جھکی اور محبت سے اس کے بالوں کو چوم لیا۔

سوہنی نے حیرت سے دیکھا، امریکہ کی پرورہ ماں کی محبت بھی کیسی لی کہ ساری زندگی گزر گئی آج پہلی مرتبہ بیٹی کی پیشانی کو بوسا دیا ہے۔

آیا ماں۔

زنیہ نے پکارا۔

میری جان..... خدا تمہیں ہزاروں سال زندہ رکھے..... اب کیسی

بعت ہے۔

سوہنی نے والہانہ محبت سے پوچھا اور زنیہ کے ہاتھوں کو چوم لیا جو نے سوہنی کے ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھے۔

روپی کے اندر کی سیاہی بستے بھرنے کے پانی کی طرح شفاف ہو کر ل گئی، جتنی رقابت تھی دور ہو گئی۔

مئی..... گہرائی نہیں..... زنیہ بالکل ٹھیک ہے، اگر آیا ماں خون نہ دیتی تو زنیہ کی.....

ایسا نہ کہو بیٹا۔

بیگم نور الدین نے بخاور کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

بخاور بیٹے مجھے زنیہ کے پاس لے چلو..... میری تو کائنات ہی تم

دونوں ہو۔

بیگم نور الدین نے روپی کا شانہ تھپتھپایا۔

حوصلہ کرو روپی..... آخر خدا نے سوہنی کو فرشتہ بنا کر بھیج دیا تا۔

روپی خاموش ہو گئی۔

اور وہ تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ دیکھا تو سارا نور محل ارد

گرد موجود تھا..... سوائے چند ملازمین کے سب ہسپتال پہنچے ہوئے تھے۔

روپی نے ہیشوش پڑی زنیہ کی پیشانی چوم لی۔

بیگم نور الدین ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئیں۔

سب دم بخود زنیہ کے ہوش میں آنے کے منتظر تھے۔ خاقان اندر

داخل ہوا۔

خاقان..... آیا ماں تو ٹھیک ہے نا۔

بخاور نے پوچھا۔

اللہ کا شکر ہے اماں بالکل ٹھیک ہیں..... دراصل خود بھی کمزور

تھیں.....

خاقان نے کہا۔

سوائے ان کے اور کسی کا نمبر ہی نہیں ملتا تھا۔

بخاور نے کہا۔

دونوں چلتے ہوئے زنیہ کے پاس آ گئے۔

خاقان نے بڑی محبت اور شفقت سے زنیہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

اللہ کا شکر ہے یار..... بس بچ گئی ورنہ یہ خالی بابہ کون پر کرتا۔

وہ سوہنی کی طرف بڑھی۔

خاقان اور بختاور نے ایک ساتھ دیکھا۔

سوہنی ..... میری محسن ..... میری بہن ..... تم واقعی بے ضرر ہو۔  
تم سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

روبی نے سوہنی کو ایک دم سے ساتھ لپٹا لیا۔

بختاور فاطمہ کی طرف بڑھا۔

فاطمہ آؤ۔

فاطمہ جھینپ کر پرے ہو گئی، حجاب سے سرخ ہو گئی ..... قیمتوں کا  
ایک طوفان اٹھا اور سب کدورتیں دور ہو گئیں۔

خاقان نے بازو پھیلائے۔

یار میں ادھر ہوں۔

بختاور شریہ انداز میں خاقان کی طرف بڑھا اور دونوں بھائی بغل گیر

ہو گئے۔ بیگم نور الدین قریب آئیں۔

میرے بچو ..... خدا تمہیں سلامت رکھے اور دست شفقت روبی اور  
سوہنی پر رکھا۔

بختاور نے ہاتھ پھیلا کر بیگم نور الدین، روبی، سوہنی اور خاقان کو  
اپنے ساتھ لگایا اور سامنے کھڑے بیدار کی طرف دیکھا۔

پاپا جانی ہم ایک ہیں۔

بیدار نے آگے بڑھ کر خاقان اور بختاور کو گلے لگالیا۔

انکل پیٹر زندہ باد.....

انکل پیٹر زندہ باد.....

خاقان نے ایک فلک شکاف ترقہ لگایا۔

سب ہنسے اور ..... اپنے اپنے ساتھیوں سمیت نور محل کی طرف  
روانہ ہو گئے۔